

دل کے گماں تحریریں • زندگی کی تصویریں

کراچی

پچی کہانیاں

MAY
2012

اندرونی صفحات پر



شہنشاہ جذبات محمد علی

اس شمارے میں

☆ زندہ کہانی: آپ بیٹیاں، جگ بیٹیاں، پچی جاگتی کہانیاں

☆ ”اتش جنوں“ سلیم فاروقی کے قلم سے

☆ ”مسلمہ“ قرآنی آیات کے ذریعے آپ کے مسائل کا حل

7
تقدیر
منزہ سہام

29
شبشاہ جذبات
راجہ محمود

46
انکارے بے پھول
رضوان فیوم

77
شہید کی ڈائری
منزہ سہام

83
ایک ٹیس سی ہے شچی
حنان بشری

95
نخوہ کیا
صدف اصف

109
گردش رنگ چمن
حنان سحر

9
احوال
منزہ سہام

43
داغدار چرے
دانا سحر

65
آگ کا دریا
جبین ملو

79
کیا وہاں تھی؟
نہیصہ فضل

88
صراطِ مستقیم
سمیرہ غزالہ خیال

103
سفرِ حیات کٹا
لکھنوی اندر سحر

121
کارا بلیر آسان ہوا
محمد فیوم

130
میری مہریاں
مستار احمد

137
وہ ایک نشان
مستاق خان

147
انہ سے بہرے لوگ
اروم قہر

160
آجیالوں کا سفر
رخسانہ سہام مرزا

175
آپ کی ڈائری
قارنہین

191
خیالِ آرائی
قارنہین

199
پسند اپنی اپنی
قارنہین

221
تاشون
شازیلی سعیدہ مغل

144
چائیس دن بعد
تسورین رانا

157
انسان نہیں درمے
اقبال زمان

167
زندگی گھر رہا ہوں میں
اندور قہر

183
مسک میرے
اشارہ

195
کتابِ تہمرہ
عکاشہ سحر

202
جن آنکھوں میں
فاطمہ بلکراسی

234
آتشِ جنوں
سلجہ فاروقی

258
بارگشت
سہام مرزا



تقدیر

ہم جو کچھ سیکھتے ہیں وہ اپنے بڑوں سے سیکھتے ہیں اسی لیے وقت گزرنے کے ساتھ ہم بالکل اُن جیسے ہی ہو جاتے ہیں..... آپ کے ارد گرد بھی اکثر ایسے لوگ ہوں گے جو اب بالکل اپنے بڑوں کا پُر تو محسوس ہوتے ہوں گے۔ اصل میں ہماری محبت ہمیں اپنے والدین جیسا بنا دیتی ہے۔ میرے والد بہت اچھی بات کہا کرتے تھے۔

وہ کہتے تھے۔ ”برائی کو کبھی برائی کی طرح مت لو بلکہ اس میں سے بھی مثبت پہلو نکالو۔“

جب انسان کی سوچ مثبت ہوتی ہے تب سب کچھ ٹھیک ہو جاتا ہے۔ ہم سب کا المیہ یہ ہے کہ ہم دنیا کو ٹھیک کرنا چاہتے ہیں مگر اپنے بارے میں سوچتے ہی نہیں..... اگر ہر شخص صرف اپنا محاسبہ کرنا شروع کر دے تو برسوں کی بگڑی تقدیر دنوں میں تبدیل ہو جائے گی!!

منزہ سہام

اور اب؟ آپ کا..... پچی کہانیاں

ماہ جون 2012ء سے ایک نئے انداز، نئی ترتیب اور کچھ نئے سلسلوں کے ساتھ آپ کی نگاہوں کا مہمان ہوگا۔

نئے سلسلے

✱ سڈنک کہانی..... اُن لوگوں کی کہانیاں جن کی زندگی سڑکوں پہ سانس لینے لگتی ہے.....
✱ اِس ماہ کی خاص کہانی..... زندگی کے مختلف شعبوں سے جڑی چشم کشا کہانیوں اور واقعات سے انتخاب.....
✱ یاد کر گھرے ساگر میں..... شوہر کی چمکتی دیکتی دنیا سے جڑی یادوں کا سلسلہ.....
✱ سپی کہانیاں MINI MAG..... پچی کہانیاں کے مقبول سلسلوں آپ کی ڈائری، خیال آرائی، کتاب تیرہ اور پسند اپنی اپنی کے علاوہ کچھ اور نئے دلچسپ سلسلے شامل ہوں گے.....

آج ہی اپنے قریبی بک اسٹال یا اپنے ہا کر سے کاپی بک کرالیں..... پھر نہ کہیں گے ہمیں خبر نہ ہوئی

110-آدم آرکیڈ-شہید ملت روڈ/بہادر شاہ ظفر روڈ کراچی

ہاکرز حضرات کے لیے

پورے پاکستان اور خصوصاً کراچی کے ہاکرز حضرات کے لیے ادارہ ”سچی کہانیاں“ خصوصی گفتِ اسکیم کا اعلان کر رہا ہے۔

اس اسکیم کے تحت جو ہاکرز حضرات سب سے زیادہ ”سچی کہانیاں“ فروخت کرے گا، وہ انعام

کا مستحق قرار پائے گا۔۔۔۔۔ اس سلسلے میں ہاکرز مکمل کوائف کے

ساتھ ایجنٹ کے ذریعے سرکولیشن مینجر سے

رابطہ کریں۔

مینجر سرکولیشن

محمد اقبال زمان

Cell No. 0300-2313256

احوال

منزہ سہام مرزا قارئین کے درمیان

عزیز احوالیو! خوش رہے اور رہتے رہے۔ اصل میں یہی وہ دو چیزیں ہیں جو ہمارے معاشرے سے مفقود ہوتی جا رہی ہیں۔ بہر حال ہم اور آپ مل کر اپنی کوششیں جاری رکھیں گے۔ آپ سب نے مجھے ”احوال“ میں دیکھ کر کہا، اچھا لگا۔ آئندہ ماہ سے نئی کہانیاں میں ہفتہ چھپانے لائی جا رہی ہیں۔ امید ہے کہ آپ کو بھی پس آئے گی۔ ہماری پیاری رضوانہ پرس نے فون کر کے نئی کہانیاں ٹارہ اور پل کی بہت تعریف کی اور زندہ کہانی کے سلسلے کو بہت سراہا۔ شکر یہ رضوانہ! اگر آپ خط لکھیں تو بہت اچھا لگتا۔ جتنے خطوط اب تک موصول ہوئے ہیں ان سب کو شامل ”احوال“ کیا جاوے گا۔ دوسرے نے واہ! خطوں کی رسید دی جائے گی اور آپ لوگوں سے درخواست کروں گی کہ جلد ہی خط لکھ دیا کریں۔ اس ماہ سے بہترین خطوط کو 3 ماہ کے لیے نئی کہانیاں کے ساتھ پیشہ بھی جاری کیا جائے گا۔ ایک گزارش اور ہے کہ آپ لوگ کوہن کے ہمراہ خط لکھیں اور اپنی تصویر بھی ضرور ارسال کریں۔ چلیے اب چلنے ہیں خطوط کی جانب۔

✽ گفتہ شفیق کراچی سے۔ ”پیاری منزہ السلام علیکم! ایک خوشگوار حیرت کے ساتھ ”احوال“ پڑھا۔ بہت اچھا لگا۔ میرے دل نے بہت زیادہ دنیا کی کائنات، پاک کائنات، پاک ماحول، پاک کردار اور صحت عطا فرمائے، آمین۔ نہیں اپنی ساگر وہی خوشیاں سہا کر ہوں۔ اللہ پاک ہمیں اعلیٰ اور بھی زیادہ کامیابوں سے نوازے۔“ شفیق! بہت اچھا لگا۔ فائزہ خاتون کے بہنوئی اور ارم زہرا کی پھولی جان کی سفوت کے لیے دعا میں۔ اب رباب قربان علی امیری کا مختصر اور جامع خط اچھا لگا۔ رابعہ محمود صاحب پر فخر ہے بہترین تحریر دیتے ہیں۔ ”محبت کا چہرہ“ تسکین نے اپنی خوب صورت یادوں کی پیاری گولی اور آگ میں جھگو لگیں۔ مجھے بے اختیار سے پارسے پانا آگئے۔ ”آئے صبا ہوئے مدینہ“ خوب صورت دھپالے منظر کا دور دورہ احوال بے حد اچھا لگا۔ اعلیٰ قضا کا انتظار ہے۔ ہماری سچی کنزل 28 مارچ کو لندن آئی ہے۔ اپنے میڈیکل Elective کرنے کے لیے Kings college london میں۔ وہاں وہ سینٹ تھامس اسپتال میں ایک مہینہ تک Elective کرے گی۔ منزہ میں نے اپنی ایک خوب صورت ڈائری اس کے حوالے کی ہے کہ اپنے منظر کا احوال اس میں لکھ کر لانا۔ ایک اسٹوڈنٹ کا منظر کا کیا تجربہ ہوتا ہے۔ پڑھ کے سڑوے کا شہر یکے تکرل لکھ کے لائے۔ اگر لکھنے کی تو مجھے یہ یقین ہے کہ بہت اچھا ہو گا اس کا منظر، نہ صرف بہت اچھا ہو گا۔ باقی کہانیاں اس کی پڑھی ہیں یہ کیونکہ ”سچی کہانیاں“ کل ہی موصول ہوا ہے۔ حسبِ سابق تمام کہانیاں اچھی سی ہوں گی۔ اب اجازت، اللہ حافظ۔“

✽ پیاری کی شگفتہ امیرا سکرانی رہے۔ پھولوں کا بہت شکر یہ یہ دنیا کا سب سے حسین قند ہے۔ بہت جامع خط لکھا۔ شکر یہ کہ کنزل کے لیے دعا میں ہیں۔ بیٹیاں دیکھیں بہت پیاری ہوتی ہیں۔ آؤں آنے سے پہلے بتا دیا کریں اس بار ملاقات میں ہوتی اچھا لگتا۔ امید ہے کہ جلد ملاقات ہوگی۔

✽ ممتاز احمد مرحوم دعا ہے۔ ”اجتنابی قابل احترام شہید اسلام علیکم! اللہ پاک کی بارگاہ میں دعا گو ہوں کہ وہ سب کا اپنی امان اور نعمتوں کی چھاؤں تلے رکھے، آمین۔ اپنی کا شمار ہاتھوں میں ہے۔ ہمارے مضامین ”غیر ”احوال“ سوتا

سونا لگ رہا ہے۔ آپ نے خطوط کے جواب بہت ہی عمدہ اور شاندار دے کر احوال کی محفل کو خوب سجاایا۔ ایک نئی موبائل کہانی اور خیال آرائی کے ساتھ حاضر خدمت ہوں۔ ادارہ بہت ہی شاندار تھا۔ ارم زہر کی پھولی مرحومہ کی بخشش و مغفرت اور بلندی درجات کے لیے دعا گو ہوں۔ راجہ محمود کی "پادوں کے رنگ" پڑھ کر صادقین کے بارے میں بہت سی قیمتی معلومات حاصل ہوئیں۔ محمد سلیم اختر کی "خزاں کے بعد" بہت شاندار کہانی تھی۔ سعدیہ کا کردار واقعی بہت قابل ستائش ہے۔ انسان کا عزم اور حوصلہ جوان ہوتا رہتے کی چٹائیں بھی معمولی ننگر بن جاتی ہیں۔ مینا تاج کی "چلن برانی" اچھی تھی۔ "شہید کی ڈائری" زبردست رہی۔ ام عادل کی "دکھوں کے مارے" پڑھ کر دل افسردہ ہو گیا اور بے اختیار آنکھوں سے آنسو آگئے۔ کہانی بہت اچھی تھی۔ حنیف محرمی کی "گردش رنگ چمن" کا پہلا حصہ پڑھا۔ یہ بات سو فیصد درست ہے کہ عورت کو طوائف بنانے میں غربت، افلاس اور مرد کا ہاتھ ہے۔ کہانی سیدھے انداز سے بھی لکھی جاسکتی تھی مگر اسے بے کار طول دے کر بے رنگ کہانی بنا دیا گیا اور خواہ کالٹنہ بگھار گیا ہے۔ مرزا شبیر بیگ ساجدی کی "انسان اور فرشتہ" پڑھ کر بے اختیار زبان سے سبحان اللہ کا کلمہ نکلا۔ عمر ایہ رمضان کی "کلام حق" ایک مختصر، پُر اثر اور عظمت قرآن کی دلالت کرتی شاندار کہانی تھی۔ موبائل کہانی بہت سبق آموز تھی۔ یہ سچ اور حقیقت ہے کہ انسان وہی فصل کا پتا ہے جس کا وہ بیج پوتا ہے۔ یہ قانون قدرت ہے۔ "خیال آرائی" میں سب لکھنا یوں نے بہت عمدہ لکھا۔ صائمہ محرمی کا چھ ڈبے پر انکس وٹ نہیں کر سکا۔ اس کے لیے دی معذرت۔ سچی کہانیاں کی پوری نییم اور تمام قارئین کرام کے لیے بہت سی دعائیں۔

☆ بھیا ممتاز اپنی رائے سے ہمیں ضرور نوازہ کریں۔ حنیف محراب کی کہانی کے سلسلے میں آپ کی رائے اُن تک پہنچ گئی ہے۔ آپ کو شائع کردہ کہانیاں اچھی لگیں، ہمیں یہ اچھا لگا اور میری تحریر آپ کو پسند آئی اس کا ذاتی طور پر شکریہ۔ احوال میں آئندہ بھی آپ کے خط کا انتظار رہے گا۔

✉ عبدالعزیز جی آپ کو ال سے۔ "قابل صدا احترام بہن منظرہ، السلام علیکم! بہنا از حد دکھ کی بات ہے کہ ہماری نئی نسل کو لگتا ہے اپنے وطن سے کوئی پیار نہیں ذرا محبت نہیں؟ اگر ایسا ہوتا تو یقیناً وہ میری نظم پر تبصرہ ضرور کرتے۔ خدا را پاکستان کی قدر کرو۔ یہ قائم ہے تو اس کے دم سے ہم ہیں۔ اس کے ساتھ ہماری عزت و وقار ہے۔ ہماری پہچان ہے، ہمارا نام ہے۔ عزت مآب فہیم انکل، وفا صدام، نازیہ بتول، حافظ سون شاہ، ممتاز احمد، شگفتہ شقیق، مینا تاج، عکاشہ سحر، سدرہ انور، بشری سعید، زہیرہ اقبال، ام عادل، صائمہ سحر، سدرہ ارباب، ہما، گڈی اور مور شاہد۔ آپ سب نے بہت اچھے تبصرے بھیجے، جیتے رہو اور خصوصی خط کی اشاعت پر ہمارے بلوچی بھائی ارباب قربان علی امیری کو ڈیروں مبارک باد۔ زندہ کہانی میں پاکستان کا ایک بڑا نام، صادقین کے حالات زندگی پڑھنے کا موقع ملا۔ جناب راجہ محمود صاحب ویڈیو! آپ کی کہانی ہمارے لبوں پر گلاب چھوڑ گئی۔ جیتی رہو۔ فہیم انکل! آپ کو اللہ عمر خضر عطا فرمائے۔ آپ کی نظم "محمد باری تعالیٰ نماز تہجد کے بعد کروا دے گا اور کلام میں شامل کر لے گا۔ دعا ہے آپ کا شفیق سایہ ہمارے اور خصوصاً سچی کہانیاں کے سر پر ہمیشہ قائم و دائم رہے، آمین۔ "شہید کی ڈائری" مختصر مگر زبردست بہنرہ جیتی رہو۔ عایشہ کمال! آپ نے تو کمال کر دیا اور اسی طرح دیکھ لوگوں کے دکھ سمجھیں ہو۔ اگلی کہانی ہماری پیاری راسٹر منگل کی غالب ذاتی تحریر تھی۔ دنیا میں بہت سے رشتے ہیں جو موتیوں کی طرح ایک مالا میں پروئے ہیں لیکن جو رشتہ اولاد کا والدین سے ہے اس کا کوئی بدل نہیں۔ "اے جا سوئے مدینہ" جسے میں نے سب سے پہلے پڑھا۔ بہت عقیدت و احترام کے ساتھ چشم تصور میں ہم بھی زیارت مقدسہ میں آپ کے ساتھ ساتھ رہے۔ اللہ رب العزت سے دعا ہے کہ سب اہل اسلام کو وہ جگہ لکھائے، آمین۔ بہت بہت مبارک ہو بہنا جی اسی حضور کو بھی میرا سلام کہنا اور مبارک باد دینا۔ بہنا ایک چیز کی کمی عرصہ دراز سے کالم "میری کہانی میری زبان" میں محسوس کرتا ہوں اور کسی خط میں اس سے قبل نقطہ اعتراض بھی اٹھایا کہ "میری کہانی میری زبان" ایک قسم کا انٹرویو ہے۔ ساتھ تصویر کا ہونا از حد ضروری ہے۔ بلکہ مکملی پیکر شائع ہونی چاہیے اگر کوئی کرانا چاہے۔ "خیال آرائی"، "بے سبب اداسی" عکاشہ اس کمپلیکس سے باہر نہیں تو پھر کیوں؟ ارباب قربان علی امیری صاحب کاش ہم جاگ جائیں، ہوش کے ناخن لیں۔ اب بھی سب کچھ درست ہو سکتا ہے۔ "ماں تو ماں ہے" جس مقدس ہستی پر آپ نے کلم اٹھایا اس کا پوری کائنات میں کوئی بدل نہیں۔ سہیل خان گڈ، وفا صدام علماء دین پر اچھا لکھا۔ غمہ ایک تباہی، ممتاز احمد مخزن اخلاق

سے کشید کر دیا پھر اگر ف بہت پسند آیا۔ ”کیا یہ عذاب ہے؟“ ہاں بالکل سچ ام عا ول آپ نے میرے خیالات چا لیے بے شک ہم نے مجموعی طور پر اپنی روش نہ بد لی تو اللہ معاف فرمائے۔ آخر زندگی ہے کیا یہ بھی عجب سوال ہے۔ عجب منطق عجب شخصہ ہے۔ قلم سرائی خوب رہی۔ جیتی رہو صانع سحر آخر پر چلتے چلتے خیال رہے کہ کسی کی دل آزادی نہ ہو۔ نیک تمناؤں کے ساتھ نامہ بند کرنا ہوں ہر یاد کرنے والے کو سلام۔“

☆ عزیز بھائی! ہماری نئی نسل بہت اچھی ہے۔ وہ باتوں پر کم اور عمل پر زیادہ یقین رکھتے ہیں۔ ھینایا ہے آپ کی محبت ہے کہ آپ ٹائپل سے لے کر کہانیوں تک سب پر مفصل تبصرہ کرتے ہیں۔ ٹھیکیں آپ اپنا کام کریں اور میں اپنا یعنی کٹ کٹ..... ٹھیکیں اس سے پہلے ای آپ کو جیتے رہیے کہہ رہی ہیں۔

✉ خلیل جبار، حیدرآباد سے۔ ”محترمہ منورہ سہام صلیبہ، السلام علیکم! امید ہے کہ مزاج گرا ی بخیر ہوں گے۔ اربل کے شمارے میں مینا تاج کی کہانی ”چکن بریانی“ میں روانی تھی۔ بہت اچھے موضوع کا انتخاب کیا گیا۔ سلیم اختر کی کہانی ”خزاں کے بعد“ ان خواتین سے متعلق بھی جو تیزاب سے جل جاتی ہیں۔ وہ خواتین جو تیزاب سے جل جاتی ہیں ان کے لیے حوصلہ بخش کہانی ہے۔ عائشہ کمال کی کہانی ”بہی داماں“ یہ کہانی محبت کے حوالے سے عام یٹری کی کہانی تھی۔ ایسے کردار ہمارے معاشرے میں جا بجا نظر آتے ہیں۔ کرن محمد فاروق کی کہانی ”نفرت تھی درمیان“ دو بہنوں کے درمیان ہونے والی نفرت کے بارے میں ہے۔ اس سے سبق ملتا ہے کہ نفرت سے سوائے جہاں کے کچھ حاصل نہیں ہوتا ہے۔ مرزا شبیر بیگ ساجد کی کہانی انسان اور فرشتہ بہت خوب صورت کہانی تھی۔ ”بھوت گھر“ عنوان اچھا تھا لیکن راسٹر کہانی کو سنبھال نہیں پایا۔ جب کہ دوسری کہانی ”کلام حق“ مختصر مگر پراثر تھی۔ اقبال زمان کی ”لبورنگ لانا ہے“ کراچی میں ہونے والے ایک اندوہناک واقعے پر مبنی کہانی تھی۔ ارم زہرا کی ”آرزو میں دن ہو میں، حسب روایت اچھی تھی۔ محترمہ رخسانہ سہام مرزا کے قلم سے تخلیق کیا گیا سفر نامہ ”اے صابوئے مدینہ“ سادہ الفاظ میں روح کی گہرائیوں میں اتر جانے والی تحریر تھی۔ خاص کر وہ جملہ..... ”وقت نے کیا رک کر سوچا ہے کہ کون کیا جاتا ہے؟ اس کو تو گزرتا ہے سوچیں کیا، جوانی لگی اور زندگی کی لمبی کہانی گئی..... اور اب میں وہاں کھڑی ہوں جہاں آرزو پھاڑ کر گرنے کی تمنا تو ہوتی ہے مگر توانائی دم توڑ رہی ہوتی ہے..... مجھے اچھی طرح یاد ہے میں جب کالج میں پڑھتا تھا اس وقت دو شیئرہ راسٹر کی تقریب میں بھی صدف سائلک اور بھی دوست محمد فیضی مہمان ہوا کرتے تھے اور محترمہ رخسانہ صلیبہ کھڑی ہوتی تھیں۔ آج میں خود کالج میں پڑھا رہا ہوں اور محترمہ رخسانہ صلیبہ کی جگہ ان کی بیٹی منورہ نے لی ہے۔ وہ واقعی دنیا میں ہر چیز عارضی ہے۔ میری محترمہ رخسانہ سہام سے یہی گزارش ہے کہ وہ مستقبل کی کہانیاں کے لیے کچھ نہ کچھ لکھتی رہیں۔ اس طرح جذبے جواں رہتے ہیں۔ انور فرہاد کا ”زندگی لکھ رہا ہوں“ کا دوسرا حصہ بھی زبردست رہا جس سے ان کی بھرپور زندگی کے گوشوں کے بارے میں پتا چلا۔ سلیم فاروقی کے ناول کی پہلی قسط جاندار رہی۔ امید ہے کہ آگے چل کر اس میں مزید سنسنی خیزی پیدا ہوگی۔ سلیم فاروقی کی کہانیاں لوگ پڑھنا چاہتے ہیں۔ ان کے ناول کی قسط کم از کم 35 سے 40 صفحات پر مشتمل ہونی چاہیے تاکہ پڑھنے والے دلچسپی سے اگلی قسط کا انتظار کریں۔ صادقین کے بارے میں مضمون بہت دلچسپ اور پراثر تھا۔ ایک عدد سوبال کہانی ”خوش نصیب“ بھیج رہا ہوں۔ امید ہے کہ پسند آئے گی۔“

☆ خلیل بھائی! بڑی کوشش کی کہ کچھ لائیں ہی کاٹ دوں مگر آپ بھی بڑے ذہین ہیں۔ باوجود کوشش کے میں ناکام ہی رہی۔ سلیم فاروقی صاحب کی کہانی کے صفحات پڑھانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اپنی جیتی آرا سے ہمیں نوازتے رہیے گا۔

✉ کرن محمد فاروق، حیدرآباد سے۔ ”میں نے اپنی دوسری کوشش ایک کہانی کی صورت اور ”خیال آرائی“ ارسال کی تھی، اگر وہ ناقابل اشاعت ہے تو پلیز بتا دیجئے اور اگر اشاعت ہو چکی ہے، تو پلیز یہ خوشی بھی سنا دیجئے کیونکہ میں نے دیکھ کر انور جوری کا کچی کہانیاں نہیں پڑھا ہے۔ مارچ کا کچی کہانیاں بھی آج حاصل کر پائی ہوں۔ سو پلیز مہربانی فرما کر میرا خط ضرور شامل کر کے جواب دیجئے گا، ممنون رہوں گی۔ میں اس خط کے ساتھ بھی ایک تحریر بھیج رہی ہوں۔ اپنی اس تحریر کو بھیجتے ہوئے، میں بہت ٹریفڈ اور ڈری ہوئی ہوں۔ آپ کی اصلاح کی طلب گار رہوں گی۔ خط کا اہتمام وعائے خیر کے ساتھ اللہ تعالیٰ ہم سب کی جائز حاجات اور خواہشات اپنی بارگاہ میں قبول فرمائیں۔“

☆ کرن! میں نے تمہارے خط کا پورا پہلا حیرانگراف حذف کر دیا ہے۔ اس قدر سوری کہنے والی کوئی بات ہی نہیں تھی، خط لکھنے میں تو دیر سویر ہو ہی جایا کرتی ہے۔ تمہارے استاد کے انتقال کے بارے میں پڑھا، دکھ ہوا۔ اللہ انہیں اپنے جوار رحمت میں جگہ دے اور بھی تمہاری دوسری کہانی تو شمارہ اپریل میں شائع ہو چکی، تمہیں شمارہ نہیں ملا؟ یہ تناؤ حیدر آباد کی شامیں کیسی ہیں۔ مجھے بہت پسند ہیں اور یاد آتی ہیں۔

✉ محمد رضوان قیوم، راولپنڈی سے۔ ”دیگر احوال یہ ہے کہ آپ کی خدمت میں ایک مزید دلچسپ، منفرد پلاٹ پر مشتمل کہانی ”جرم کسی کا سزا کسی کو“ یا اس کا عنوان ”کرب معلیم“ بھی رکھا جاسکتا ہے، روانہ کر رہا ہوں۔ دراصل یہ کہانی مجھے ایک بزرگ عورت نے سنائی تھی۔ مجھے امید ہے کہ یہ کہانی قارئین کے لیے ایک تحفہ ثابت ہوگی۔ (اس کہانی میں جہاں آپ بہتر سمجھیں قلم چلا لیجئے گا) آپ کے پاس میری دو کہانیاں پہلے ہی موجود ہیں اور ہاں! ابھی تک گزشتہ کہانی کا انعام نہیں ملا۔ اب میں بات کرتا ہوں شمارہ اپریل کی۔ سچی بات ہے سرورق اتنا خاص نہیں تھا۔ جب کہ کہانیوں میں ”خزاں کے بعد“ محمد سلیم اختر کی اچھی، نئے پلاٹ کی حامل کہانی تھی۔ جب کہ ”تہی دامن“ عائشہ کمال کی تحریر بھی ادبی معیار کے گراف کو چھو رہی تھی۔ جب کہ عارف حسین روہیلا کی کہانی ”سوئے کی بالیاں“ کا اعزاز تحریر قابل ستائش ہے۔ مینا تاج کی کہانی ”چکن بریانی“ مجھے ہر لحاظ سے پسند آئی۔ خاص طور پر اس میں جو موضوع کا انتخاب کیا گیا ہے وہ بڑا اچھوتا اور ادبی رنگ میں ڈوبا ہوا تھا۔“

☆ بھیا رضوان قیوم! ناصر بھائی سے کہہ دیا ہے کہ رائٹرز کو بذریعہ خط ان کی کہانیوں کی اشاعت کے بارے میں ضرور بتایا کریں۔ دیئے زیر نظر شمارے میں آپ کی کہانی موجود ہے۔ مائیکل آپ کو اچھا نہیں لگا اس بارے میں متعلقہ شعبے سے کہہ دیا گیا ہے کہ توجہ دے۔ جلد ڈاک کیا انعامی رقم کے ساتھ آپ کے دروازے پر ہوگا، انشاء اللہ۔

✉ جاوید عثمان زندانی، کراچی سے۔ ”محترمہ منزہ سہام صاحبہ، نگہبائے عقیدت! اسد ازیت کے پھول جنمیں۔ امید ہے آپ خیریت سے ہوں گی۔ اپریل کا شمارہ شہر کے حالات کی وجہ سے کچھ تاخیر سے ملا۔ مائیکل بس دا بجی سا تھا۔ حسبِ عادت سب سے پہلے ادارہ پڑھا۔ ادارے نے بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر دیا۔ ”شہید کی ڈائری“ واقعی دلگذاڑی۔ بہت اچھا سلسلہ ہے۔ چٹنی کہانیاں اب تک بڑھ چکا ہوں بھر پور اور پرتاثیر ہیں۔ خاص طور پر سنبل صاحبہ کی ”محبت کا چہرہ“ مینا تاج کی ”چکن بریانی“ کرن محمد فاروق کی ”نفرت بھی درمیان“ محمد سلیم اختر کی ”خزاں کے بعد“ اور راجہ محمود کی تو ہر تحریر ہماری معلومات میں اضافے کا باعث بنتی ہے۔ میں یہاں بطور خاص مرزا شبیر بیگ ساجد کی کہانی کا ذکر کروں گا۔ بہت اچھی کہانی تھی۔ دل موہ لیا مرزا شبیر بیگ ساجد کا نام آپ کے ڈائجسٹ میں دیکھ کر کافی پرانی یادیں تازہ ہوئیں۔ منزہ صاحبہ میں آپ کا اور ناصر بھائی کا بھی شکر گزار رہوں گا اگر میرا اسلام ان تک پہنچ جائے۔ سفر کہانی میں ”اے مباسوئے مدینہ“ رخسانہ سہام مرزا صاحبہ کی تحریر دل میں اتر گئی۔ دوسرے حصے کا انتظار رہے گا۔ اللہ ہمیں بھی اس مقدس مقام کی زیارت کرائے۔ سلیم فاروقی کی ”آنش جنوں“ کے پہلے حصے ہی نے اپنی گرفت میں لے لیا۔ ”ناشون“ اور ”جن آنکھوں میں خواب لیے تھے“ بہت اچھی جا رہی ہیں۔ منظومات بہت کم ہوتی ہیں۔ نگہبائی ہے کچھ تو بڑھائی جائیں کہ شاعری کے شوقین بھی سچی کہانیاں بڑے شوق سے پڑھتے ہیں۔ اب اجازت دیجئے ناصر صاحب نے کہانی سمجھنے کا حکم دیا ہے۔ انشاء اللہ اب کہانی کے ساتھ حاضر ہوں گا۔ میری طرف سے تمام قارئین، اسلاف اور آپ کو پر خلوص سلام۔“

☆ جاوید بھائی! کہانیاں پسند کرنے کا شکریہ۔ آپ کا سلام مرزا شبیر بیگ صاحب تک پہنچا دیا جائے گا اور ہاں کہانیاں ضرور ارسال کرتے رہے۔

✉ سدرہ انور علی، جھنگ صدر سے۔ ”قابل احترام آنٹی جان منزہ السلام علیکم! امید کرتی ہوں کہ آپ بالکل خیریت سے ہوں گی۔ انگل نامصر کی بیماری کا پڑھا، بہت دکھ ہوا۔ ان کو خصوصی سلام اور دعائیں۔ آپ کا ”احوال“ میں آنا بھی ہمیں اچھا لگا اور بہت خوشی ہو رہی ہے۔ آپ سے بات کر کے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو اور سب قارئین کو زندگی کی سچی خوشیاں عطا فرمائے، آمین۔ اپریل کا شمارہ ملا۔ مائیکل گرل تو گزراے لائق ہی ہے۔ آپ کا ادارہ ”محسن“ پسند آیا۔ ”احوال“ میں تمام بہنوں بھائیوں کے خطوط اور آپ کے جوابات پسند آئے۔ زندہ کہانی میں ”یادوں کے رنگ“ پڑھی، بہت پسند آئی۔

ویلزڈن رابو محمود۔ خصوصی کہانیاں میں محمد سلیم اختر کی ”خزاں کے بعد“ ایک ایسی کہانی ہے کہ انسان اس سے بہت سے سبق سیکھ سکتا ہے، اگر چاہے تو!! ایٹا تاج کی ”چکن بریانی“ اگر انسان اپنے اندر صحت پیدا کرے تو وہ تقدیر بدل سکتا ہے جس کی ایک مثال سب کے سامنے ہے۔ شہید کی کہانی میں ”شہید کی ڈائری“ شہادت ساری دنیا کا مالک اور حکمران بننے سے زیادہ افضل ہے اور ہمارے شہداء کا خون رائیگاں نہیں جائے گا۔ عاصیہ کمال کی تحریر ”جی دامان“ محبت کچھ کھونے کا نام ہی تو ہے۔ سنبل کی ”محبت کا چہرہ“ پڑھی جو دل کو دھکی کر گی۔ ہمیشہ کے لیے تو کوئی بھی اس دنیا میں نہیں رہا۔ عارف روہیلا کی تحریر سونے کی بالیاں پڑھی۔ معصوم بچپنوں پر ظلم کرنے والے خود سکون سے رہ سکیں۔ یہ نہیں سکتا۔ کرن محمد فاروق کی ”نفرت بھی درمیاں“ وہ ایک مشہور محاورہ ہے نہ کہ کپڑا پھٹے ہاتھوں، دل بٹھے باتوں، اک ذرا سی غلطی اور بدگمانی گھر اجاڑ دیتی ہے۔ ام عادل کی ”دکھوں کے مارے“ اور حنیف سحر کی ”گردش رنگ چمن“ پسند آئیں۔ مرزا شبیر بیک کی ”انسان نما فرشتہ“ اچھی لگی۔ آج کے جوان اس سے سبق سیکھ سکتے ہیں۔ موبائل کہانیاں طویل جبار کی ماضی میرے سامنے، اگر اس کہانی سے بھی کوئی سبق نہ لے تو یہ اس کی مرضی کی بات ہے۔ پراسرار کہانیاں ٹھیک تھیں۔ میرے شہر کی کہانی میں ارم زہرا ”آرزو میں دفن ہوئیں“ دولت کی خاطر کل کوئی نئی بات نہیں ہے۔ اقبال زمان کی ”لہور رنگ لاتا ہے“ اجتماع کل کی اس داروات نے لہور گر مادیات میں آنٹی رخسانہ سہام مرزا کی ”اے صبا، سوئے مدینہ“ پڑھی، بہت پسند آئی۔ مسجد نبویؐ اور دوسرے مقامات کی بھی زیارت ہوئی بہت خوشی ہوئی۔ ”لکھ رہا ہوں زندگی میں“ انور فریدانے دوسری قسط میں بھی زیادہ تر فکروں کا ذکر کیا۔ آخری قسط میں خدا خیر کرے۔ ”ناشون“ میں دھچکی حد سے سوا ہوئی جا رہی ہے۔ ویلزڈن شازلی سعید۔ انکل سلیم فاروقی کی ”آتش جنوں“ پہلی قسط تو پسند آئی۔ ”جن آنکھوں میں خواب بے تھے“ کی تو کیا سی بات ہے۔ شاعری میں انکل محمد نعیم کی حمد باری تعالیٰ اور رضوانہ کوثر کی ”جھوٹے رشتے“ پسند آئی۔ خیال آرائی میں ”بے سب اداسی“ اگر عکاشہ سسٹر سب کے ساتھ اپنا دکھ شئیر کریں تو شاید ہم ان کا دکھ بانٹ سکیں۔ رمزی آفتم کی کتاب ”کوئی تو خواب ہو“ پر عکاشہ کا تبصرہ لا جواب ہے۔ ”پسند اپنی اپنی“ میں روبینہ شاہین کا شعر پسند آیا۔ ”بازگشت“ میں انکل سہام ”مقدار کو رونا تک بیک؟“ جب تک ہر انسان اپنے آپ کو درست نہ کرے تب تک آنٹی جی انکل نامر سے پوچھ کر بتائیے کہ میری کوئی کہانی کب تک منظر عام پر آئے گی۔ مزید انتظار نہیں ہوتا۔ سب پڑھنے والوں کو ڈھیروں سلام۔ پاکستان کو ہم نے اللہ کے سپرد کیا۔ اللہ سب کو اپنی حفظ و امان میں رکھے۔ زندگی رہی تو اگلے ماہ حاضری ہوگی۔ تب تک اللہ تمہاں۔“

☆ سو سو سی صدرا! بڑا سیدھا سچا سا خط لکھا۔ تحریریں پسند کرنے کا شکر۔ یہ نامر بھائی سے کہانیوں کے سلسلے میں خط کے ذریعے اطلاع دینے کی بات کی ہے، جیسے ہی یہ سلسلہ شروع ہوگا تو پھر تم سب کی شکایت دور ہو جائے گی۔

✉ صفیہ سلطانہ، جبیک آباد سے۔ ”السلام علیکم اللہ کرے کہ آپ خیریت سے ہوں اور سنائیے کیسے مزاج ہیں۔ یہ جبری خط ہے..... ارے..... ارے..... آپ غلط سمجھے کیونکہ تین ماہ کے بعد میں نے 28 کو راج کا شمارہ ملتے ہی، دن شمار کیے بنا بہت فاصل اور بحر پور تیرے کے ساتھ۔ شعروں کا تذکار لگا کے خط لکھا تھا، مگر جب آپ سے فون پر بات ہوئی تو پتہ چلا کہ خط آپ کو نہیں ملا۔ وہ خط اس لیے بھی بے حد اہم تھا کہ اس کے ہمراہ محمد نعیم صاحب کی شاعری پر میں نے بہ قطر غائر تبصرہ لکھا تھا اور اس کی عکسی نقل بھی اپنے پاس نہیں رکھی، جس کا قلق ہے۔ اللہ کرے کہ وہ خط آپ کو مل جائے۔“ وہ درخشاں ستارہ کے نام سے ارفع کریم کے حالات زندگی (مختصر ترین حالات زندگی) پڑھ کر بہت اچھا چھی لگا اور دکھ بھی ہوا۔

عجب کیا ہے جو نو خیزوں نے پہلے جا میں دیں

یہ بچے ہیں انہیں جلد سو جانے کی عادت ہے

اور اس منہی گڑبائی شاعری نے بھی بے حد متاثر کیا۔ اللہ کے حکم کے آگے ہماری کیا مجال ہے۔ فیضان عثمانی کی ”فیض کمال“ بہت اچھی لگی، ویلزڈن بھیا۔ صرف آصف کی کہانی ”اے جذبہ دلی“ پاکستان سے محبت پر بہت دلگداز و امتنان بھی جس نے بے حد متاثر کیا۔ امر منصور کی کہانی بھی ایک نیا رنگ سمیٹے ہوئے گی۔

دیگر کہانیاں بھی بے حد اچھی تھیں۔ ان پر تبصرہ چونکہ کر دیا تھا پرچہ اس وقت سامنے نہیں ہے۔ تو ایسا لگ رہا ہے جیسے رات کے باقی چادلوں پر تذکار لگا تا..... اب انشاء اللہ اگلے ماہ زندگی بخیر، خط لکھوں گی اور اللہ کرے کہ وہ مل بھی جائے۔“

☆ صفحہ جی! آپ کا مفصل خط لگتا ہے ڈاک خانے والوں نے رکھ لیا۔ آپ لکھتی ہی اتنا اچھا ہیں۔ اب ان کا کیا تصور چلیں آئندہ آپ کے خط کا انتظار رہے گا۔

✉ بشیر احمد بھٹی، بہاولپور سے۔ ”مارچ 2012ء چچی کہانیاں کی کہانیوں پر تبصرے سے قبل ایک چھوٹی سی شکایت ملاحظہ فرمائیں۔ دسمبر 2011ء میں ”احوال“ میں خط اور خط کے ہمراہ کہانی ”اللہ کی عدالت“ آپ کو ارسال کی۔ جنوری 2012ء کے شمارے میں آپ نے لیت پختہ دالے خطوط میں میرا نام شائع کیا۔ میرا خیال ہے بیچ جانے والے خطوط کو آپ کھولتے نہیں۔ اوپر سے نام دیکھ کر شائع کر دیتے ہیں۔ کہانی اپنے نمبر کی منتظر ہے یا رڈی کی نوکری، ختم کر گئی؟ اس بارے میں ضرور مطلع کریں تاکہ میں مزید کہانیاں ارسال کر سکوں۔ اب آئیے مارچ کے چچی کہانیاں کی جانب۔ معصوم ارفع کریم کی تصویر ”حسرت ان غنچوں پر“ نامی نکل پر موجود ہے۔ وہ درخشاں ستارہ عنوان سے معصوم ارفع کریم کا ”احوال“ نامہ شائع کر کے آپ نے (ادب) کا حق ادا کر دیا۔ ارفع کریم کی وفات بہت بڑا سانحہ ہے۔ میرا بیٹا محمد احسان اللہ عمر میں برس۔ ایس ای کالج کا اسٹوڈنٹ تھا۔ 4 ستمبر 2010ء رمضان شریف کا چوتھوں سو دن روزہ رات بارہ بجے دکنوریہ اسپتال سی سی یو میں اللہ کو پیارا ہو گیا تھا۔ یہ ایسا صدمہ تھا جو میں نہیں بھلا سکا۔ سوچتا ہوں۔ اولاد کا دکھ بھی کیا دکھ ہوتا ہے۔ اللہ پاک ارفع کریم مرحومہ کو میرے بیٹے محمد احسان اللہ کو اور ان جیسے تمام ان پھولوں کو جوار رحمت میں جگہ دے۔ جنت الفردوس عطا کرے۔ والدین کو صبر جمیل عطا فرمائے آمین۔ ارفع کریم کے والدین سے استعا کرتا ہوں کہ مرحومہ کی لحد پہ زیادہ سے زیادہ قرآن کریم کی تلاوت کریں۔ اس عمل سے بھی دل کو سکون ملتا ہے۔ میرا بھی جب دل گھبراتا ہے۔ بیٹا شدت سے یاد آتا ہے تو دعاؤں کی کتابیں لے کر بیٹھ کر چلا جاتا ہوں اور پڑھتا رہتا ہوں۔ قرآن کریم کی تلاوت اور دعاؤں سے رحمت کے فرشتے مرحومین کی قبروں پر رحمت کے پھول نچاؤ کرتے ہیں۔ بلا شک ہم دفن مرحومین کو نہیں دیکھ سکتے مگر وہ ہمیں اللہ کی قدرت و کرم سے دیکھ لیتے ہیں۔ ارفع کریم تو جنت کا گلاب بھی۔ انشاء اللہ جنت الفردوس میں خوش و خرم ہوگی۔ اللہ میرے بیٹے محمد احسان اللہ کو بھی جنت الفردوس میں جگہ دے، آمین ثم آمین۔ ”زور پوچھیں کاہن“ اور ”جنونی محبت“ دونوں کہانیاں اچھی کاوش ہیں۔ مختصر کہانیوں میں شہید کی ڈائری، جی علی الفلاح، وہ اجنبی سا بھی، جگہ جیتی، میں دیار سنگ نے مٹا کر کیا۔ سلیطہ دار کہانی ”ناشون“ دلچسپ رہی مگر صفحات ذرا کم ہیں۔ پراسرار کہانیوں میں وہ ”عجیب فیچر“ دو صفحہ کی کہانی سبق آموز ہے۔ واقعی راستے میں بڑی ہوئی کسی بھی چیز کو اٹھانا اچھی بات نہیں مگر ہمارے ہاں تو معاملہ ہی الٹ ہے۔ ”گھائل آتما“ اپنے اختتام کو پہنچی۔ ابھی مزید کہانیوں کا مطالعہ جاری ہے۔ اس شمارے میں کوپن وغیرہ کا صفحہ غائب ہے۔ کیا یہ سلسلہ بند کر دیا گیا ہے؟ یا یہ صرف کچھ عرصہ کے لیے ہے۔ کوپن کا سلسلہ جاری رکھیں۔ اس طرح قارئین کو خطوط جلدی بھیجنے کا شغف رہتا ہے۔“

☆ بشیر بشیر! بیٹے احسان کے بارے میں جان کر بہت دکھ ہوا۔ میرے پاس وہ الفاظ نہیں جو آپ کے دکھ کو کچھ لمحوں کے لیے ہی تم کر سکیں۔ شاید اولاد کو واسی لیے آزمائش کہا گیا ہے۔ میری دعا ہے کہ اللہ تمام والدین کو اس دکھ سے محفوظ رکھے جس نے بھائی بشیر کے دل میں گھر کر لیا ہے، آمین۔ کہانیاں آپ کو اچھی لگیں، شکریہ یقیناً کتبے خطوط ہمیشہ سے میں ہی کھولتی ہوں لہذا بنا پڑھے شائع کرنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ آپ کی کہانی ہمارے پاس ہے، بہت جلد شائع ہوگی۔ امید ہے کہ آپ کی شکایت دور ہوگئی ہوگی۔

✉ اے آر رضوی، راولپنڈی سے۔ ”السلام علیکم! امید ہے کہ آپ بخیریت ہوں گے۔ آپ کے ادارے سے پرانا تعلق ہے تاہم آپ کو بجلی بار خط لکھ رہا ہوں۔ میرا نام اے آر رضوی ہے اور سن اسی کی دہائی میں اسی نام سے ماہنامہ دو شیزہ میں لکھتا رہا ہوں۔ سہام مرزا احیات تھے اور عرفان فاروقی دو شیزہ کی ایڈیٹر تھیں۔ میں اس دور میں کراچی میں تھا۔ لہذا کئی بار ملاقات بھی ہوئی اور دو دفعہ دو شیزہ ایوارڈ کی تقریب میں شرکت بھی کی، معروف رائرز سے ملاقات بھی رہی۔ پھر گردش ایام اور زندگی کی مصروفیات کے رابطہ نہ رہا۔ اب ایک طویل عرصے بعد ماہنامہ چچی کہانیاں دیکھا تو آپ کی محنت کو داد دینے اور ایک دفعہ پھر آپ کی محنت میں آنے کو دل چاہا چنانچہ آپ کی خدمت میں موبائل کہانی ”قاتل موبائل“ لے کر حاضر ہوا ہوں۔ اسے کسی قریبی اشاعت میں لگا دیجئے گا۔ امید ہے کہ اس چچی تحریر کو قارئین پسند فرمائیں گے۔ آپ نے حوصلہ

افزائی فرمائی تو آپ سے رابطہ اور قارئین سے ملاقات ہوتی رہے گی۔ محترمہ رخسانہ سہام مرزا کو میرا سلام دیجئے گا۔ بہت سی نیک دعاؤں اور بہترین خواہشات کے ساتھ اجازت چاہوں گا، اللہ حافظ۔“

☆ رضوی صاحب! آپ ”احوال“ میں تشریف لائے، بہت اچھا لگا۔ کہانی ناصر صاحب کی نیبل پر پہنچاؤ گئی ہے۔ امید ہے کہ اب آپ کچھ نہ کچھ وقت نکال کر ضرور تشریف لاتے رہیں گے۔

✉ مور شاہد وفا، کراچی سے لکھتے ہیں۔ ”السلام علیکم! امید ہے کہ آپ بالکل ٹھیک اور صحت یاب ہوں گے۔ اللہ آپ کو اپنے حفظ و امان میں رکھے، آمین۔ خطوط کی محفل میں اب کچھ زیادہ سی رونق تھی۔ آئی منہ سہام نے خطوط کے جوابات دے کر محفل کو شاندار کر دیا۔ آئی منہ سہام نے محسن کے عنوان سے بہت اچھا لکھا۔ اُن ہی کے قلم سے ”شہید کی ڈائری“ پڑھ کر بہت اچھا لگا۔ کچھ دن پہلے ہم نے بھی کچھ پودے اور بہت اقسام کے پھول لگائے ہیں۔ عارف حسین روہلا کے قلم سے ”سونے کی بالیاں“ پڑھ کر بہت دکھ ہوا۔ ام عادل کے قلم سے ”دکھوں کے مارے“ پڑھ کر بہت دکھ ہوا اور آج صبحیں غم ہو گئیں۔ غلیل جبار کے قلم سے ”ماضی میرے سائے“ دل دہلانے والی کہانی تھی جیسی کہنی ویسی بھرنی انجیان کے قلم سے ”بھوت گھر“ بہت دلچسپ کہانی تھی۔ عمرانہ رمضان کے قلم سے ”کلام حق“ پڑھ کر بہت خوش ہوئی۔ سبحان اللہ واقعی قرآن مجید جھلکے ہوؤں کو سیدھی راہ دکھاتا ہے۔ اقبال زمان کے قلم سے ”ہورنگ لاتا ہے“ پڑھ کر اس سنگین حادثے پر آنکھوں سے آنسو جاری ہوئے۔ ستر کہانی اسی رخسانہ سہام مرزا کے قلم سے ”اے ماسوئے مدینہ“ بہت دلچسپ تھی۔ اسی اللہ آپ کو ہمیشہ خوش و خرم رکھے، آمین۔ انکل سلیم فاروقی کے قلم سے ”آتش جنوں“ کی پہلی قسط حد سے زیادہ دلچسپ تھی۔ کچھ معروضات کے باعث شمارہ اتنا ہی پڑھا ہے۔ اللہ تمام اہل وطن کو دشمنوں کی بری نظر سے بچائے، آمین۔ اور اب اس شاعری کے ساتھ اجازت

سنو اے جاناں
تمہیں بھول جاؤں یہ ممکن نہیں
جیسے دریاؤں کا الٹا بہنا ممکن نہیں
یہ ٹوٹا ہوا دل تمہیں یاد کرتا ہے
ہر گھڑی ہر پل تمہیں یاد کرتا ہے

☆ بھائی مور شاہد وفا! آپ کی شاعری ”احوال“ میں شائع کروں۔ اب تو خوش ہیں۔ میرے پاس اتنی ہی مینجائش تھی کہانیاں آپ کو اچھی لگیں شکر یہ۔ سلیم فاروقی صاحب تو پھولے نہیں سارے ہیں۔ ابھی آخر پچی کہانیاں کے ایڈیٹر تھے..... آپ سب کے درمیان رہنا انہیں بھی اچھا لگتا ہے۔

✉ محمد راشد مغل، سکھر سے۔ ”میرا تعلق سکھر سے ہے اور میں درس و تدریس سے وابستہ ہوں۔ آپ کا ڈائجسٹ ماہنامہ بھی کہانیاں میں ذوق و شوق سے پڑھتا ہوں، میں شاعر بھی ہوں۔ شعر، شاعری سے بہت پرانا رشتہ ہے۔ نثر پر مجھے کما حقہ نہیں ہے۔ اگر میں کوشش کروں تو نثر لکھ سکتا ہوں۔ خیر آپ کے ڈائجسٹ میں شاعری کے لیے جگہ نہیں ہے جس طرح دیگر ڈائجسٹ میں شاعری کے لیے مخصوص جگہ ہوتی ہے۔ اگر آپ کہیں تو میں آپ کو اپنی کچھ غزلیں ارسال کروں اگر آپ کو اور آپ کے ادارے کو پسند آئیں تو ضرور پچی کہانیاں میں شامل کریں۔ اپنا بہت خیال رکھیے گا۔ میری دعا ہے کہ آپ کا ادارہ اور زیادہ ترقی کرے۔“

☆ بھائی راشد مغل! شاعری ضرور ارسال کریں اور اس کے ہمراہ تصویر بھی بھیجیں اگر آپ کی شاعری معیاری ہوئی تو ضرور شائع ہوگی۔

✉ شراحہ، کراچی سے۔ ”12-2012-1 کو ایک تحریر ارسال کی تھی جواب تک شائع نہیں ہوئی۔ نہ ہی میری غزل شائع ہوئی ہے۔ پوچھتا ہے کہ کیا وہ تحریر..... غزل معیاری نہیں؟ پچی کہانیاں میں اپنی تحریر پڑھ کر اچھا لگتا ہے شکر یہ آپ کا۔ آپ نے مجھے اس قابل سمجھا خدا آپ کو صفا خوش رکھے، آمین۔ اپنی غزل اور مضمون ارسال کر رہی ہوں۔ معیاری ہوں تو ضرور جگہ دیجئے گا انتظار رہے گا۔ شکر یہ کے ساتھ اجازت دیں۔“

☆ شاعر! اتنا مختصر خط کہ قہقہی چلانے کی کوئی گنجائش ہی نہیں اور بھی تمہاری تحریریں تو اکثر شائع ہوتی رہتی ہیں، جو چیز شائع نہ ہو تو سمجھ جاؤ تم نے پوری محنت نہیں کی۔ رسالے میں کچھ تبدیلیاں لائی جا رہی ہیں، ان کے بارے میں ضرور لکھنا۔

✉ ام عادل، کراچی سے۔ ”محترمہ منزہ سہام السلام علیکم! کہیے کیسے مزاج ہیں، امید ہے بخیر ہوں گے۔ آپ کی ”نو اے امرد“ تو ہر ماہ ذوق و شوق سے پڑھتے ہیں جو وسعت میں کم مکرزون میں زیادہ ہونے کی وجہ سے آنکھوں کے راستے دل میں اتر جاتی ہے۔ رسالے میں آپ کا طرزِ مخاطب دیکھ کر دل خوش ہوا اور اب آپ سے مخاطب ہونا بھی دلی مسرت دے رہا ہے۔ آپ کی آمد ایک محضر جھونکنے جیسی گلگی ہم پر بھیجی جاتے ہیں کہ اس کے علاوہ بھی آپ کی بہت ساری ذمہ داریاں ہیں جن کی وجہ سے ”احوال“ کی ذمہ داری آپ پر ایک اضافی بوجھ ہے۔ منزہ صاحبہ میں آپ کے روزنامہ ”فلک ناخن“ کے حوالے سے کچھ وضاحت چاہتی ہوں پلیز رہنمائی کیجئے۔ آپ کی کاوش ”فلک ناخن“ کی صورت کب تک منظر عام پر آ رہی ہے؟ میں اس روزنامے میں کالم نگاری کرنا چاہتی ہوں۔ اس کا کیا طریقہ کار ہوگا۔ محترمہ قاطرہ شایعہ صاحبہ ہماری بزرگ، صاحبِ علم اور کزنہ مشقِ رائٹر ہیں۔ آپ کے اور ان کے اشتراک سے لکھنا ایک بہترین اور مکمل روزنامہ ہمیں پڑھنے کو ملے گا۔ فلک ناخن کے اشتہار کے ساتھ ہی آپ کی آواز ”محسن“ پڑھی۔ سو فیصد صحیح کہا آپ نے وہ دو میں ہمیشہ تنزیل کا شکار ہی ہوتی ہیں جو اپنے محسنوں کے احسانات فراموش کر کے ان سے بدسلوکی کے جرم کی مرکب ہوتی ہیں۔ کہانیوں کی فہرست میں اپنی کہانی دیکھ کر خوش ہوئی۔ اس کی خبر پہلے ہی محترم ناصر رضا بیانون پر دے چکے تھے۔ کہانی کے علاوہ میری خیال آرائی نے بھی رسالے میں جگہ پائی، اتنی جگہ دینے اور میری تحاریر کو پذیرائی دینے پر تہ دل سے شکریہ قبول کیجئے۔ آپ نے میرے پسندیدہ ترین رائٹر جناب سلیم فاروقی صاحب کی سلسلہ وار سرگزشت ”آتش جنوں“ لگا کر نہ صرف مجھے بلکہ ان کے تمام چاہنے والوں کو بہت بڑا سر براہ دیا ہے۔ شاید اس کے لیے شکریہ کا لفظ چھوٹا ہے۔ منزہ صاحبہ یقین مایے میری اپنی کہانی لکھنے کی خوشی سلیم فاروقی کی تحریر کے سامنے ماند پڑ گئی ہے۔ اب تو ہر ماہ رسالے کا انتظار اور زیادہ شدت سے رہے گا۔ منزہ صاحبہ میرے بیٹے کی صحت اکثر خراب رہتی ہے اس کی بحالی صحت کی دعا کیجئے گا۔ وہ میری واحد اولاد ہے۔ اس کی ناسازی طبیعت کی وجہ سے دل ہمہ وقت پریشان رہتا ہے۔ اسی کے ساتھ اجازت دیجئے خدا ہم سب کا حامی و ناصر ہو، آمین اللہ تمہارا۔“

☆ ڈیڑم عادل! سب سے پہلے تو بیٹے کی صحت یابی کے لیے نیک تمنا میں اور بے شمار دعائیں۔ ایک ماں ہی یہ بات جان سکتی ہے کہ اولاد کی محبت کیا معنی رکھتی ہے۔ اللہ پر مکمل بھروسہ رکھو بے شک وہ نہایت مہربان ہے۔ سلیم فاروقی صاحب تک تمہاری تعریف پہنچادی۔ وہ شکر یہ کہہ رہے ہیں۔ دفتر جب آنا چاہا تو میں افسس میں ہوتی ہوں۔ فلک ناخن بابت سے شائع ہو رہا ہے ابھی کیونکہ ابتدائی مراحل میں ہے اس لیے کچھ دشواریاں ہیں۔ تم ہمیں بھی دعاؤں میں یاد رکھا کرو۔

✉ ارشد بخاری لکھتے ہیں۔ ”شاید آپ کو یاد ہوگا کہ آپ نے فروری 2012ء کے شمارے میں میرے کچھ احساسات شائع کر کے وعدہ کیا تھا کہ میری تحریر کردہ سچی داستان ”انسان اور شیطان“ جو ملک دشمنوں کی سازشوں کو بے نقاب کرتی ہے، مارچ 2012ء کے شمارے میں شائع کر دی جائے گی مگر افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ یہ کہانی مارچ اور اپریل کے شماروں میں شائع نہ ہوئی شاید آپ حکومت وقت کے نقش قدم پر چل رہے ہیں اور وعدہ خلافی کی روش اختیار کر رہے ہیں۔ میں نے ساری عمر صحافت، وکالت اور سیاست بیانی سے گزاری ہے اور عمر کے اس حصے میں بھی میرے لاتعداد تجربات، مشاہدات، واقعات شائع ہو چکے ہیں۔ جس کی فہرست آپ دیکھ چکے ہیں۔ اگرچہ آپ کی طرف سے پذیرائی کی بجائے مایوسی ملی ہے لیکن پھر بھی میری دعا ہے کہ کبھی کہانیاں ڈائجسٹ قوم اور معاشرے کا رنج و ترحمان بنے اور کامیاب رہے۔“

☆ ارشد بخاری! آپ کی کہانی کی اشاعت میں دیر صرف ناصر بخاری کی ناسازی طبع ہے اور کچھ بھی نہیں مگر آپ کا یہ جملہ سہا گیا کہ ”آپ حکومت وقت کے نقش قدم پر چل رہے ہیں“ یقین کیجئے ایسا بالکل نہیں ہے۔ برے سے برے انسان بھی حکومت کے نقش قدم پر نہیں چل سکتا ہماری بھی اتنی مجال کہاں۔ بہر حال غصہ چھوڑیے اور ”احوال“ میں آتے رہیے،

✍ حافظہ منور شاہ سرگودھا سے۔ "احوال" میں اپنا خط دیکھ کر اور نظم پڑھ کر خوشی ہوئی اور یہ خوشی اس وقت مزید بڑھ گئی جب اپنی کہانی کو انعام یافتہ لسٹ میں پایا۔ آپ کا بہت بہت شکریہ اور ان احوالیوں کا بھی شکریہ جنہوں نے میری کہانی کو پسند کیا لیکن آپ نے میری سلسلہ وار کہانی کے بارے میں نہیں بتایا وہ کب شائع ہوگی؟ "بچی کہانیاں" تو ہر بار شائع رہی ہوتا ہے اور اس میں شائع ہونے والی ہر کہانی شاندار ہی نہیں لاجواب ہوتی ہے۔ ماہ اپریل کا شمار بہت پیارا اور اس پر موجود ماڈل نہایت خوب صورت تھی۔ محترمہ منزہ سہام صاحبہ کا ادارہ ہمیشہ کی طرح بہترین اور اپنے اندر ایک گہرائی لیے ہوئے تھا۔ "احوال" میں ان کے شگفتہ گفتگو جواہرات دل کو بھائے۔ رخسانہ سہام صاحبہ کی ستر کہانی "اے مہاب سوئے مدینہ" بہت شاندار رہی، دل کو پڑا مچتی۔ اللہ تعالیٰ ہر مسلمان کو اپنا اور اپنے پیارے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم کا در دکھائے، آمین۔ راجہ محمود صاحب کے قلم سے زندہ کہانی سید صادق نقوی "یادوں کے رنگ" بہت اچھی لگی۔ کہانیوں میں مومن کی بالیاں، چکن بریانی، محبت کا چہرہ بہت بھائیں۔ "گردش رنگ چمن" اور "آتش جنوں" بھی اچھے سسلے ہیں جب کہ اس وقت میری پسندیدہ کہانی "چمن آنکھوں میں خواب بے تھے" ہے۔ "خیال آرائی" میں دو قصاصد ام حسین عازمی اور ممتاز احمد کی خیال آرائی بہت پسند آئیں۔ راجہ محمود صاحب سے فرمائش ہے کہ وہ اداکار شان اور اداکارہ ریماکس کے بارے میں بھی لکھیں اور اگر مناسب سمجھیں تو کبھی کبھار کسی عالم دین کے حالات زندگی پر بھی تفصیلی مضمون لکھا کریں۔ اللہ کرے ہوزور قلم اور زور کرم اور اور زیادہ پھر آئیں۔

✍ حافظہ منور! ناراض مت ہو جانا تمہارے خط سے بس کچھ لائنیں حذف کر دی ہیں۔ تمہاری رائے اچھی لگی۔ اس لیے فوراً راجہ صاحب تک پہنچا دی ہے۔ ای کی تحریر اچھی لگی وہ شکریہ کہہ رہی ہیں۔ امید ہے محفل میں آتی رہو گی۔

✍ دو قصاصد ام حسین عازمی قیو، حیدر آباد سے۔ "السلام علیکم! پیاری بہن منزہ سہام باجی آپ کو "احوال" میں خوش آمدید کہتے ہیں۔ آپ کا "احوال" میں آنا ہمیں اچھا لگا۔ بڑی خوشی ہوئی۔ باجی! کچھ دن پہلے میرا انتخاب پرتمن دن کے لیے جانا ہوا۔ یقین چاہیے بڑا دلی سکون ملا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے کام والا کردہ، اپنے نبی کے طریقوں پر چلنے والا کردہ ہر سنت کو زندہ کرنے والا کردہ۔ جس میں سندھی بھی ہیں، پٹھان بھی ہیں، پنجابی بھی اور بلوچ بھی اور مہاجر بھی سب بھائیوں کی طرح رہتے ہیں۔ کاش پاکستان ایسا ہو جائے کاش سارے پاکستانی ایسے ہو جائیں پھر ہر طرف محبت ہی محبت ہوگی۔ اپریل کا پرچم۔ "احوال" میں آپ کو دیکھ کر دل خوش ہوا۔ "احوال" میں ساتھیوں کے خط پڑھے جن دوستوں کو میری کہانی پسند آئی ان کا شکریہ۔ اب آتے ہیں کہانیوں کی طرف۔ راجہ محمود کے قلم سے "یادوں کے رنگ" پڑھ کر اچھا لگا۔ محمد سلیم اختر کے قلم سے "خزاں کے بعد" اچھی لگی۔ مینا تاج کے قلم سے "چکن بریانی" اچھی لگی۔ آپ کے قلم سے "شہید کی ڈائری" اچھی لگی۔ بے شک شہید زندہ ہوتے ہیں۔ عائشہ کمال کے قلم سے "نئی داماں" دیکھ بھری کہانی تھی۔ سنبل کے قلم سے "محبت کا چہرہ" اچھی کہانی تھی۔ عارف حسین کے قلم سے "سوئے کی بالیاں" دیکھ بھری کہانی تھی۔ کرن محمد فاروق کے قلم سے "نفرت مٹی درمیاں" عبرت انگیز کہانی تھی حنفی سحر کے قلم سے "گردش رنگ چمن" عجیب کہانی تھی اور سلیم فاروقی کے قلم سے "آتش جنوں" پڑھی۔ اچھی کہانی ہے اچھی قسط کا انتظار ہے۔ بہن بس اتنا ہی پڑھ پایا ہوں۔ آپ سے التجا ہے خط کے پہلے حصے پر پتھی نہ چلائی جائے پلیر اور دعاؤں میں یاد رکھے گا۔

✍ بھائی دو قصاصد ام حسین! بے شک نبی کے بتائے ہوئے راستے پر چلنے ہی میں عافیت ہے۔ اللہ کرے یہ بات تمام مسلمانوں کو سمجھ میں آجائے آپ کو کہانیاں اچھی لگیں تو ہماری محنت بھی ٹھکانے لگی۔ جہاں تک پتھی نہ چلانے کا سوال ہے تو بھیا گھوڑا گھاس سے کیسے دوستی کر سکتا ہے۔ آپ سب کے خطوط دیکھ کر تو پتھی صاحبہ ویسے ہی لپکانے لگتی ہے۔ ویسے یہ زیادتی ہے احوال اور پتھی کا ساتھ اتنا پرانا ہے اور آپ لوگ ہیں کہ مانتے ہی نہیں۔

✍ محمد شعیب و فاکرم! انجمنی سے۔ "خادم" نے کچھ عرصہ پہلے دو عدد کہانی بعنوان "تہائی سی تہائی ہے" اور "زندگی ٹھہر ڈرا" آپ کے رسالے کے لیے بھیجی تھیں لیکن نامعلوم کس وجہ سے وہ اب تک رسالے کے ادراک پر آنے سے قاصر ہیں اور اب ایک نئی کہانی "جینے کی حسرت" اور "خیال آرائی" کے ساتھ آپ کے "احوال" میں شرکت کر رہا ہوں اگر

رسالے کے معیار اور قارئین کی پسند کے مطابق ہوں تو ضرور شامل اشاعت کیجئے اگر مجھے جلدی چھپنے کا موقع ملا تو وعدہ رہا ہر ماہ ایک کہانی آپ کو ضرور بھیجوں گا، انشاء اللہ، تبصرہ ضرور کرتا مگر اس ماہ کا شمارہ مجھے لیٹ موصول ہوا ورنہ پرانے اور نئے نگہاریوں کو ضرور سراہتا کہ یہ ان کی محنت کا حق ہے مگر کیا کروں اب صرف دعائے خیر ہی کر سکتا ہوں۔ امید ہے کہ میرے کہانی اور خط رسالے میں شامل فرمائیں گے اور شکریہ کا موقع دیں گے۔

☆ بھائی شعیب! آپ کی کہانیوں پر کام ہو رہا ہے۔ انشاء اللہ جلد آپ کو مطلع کیا جائے گا۔ رسالے کے بارے میں کچھ تو لکھتے! پٹلیں اٹلی بار سی۔

✉ روینہ منور کراچی سے۔ "ایڈیٹر صاحب! آداب! میں آپ کی بہت مشکور ہوں کہ آپ نے میری چھوٹی سی تحریر بھی کہانیاں کے مقبول سلسلے "خیال آرائی" میں شائع کر کے میری ہمت افزائی کی ہے۔ میں تہ دل سے آپ کا شکریہ ادا کرتی ہوں اور آپ کے لیے دعا گو ہوں، اللہ آپ کو اپنی امان میں رکھے، آمین۔ اور آپ کو دن دو گنی اور رات چو گنی ترقی عطا فرمائے، ایک بار پھر دل کی گہرائیوں سے آپ کا شکریہ ادا کرتی ہوں۔"

☆ روینہ! کچی کہانیاں تو آپ لوگوں کا اپنا پرچہ ہے۔ لکھتی رہیے، ہمیں انتظار رہے گا۔

✉ غزالہ شاہین عبدالقیوم، حیدرآباد سے۔ "قابل احترام ایڈیٹر صاحب! السلام علیکم! اللہ آپ کو صحت اور تندرستی عطا کرے اور آپ کا رسالہ "کچی کہانیاں" ترقی کے راستوں پر گامزن رہے، آمین۔ پراسرار کہانی کے سلسلے کی ایک کہانی "مہرباں ایسے" ارسال کر رہی ہوں۔ امید ہے کسی قریبی اشاعت کا حصہ بنائیں گی۔"

☆ ڈیر غزالہ! آپ کی کہانی ناصر رضا صاحب کو بھیجوا دی ہے اور جلد آپ کا انعام آپ تک پہنچے گا۔

اس ماہ کا خصوصی خط

شفیق فکیسی، سیالکوٹ سے۔ "خوبصورت سرورق اور موٹا تازہ شمارہ اپریل 2012ء دل کو بہت بھایا۔ اس بار "احوال" بے حد طویل ہونے کے ساتھ ساتھ بے حد مزیداریا توں سے بھرا ہوا تھا۔ اس بار سب سے خوب صورت خط عکاشی کا تھا۔ "کچی کہانیاں" کی کہانیاں ہر ماہ اپنی خوب صورتی اور نئے پن کے ساتھ ساتھ دل کے اندر گھر کر جاتی ہیں۔ "محبت کا چہرہ" دل میں محبت کے جذبات کو بہت زیادہ بھار گئی۔ بے حد عمدہ تحریر تھی۔ "دکھوں کے مارے" سخت دکھی کر گئی۔ "آرزو میں دفن ہو میں" دل کو چیر دینے کی حد تک سفاک سچائی تھی اس تحریر میں۔ "سونے کی بالیاں" اور "جی داماں" بھی شاندار رہی تھیں۔ فی الحال اتنا ہی مطالعہ کر پائی ہوں اسی لیے یہ چھوٹا تبصرہ قبول نہ کریں۔ ہمبر اقبال میں ابھی موسم میں کچھ ٹھنڈک باقی ہے۔ پیارے کراچی میں موسم کس جون پر ہے؟ ضرور بتائیے گا۔ سب نے لکھنے والوں کو خوش آمدید۔ میرے پرچے ہو رہے ہیں دعا گو رہے گا۔ اک شاعر کے ساتھ اجازت چاہوں گی۔

سفر زندگی تمام ہوتا ہی نہیں ہے
کہ ہر ایک رستے آبلہ پائی کا شکار ہیں بہت
☆ شفیق! تمہارا خط مجھے بہت اچھا لگا۔ مختصر بھی اور کچھ کچھ طویل بھی۔ ہر حال اب صرف اپنے امتحانوں پر توجہ دو
رزلٹ بہت اچھا آنا چاہیے۔ مثالی ہماری طرف سے ہوگی ٹھیک ہے نا؟

نوٹ: ان قارئین کے خطوط تاخیر سے ملنے کے باعث شامل "احوال" نہ ہو سکے۔ سہیل خان، کورنگی کراچی۔

تنویر خالد، دوکوٹ۔ عائشہ خورشید، کراچی۔

پھر پٹلیں گے گر خدا لایا

منزہ سہام

زندہ کہانی مشہور و معروف شخصیات کی زندگی سے اخذ کردہ واقعات اور ان سے جڑی کہانیاں

راجہ محمود



شہنشاہ جذبات

قابلِ اجیری کا خیال
جن فضاؤں نے مجھ کو دیکھا ہے
اُن فضاؤں کو یاد آؤں گا

پاکستانی فلمی افق کا جگمگا ستارہ اور لیجنڈری فنکار محمد علی کا احوال زیت



ہال میں اس نوجوان مقرر کی آواز گونج رہی تھی اور سامعین یوں اس کی تقریر کے سحر میں گتے جیسے نہیں چٹا پٹا کر رہ گیا ہو۔ نوجوان کی آواز میں گرج تھی کوئی عجیب سی لہجہ جس میں ایک محکمیت اور انداز میں وقار تھا۔ اس کا تلفظ دلکش تھا اور جملوں کی اداسگی میں قدرت تھی۔ ان تمام خوبیوں کے ساتھ اس نے اپنی تقریر سے ماحول پر سکتہ سا طاری کر دیا تھا۔ بیج صاحبان بھی مبہوت تھے اس نوجوان مقرر پر نظریں جمائے ہوئے تھے۔ ان کے تاثرات دیکھ کر یقین سے کہا جاسکتا تھا کہ اس انٹر کالج تقریر پر مقابلے کا فاتح بھی نوجوان رہے گا۔

نوجوان نے اپنی تقریر کا اختتام کیا تو پورا ہال تالیوں سے گونج اٹھا۔ بیج صاحبان بھی داروئے بھیر نہ رہ سکے اور جب مقابلے کے فاتح کا اعلان ہوا تو سب کی توقع کے عین مطابق اسی نوجوان کو بہترین مقرر قرار دیا گیا۔ مردانہ جہات کا نمونہ اس نوجوان کا نام محمد علی تھا جو گورنمنٹ سنی کالج حیدر آباد کی نمائندگی کر رہا تھا۔ وہ اپنے اسے طالب علم تھا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ محمد علی نامی اس نوجوان نے تقریری مقابلہ جیتا ہو بلکہ وہ اپنی زبردست آواز اور دلکش انداز بیان کے باعث متعدد بار تقریری مقابلوں کا فاتح رہ چکا تھا۔ اس کے اساتذہ کو اپنے اس ہونہار طالب علم پر غرور تھا جو کالج کے وقار میں اضافے کا باعث بنا تھا۔ زائد طالب علمی میں اپنی آواز کا جادو بگائے والے محمد علی کو شاید اور ایک بھی نہیں ہوگا کہ آنے والے وقت میں کسی کیسی کامیابیاں ہاتھ باندھے اس کی منتظر ہیں اور تقدیر کے چنوں پر اس کے لیے ایسا کونسی لکھا ہے کہ ایک عالم اس کی عمر گھن والی آواز اور اس کی مردانہ وجاہت سے مالا مال شخصیت کا یاد پڑ جائے گا۔

19 اپریل 1931ء کو دنیا کے کالج پر نمودار ہوئے

والے محمد علی نے ہندوستان کے صوبے اتر پردیش (یوپی) کے علاقے رام پور کے ایک خالص دین دار گھرانے میں آنکھ کھولی۔ ان کے والد مولانا سید مرشد علی جدید عالم دین تھے۔ محمد علی کے آباؤ اجداد کا تعلق سلسلۂ نقشبندیہ کے جد امجد حضرت مجدد الف ثانی سے جا ملتا ہے۔ ان کے والد کا تعلق بنیادی طور پر افغانستان کے تاریخی شہر غزنی سے تھا۔ ایک رات ان کے خواب میں جد امجد حضرت مجدد الف ثانی آئے اور انہیں غزنی چھوڑ کر ہندوستان ہجرت کرنے کا حکم دیا۔ مرشد کے حکم پر مولانا سید مرشد علی نے فوراً رنج سفر باغداد اور ہندوستان کے شہر رام پور میں سکونت اختیار کی۔ گھر آنے چکے نہ ہی تھا بھڑا بچوں کو انگریزی تعلیم دلانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا چنانچہ دو بھائیوں اور دو بہنوں میں سب سے چھوٹے محمد علی کو چودہ سال تک اردو عربی اور فارسی زبانوں کے علم سے آراستہ کیا گیا۔ محمد علی کی پیدائش کے فوری بعد ان کے اہل خانہ رام پور سے بونگہ کے قصبے جتے جو صوبہ برہما نڈا کا ضلع تھا اس لیے محمد علی کا بچپن رام پور اور پٹنالی کی گلیوں میں گزرا تھا۔ کہیں سب سے چھوٹا ہونے کے باعث محمد علی کو سب پیار سے سنا کہتے تھے۔ وہ ابھی بہت چھوٹا تھا کہ والدہ دارغ مفارقت دے گئیں۔ یوں اس کی پرورش والدہ بڑے بھائی ارشد علی اور بڑی بہنوں کے زیر سایہ ہوئی۔ کہیں میں دین دار ماحول تھا تو اس کی تربیت بھی اسی بیچ پر کی گئی تھی۔ نماز روزے کی پابندی بھی کرانی جاتی تھی۔ اسی ماحول میں محمد علی نے عمر کی چودہ منزلیں طے کی تھیں۔ لڑکپن کے اس دور میں جبکہ ایک بچہ جوانی کی حدود میں داخل ہونے کی طرف گامزن ہوتا ہے اور اس میں دنیا کو زیر و زبر کرنے کی خواہشیں انگڑائیاں لے کر جاگ رہی ہوتی ہیں۔ محمد علی عمر کے اسی تیرے سے گزر رہے

تھے کہ پاکستان کے نام سے دنیا کے نقشے پر ایک نئی ریاست نمودار ہوئی اور ہندوستان کے مسلمان اپنے اس نئے ملک کی طرف جوق در جوق ہجرت کرنے لگے۔ ملک میں ہونے والے اس سیاسی ہنگام سے محمد علی کا گھرانہ بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا اور ہنگام سے کے تھوڑے عرصے بعد ہی محمد علی کے والد اپنے اہل و عیال کے ہمراہ ہجرت کر کے پاکستان آ گئے۔

سندھ کا تاریخی شہر حیدر آباد وہ جگہ تھی جہاں محمد علی کے خاندان نے سکونت اختیار کی لیکن کچھ عرصے یہاں رہنے کے بعد ان کی بھیلی لکھنؤ منتقل ہو گئی تھی جہاں ملت ہائی اسکول میں محمد علی کو ساتویں جماعت میں داخل کرا دیا گیا۔ تاہم اس کی فطری ذہانت کو دیکھتے ہوئے چھوٹے وقتوں میں اساتذہ نے اسے ترقی دے کر نویں جماعت میں بھیج دیا۔ ابھی اس نے ملت ہائی اسکول سے میٹرک پاس کیا ہی

تھا کہ گھر والے دوبارہ حیدر آباد میں آ گئے۔ یہ 1954ء کا زمانہ تھا۔ سندھ کا تاریخی شہر حیدر آباد جو کلہوڑا خاندان کے عہد میں سندھ کا دارالخلافہ تھا اس وقت اپنی آب و ہوا کے حوالے سے بہت مشہور تھا خصوصاً حیدر آباد کی فرحت بخش شاہیں ملک بھر میں بے حد مقبول تھیں۔ اس وقت یہ بات زبان زد عام تھی کہ کراچی کے اکثر رزماء یا سینئر لوگ

حیدر آباد کی شاہوں کا لطف اٹھانے کے لیے اپنا ہر ایک اینڈر حیدر آباد میں گزارنے کے لیے آتے ہیں۔ یہاں کی شاہوں کی ہی وجہ سے اس شہر کے قدیم مکانات اس طرح بنائے جاتے تھے کہ ان میں ہوادان ضرور ہوتا تھا۔ اسی نسبت سے حیدر آباد کو ہوادانوں کا شہر بھی کہا جاتا تھا۔ انہیں..... اب جدید طور پر تعمیر نے حیدر آباد کی یہ شناخت ختم کر دی ہے۔

ان ہی فرحت بخش شاہوں کے شہر میں محمد علی کو جوانی کا دور گزرنے لگا۔ ان کا گھر فروزی سیمیا کی گلی میں تھا۔ حیدر آباد میں محمد علی کا تعلیمی سلسلہ جاری رہا۔ گورنمنٹ کالج حیدر آباد سے انہوں نے بی اے کا امتحان پاس کیا۔ مذکورہ کالج شہر کے قلب میں واقع ہے۔ اس کے ساتھ کالھہ رانیٹ ہے جبکہ دور در کی جانب حیدر آباد کا تاریخی بازار ہے جسے فقیر کا پڑ کہا جاتا ہے۔ محمد علی کی زندگی کے سنہرے دن اسی کالج سے وابستہ ہیں۔ محمد علی پڑھائی کے ساتھ ساتھ غیر تصانیبی سرگرمیوں میں بھی نمایاں تھے خصوصاً ان خطابت میں انہیں کمال حاصل تھا اور اس حوالے سے انہوں نے اپنے کالج کے لیے کئی انعامات جیتے۔

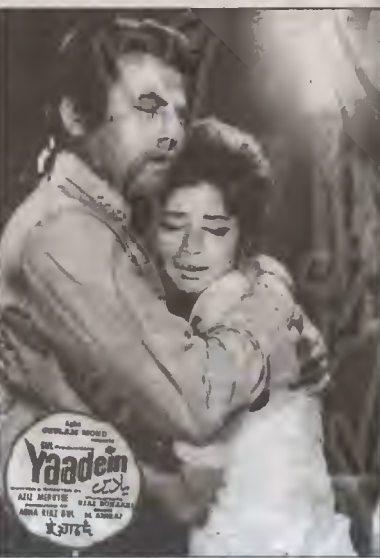
بڑے بھائی ارشد علی ریڈیو پاکستان میں دارم آرٹس تھے۔ اس وقت حیدر آباد ریڈیو اسٹیشن ہوم اسٹیٹ ہال کی تاریخی عمارت میں تھا جو کلہوڑا چاڑی پر واقع ہے۔ آج اس عمارت میں صرت موہانی



محمد علی زبیر، خوشگوار لکھنؤ کی ایک یاد

اس انوکھے تجربے کا مذاق اڑایا۔ ہمارے یہاں کی فلمی صنعت کا ہمیشہ سے چلن رہا ہے کہ جس نے کبھی سے تجربہ بات کرنے کی کوشش کی اس کا مذاق اڑا کر حوصلہ شکنی کی گئی۔ فغلی صاحب کے ساتھ یہی کچھ ہوا مگر وہ ان باتوں پر توجہ دینے کی بجائے اپنے

اور فلم کی موسیقی کا شعبہ کراچی کے ایک گلوکار اور کمپوزر نبیل عبداللہ کے سپرد کیا گیا۔ اس سے موسیقار کا تعلق بھی ریڈیو سے تھا فلم ”شاکر“ کے نام سے شروع کی گئی مگر بعد میں نام بدل کر ”جہان جہان“ کر دیا گیا۔ اس فلم کی ہیر وڈن زیب



تھیں۔ وہ بھی نئی دریافت تھیں۔ محمد علی کوہر دکاندار ملا تھا مگر جب انہیں کہانی بتائی گئی تو انہیں دُن کا کردار زیادہ پادشہ لگا تو انہوں نے فغلی صاحب سے درخواست کرتے ہوئے کہا۔ ”فغلی صاحب! مجھے کون سا کردار نہیں مل سکتا؟“

”کیوں بھی؟ لوگ تو ہیر وڈ کے کردار مانگتے ہیں اور تم ہو کہ ہیر وڈ کو چھوڑ کر دُن بننا چاہتے ہو؟“ فغلی صاحب نے حیرت سے کہا۔

”ہاں مجھے دُن بننا ہے کیونکہ دُن کے کردار میں کرنے کے لیے بہت کچھ ہے۔“ محمد علی نے کہا۔

”سوچ لو بھی بھر بعد میں شکوہ نہیں کرو۔“ یوں محمد علی کو ان کی خواہش پورن کا کردار دے دیا گیا۔ فلم کی شوٹنگ شروع ہوئی تو انڈسٹری میں اس فلم کو لے کر چرچے شروع ہو گئے کہ فغلی تمام نئی کاسٹ خصوصاً ریڈیو کے فنکاروں کو ساتھ لے کر فلم بنا رہا ہے۔ کچھ نے حیرت کا اظہار کیا تو اکثریت نے

موقع ملا۔ بخاری صاحب ریڈیو پاکستان کراچی میں ڈائریکٹر جنرل کے عہدے پر تھے اور ریڈیو کا مستبر تھے۔ ان کی تجربہ شایانہ فنوں نے جو ان کو محمد علی کے اندر چھپے جو ہر کو دیکھتے ہی پہچان لیا تھا۔ وہ جان گئے تھے کہ اس نوجوان میں ایسی صلاحیتیں ہیں جو اسے بہت آگے لے جاسکتی ہیں۔

ان ہی دُنوں فضل احمد کریم فغلی ایک فلم بنارہے تھے۔ فغلی صاحب فلمی صنعت کے دو عظیم ہدایت کاروں حسین فغلی اور سلطان فغلی کے بڑے بھائی تھے۔ وہ سرکاری ملازم تھے اور اب ریٹائرمنٹ کے بعد اپنے دونوں بھائیوں کی طرح انہوں نے فلم دُن سے وابستہ ہونے کا ارادہ کرتے ہوئے ایک فلم ساز ادارہ ”دہستان محدود“ کے نام سے قائم کر لیا تھا اور اسی ادارے کے تحت ایک فلم کا بھی اعلان کر دیا تھا۔ فغلی صاحب اپنی یہ پہلی فلم تمام سنے چروں کو لے کر بنانا چاہتے تھے اور اسی لیے نئی کاسٹ کی تلاش میں تھے اور اسی تلاش میں اُن کی نظریں ریڈیو کے فنکاروں پر پڑیں کہ تمام سنے چروں کو لے کر فلم بنانا بہت حوصلے کا کام ہوتا ہے اور ایسا تجربہ انڈسٹری میں کم کم لوگ ہی کرتے ہیں مگر جنہیں اپنی صلاحیتوں پر بھروسہ ہوتا ہے وہی ایسے چیلنج ہیں اور فغلی صاحب کا شمار انڈسٹری کے ان ہی با حوصلہ فلم سازوں میں ہوتا تھا۔ فغلی صاحب نے ریڈیو کے فنکاروں میں فلمی کچرے تلاش شروع کیے تو زیادہ اے بخاری نے نوجوان محمد علی سے انہیں متعارف کروایا۔ محمد علی کی وجہ شخصیت کو دیکھتے ہی فضل احمد کریم فغلی نے اسے فلم میں ہیر وڈ کے کردار کے لیے منتخب کر لیا۔ تھوڑے ہی دن فلم کی شہ کیا کاسٹ بھی فائنل ہو گئی جو کہ پوری کی پوری سنے چروں پر مشتمل تھی جس میں سے زیادہ تر ریڈیو کے فنکار تھے۔ فلم کی ہدایت کاری فغلی صاحب نے خود سنہالی

لاہوری ہی ہے۔ بڑے بھائی کے نقش قدم پر چلنے ہوئے محمد علی نے بھی 1956ء میں ریڈیو پاکستان سے اپنے کیریئر کا آغاز کیا۔ ریڈیو پر وہ ڈرامے کرنے گئے اور اپنی صداکاری سے بہت جلد سامعین میں مقبول ہو گئے۔ ڈراموں کے علاوہ وہ بچوں کے مختلف پروگرامز بھی کرتے تھے اس وقت محمد علی کو ایک ڈرامے کا معاوضہ دس روپے کی صورت میں ملا تھا۔ اس زمانے میں ریڈیو پر مصطفیٰ قریشی اور دینہ قریشی، قربان جیلانی، بدر باگشی اور حمایت علی شاعر جیسے صداکار کام کرتے تھے۔ ریڈیو پر کام کے دوران انہوں نے حیدر آباد ٹیچر کی ترقی و ترویج کے لیے کئی سخت جدوجہد کی۔ دو دتوں کے مطابق محمد علی ٹیچر کی ہجرتی کے لیے دن رات ایک کرتے تھے۔ اسی طرح ٹیچر کے اداکاروں کی فلاح و بہبود کے لیے بھی بہت وقت کوشاں رہتے تھے۔ اُن کے احباب انہیں ہمارے بھورے یہاں کہتے تھے۔

تھیں گے لیے ان کی کاوشیں جاری تھیں کہ کچھ بڑا ڈکاسٹری حیثیت سے ان کا تاحولہ بہاول پور ریڈیو کر دیا گیا جہاں انہوں نے کچھ عرصہ کام کیا اور پھر ریڈیو پاکستان کراچی آ گئے۔

کراچی آئے محمد علی کے لیے شہر اک ثابت ہوا تھا۔ اگر وہ اس شہر میں نہ آتے تو شاید تمام عمر بڑا ڈکاسٹری حیثیت سے گزار دیتے اور سورا سکرین کو ایسا فنکار نہ بن جاتے جس نے اپنے فن سے ایک عالم کو دیوانہ بنا دیا تھا۔ کراچی ریڈیو پر محمد علی کو ذوالفقار بخاری کا ساتھ ملا جو زیادہ بخاری کے نام سے جانے جاتے تھے۔ کچھ عرصے میں بخاری صاحب سے محمد علی کا تعلق اس بچ پر پہنچ گیا کہ محمد علی انہیں اپنا روحانی باپ کہنے لگے اور زیادہ بخاری کو محمد علی کا Mentor of acting کہا جانا لگے۔ بخاری صاحب کے زیر سایہ محمد علی کو بہت کچھ سیکھنا

منفرد تھی کہ یہ واحد پاکستانی فلم ہے جس کے لیے معروف ہندوستانی گلوکار طاعت محمود نے گیت گائے تھے۔ فلم مکمل ہو کر 9 مارچ 1962ء میں ریلیز کے لیے پیش ہوئی۔ نئی کاسٹ کے ساتھ فلم بنانا حقیقتاً ایک انوکھا تجربہ تھا اور اب اس تجربے کے نتیجے کا وقت آ پہنچا تھا۔ یہ فلم ایم اے جناح روڈ پر واقع نشاط سینما پر نمائش کے لیے پیش ہوئی۔ اس فلم کی ایک خصوصیت یہ بھی رہی کہ اس کا افتتاح بالی پاکستان قائد اعظم محمد علی جناح کی ہمشیرہ محترمہ فاطمہ جناح کے ہاتھوں ہوا۔

9 مارچ کا وہ دن محمد علی سمیت ان تمام نئے فن کاروں کے لیے بہت اہم تھا۔ ان سب کو خاص طور پر فضل صاحب کو اپنی پہلی کاوش کے نتیجے کا انتظار شدت سے تھا کہ آیا فلم بین ان کی کاوش کو کس نظر سے دیکھتے ہیں؟ نوجوان محمد علی کے دل کی حالت بھی اچھل پھل ہو رہی تھی اس نے فلم میں انتہائی اہم کردار ادا کیا تھا اور اپنی تمام تر صلاحیتوں کو بروئے کار لایا تھا۔ ریڈیو کے حوالے سے تو اس کا ایک نام تھا مگر سلور اسکرین کی کامیابی سے اس کے کیریئر کو ایک راہ مل جاتی۔ فلم کار پریمر شوخم ہوا تو ہر کوئی فلم کی تعریف کر رہا تھا خصوصاً ہیرو سے زیادہ محمد علی کے کام کو سراہا جا رہا تھا۔ یہ دیکھ کر نہ صرف نوجوان محمد علی کو خاصہ حوصلہ ملا تھا بلکہ ہدایت کار سمیت پوری ٹیم خوش سے سرشار تھی۔ محمد علی کے لیے وہ دن بہت عجیب تھا جب وہ پریمر شوخم میں شرکت کرنے آئے تھے تو ایک گناہم نوجوان تھے مگر جب وہ سینما سے نکل رہے تھے تو دیکھنے والا بے اختیار پکار اٹتا تھا۔ ”وہ دیکھو.....“ دن جا رہا ہے۔“ محمد علی نے دن کے کردار میں اپنی کردار نگاری کے کچھ ایسے رنگ بھرے تھے کہ اس کے آگے ہیرو مانع پڑ گیا تھا۔ ہیرو کا کردار عارف نامی ایک نوجوان نے کیا تھا مگر وہ محمد علی کے

سامنے دب کر رہ گیا تھا اور پھر وہ بھی فلم اسکرین پر دوبارہ نظر نہیں آیا۔ اس امر سے اندازہ ہوتا ہے کہ نوجوان محمد علی کو کردار کو پہچاننے کی کیسی غضب کی شدید تھی حالانکہ یہ ان کی پہلی فلم تھی مگر اس نے شخص اسکرپٹ پڑھ کر اندازہ لگا لیا کہ کس کردار میں زیادہ مارجن ہے اور پھر اپنے اس فیصلے کو درست بھی ثابت کر دکھایا۔ ”چراغ جلتا رہا“ کامیاب فلم ثابت ہوئی۔ اس فلم نے کراچی میں سلور جوبلی سنائی مگر انڈسٹری کی اندرونی روایتی چچکس کے باعث ملک کے دوسرے حصوں میں اس کی ریلیز نہ ہو سکی۔ اس فلم کی ایک اور خصوصیت اس حوالے سے بھی رہی کہ فلم جب سنسر کے لیے اسلام آباد گئی تو یہ فلم خصوصی طور پر اس وقت کے صدر جنرل ایوب خان نے دیکھی تھی۔ انہیں بھی یہ فلم پسند آئی تھی۔

”چراغ جلتا رہا“ کے بعد محمد علی نے تین فلمیں کیں جن میں ہدایت کار منور رشید کی فلم ”بہادر“ ہدایت کار اقبال یوسف کی ”دال میں کالا“ اور ہدایت کار جاوید ہاشمی کی ”دل نے تجھے مان لیا“ شامل تھیں۔ ان تینوں فلموں میں محمد علی دن کے روپ میں ہی نظر آئے۔

سال 1963ء محمد علی کی زندگی میں ایک اور موڑ لے کر آیا۔ اس برس بطور ہیرو ان کی پہلی فلم ”شرارت“ ریلیز ہوئی۔ فردوس بیگم ان کے روبرو ہیروئن کے روپ میں تھیں۔ اس فلم نے بھی اچھا پرنس کیا۔ نوجوان محمد علی نے اب تک جتنی فلمیں کی تھیں وہ سب کی سب کراچی کی تھیں۔ فلموں کا اصل گڑھ یعنی لاہور کے اسٹوڈیوز میں انہوں نے قدم نہیں رکھا تھا مگر اس کے لیے محمد علی کو زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا۔ اگلے برس یعنی 1964ء میں فلم ”خاندان“ میں انہیں بطور ہیرو کاسٹ کیا گیا۔ لاہور کی فلم نگری میں قدم رکھا تو انہوں نے کراچی کو مستقل

خیر باد کہہ دیا اور لاہور میں ایک فلیٹ خرید کر کے رہائش اختیار کر لی۔ 1964ء میں ہی ان کی ایک اور فلم ”خاموش رہو“ ریلیز ہوئی۔ یہ فلم ان کے کیریئر کے لیے بڑی بریک تھرو ثابت ہوئی۔ ”خاموش رہو“ میں ان کی اداکاری کو ناقدین اور عوام الناس نے بے حد سراہا اور وہ فلمی حلقوں میں موضوع گفتگو بن گئے اور انہیں کے بعد دیگرے فلمیں ملنے لگیں، تاہم محمد علی کو کسی ایسی فلم کی تلاش تھی جو راتوں رات شہرت کی بلندیوں پر پہنچا دے۔

خوش قسمتی سے جلد ہی ان کے کیریئر میں وہ فلم آگئی۔ ہمایوں مرزا کی زیر ہدایت فلم ”آگ“ کا



ایک ایوارڈ تقریب میں محمد علی اور زیبا

نو جوانوں میں بے حد مقبول تھا مگر محمد علی کا اپنا الگ چارم تھا، ان کا اپنا ایک جداگانہ انداز تھا جو انہیں دوسرے ہیروز سے ممتاز کرتا تھا۔ ان ہی دنوں محمد علی فلیٹ سے اپنے ذاتی بنگلے میں منتقل ہو گئے تھے جو انہوں نے گلبرگ، لاہور میں بنوایا تھا۔ ”آگ“ کا دریا کے بعد محمد علی، شمیم آرا کی ایک اور خوبصورت فلم ”صاعقہ“ ریلیز ہوئی۔ اس فلم نے بھی پورے پاکستان میں کامیابی کے جھنڈے گاڑ دیے۔ یہ

جوڑی اس قدر مقبول ہوئی کہ حقیقی زندگی میں بھی دونوں ایک دوسرے کے قریب آ گئے۔ اس وقت اس قسم کی افواہیں گردش کرنے لگیں کہ محمد علی، شمیم آرا

کی منگنی ہو گئی ہے، تاہم اس منگنی کی دونوں نے نہ تو تردید کی اور نہ ہی تصدیق جس سے اس افواہ کی صداقت پر یقین ہونے لگا۔ اب ان کی منگنی ہوئی تھی یا نہیں مگر اس بات میں دورانے نہیں تھیں کہ ان کے درمیان کچھ نہ کچھ ضرور تھا جس کی پردہ داری تھی مگر پھر اچانک جانے کیا ہوا کہ اس بے نام تعلق میں دراڑ پڑ گئی اور دونوں ایک دوسرے سے دور ہوتے چلے گئے۔ شمیم آرا کے بعد محمد علی کا تعلق ایرانی اداکارہ شہ بارہ سے جڑ گیا، یوں فلمی صحافیوں کے ہاتھ ایک اور کہانی آ گئی مگر اس کہانی کا انجام بھی اس وقت ہو گیا جب محمد علی ایران گئے تو ان پر کھلا کہ مذکورہ اداکارہ پہلے سے شادی شدہ ہے۔ اس انکشاف کے بعد یہ

اعلان ہوا تو کاسٹ میں ہیر و ہیر و دن کے طور پر محمد علی اور شمیم آرا تھے۔ یہ فلم 1966ء میں ریلیز ہوئی اور اس نے ملک بھر میں دھوم مچا دی۔ اس فلم سے محمد علی کو سپر اسٹار اسٹیٹس حاصل ہوا۔ ”آگ کا دریا“ ہی کی کامیابی کے باعث محمد علی اور شمیم آرا کی جوڑی بھی مقبولیت کی بلندیوں کو چھونے لگی۔ 60ء کے عشرے میں یہ جوڑی فلم بینوں کی پسندیدہ ترین فلمی جوڑیوں میں سے ایک تھی۔ اس فلم کی نقید المثل کامیابی سے محمد علی کی زندگی کا رخ یکسر بدل گیا تھا۔ اب ان کا نام فلموں کی کامیابی کی ضمانت سمجھا جاتا تھا اور ہر فلم سازی ہدایت کار اپنی فلم میں انہیں کاسٹ کرنا چاہتا تھا حالانکہ یہ وہ زمانہ تھا جب وحید مراد جیسا چاکلیٹی ہیرو

انہیں بھی دم توڑ گیا۔

یہ ان دنوں کا ذکر ہے جب ہدایت کار قبال یوسف اپنی فلم ”تم ملے پاملا“ کی عکس بندی کے لیے اپنے یونٹ کو کراچی گئے تھے اور دوزدب فلم کی شوٹنگ حیزی سے جاری تھی۔ اس فلم کے بہرہ ور محمد علی اور جی تھے۔ ان دونوں نے اپنے قلمی سفر کا آغاز ”چراغ جگمگا رہا“ سے کیا تھا۔ ”ہم زبیا“ محمد علی کی ہیروئن تھیں جن میں اور دونوں ایک دوسرے سے دور دور پر تھے مگر اس فلم کی شوٹنگ کے دوران دونوں ایک دوسرے کے نزدیک ہوتے چلے گئے اور کیو پڈ کا تیرا پیا چلا کر بہت قربت پہلے محبت میں بدل اور پھر شادی کے سینس برسن میں ڈھل گئی۔

محمد علی نے زبیا کی کوئی اولاد نہیں ہوئی تاہم محمد علی نے شہینہ کو بھل گئی تھی کی طرح محبت دی۔ وہ اسے اتنا چاہتے تھے کہ اسے شہینہ کیلئے کہتے تھے۔ محمد علی کا قلمی سفر حیزی سے شروع کی جانب گامزن تھا۔ ان کی ہر قلمی فلم بڑی برسی کر رہی تھی۔ تھوڑے ہی عرصے میں محمد علی جو جوانوں کا craze بن گئے تھے۔ مراد شاہ جہاٹ سے ملا بال ان کی شخصیت اس پہن گھرنے سے بھر پور دلکش آواز چارچاند لگا دیتی تھی۔ وہ کردار کو حقیقی رنگوں سے سجا دیتے تھے۔ ان کی خاص خوبی یہ تھی کہ وہ لمبے چہرے کے تاثرات بدلنے میں نکال رکھتے تھے۔ اس پر جذباتی مکالموں کی ایسی ادائیگی کہ قلم بینوں کی آنکھوں سے واقعتاً آنسو نکل پڑتے تھے۔ نقادوں نے انہیں شہنشاہ جذبات کے خطاب سے نوازا تھا۔ ان کی شخصیت کو نظر رکھتے ہوئے قلم سازوں نے کردار گھوٹانے شروع کر دیئے تھے خاص طور پر ایسے کردار جن میں ہیرو کو ایک وقت تو جوان سے لے کر بوڑھے کا کردار کرنا ہوتا تھا۔ ایسے کرداروں کے لیے محمد علی موزوں ترین ہیرو تھے۔ وہ حقیقی معنوں میں درسائیل فنکار تھے۔ انہوں نے کھلڈرے ہیرو کے کردار جتنی آسانی سے کیے اتنی ہی آسانی سے تاریخی کردار کو بھی ادا کیے۔ اگر یہ کہا جائے کہ تاریخی نوعیت کی فلموں میں تاریخی کرداروں کے لیے ان سے بہتر انتخاب کوئی نہ تھا تو بے جا نہ ہوگا۔ جج نواب ڈاکو شہنشاہ تاریخی کردار اور راجستھانی افراد کے کردار ادا کرنے کے لیے وہ انڈیز فنکار تھے۔

محمد علی ہمیشہ فن کار تو سب کے سامنے مچا کرتے لیکن یہ بات شاید کم لوگ جانتے ہوں کہ ان میں وطن کی محبت کو کٹ کر بھری ہوئی تھی۔ 1971ء کی جنگ کے بعد بھارت کی قید سے رہائی نہ ملنے والے ہمارے نوجوان جہاٹ جب پاکستان آئے تو محمد علی ان کا

استقبال کرنے والوں میں پیش پیش تھے۔ 71ء کی جنگ کے فوری بعد ہونے والے ماسکو کے قلمی سیلے میں محمد علی نے سیاہ لباس زیب تن کیا تھا جو ان کی طرف سے بھارتیوں کے خلاف احتجاج تھا۔ اپنے عروج کے دنوں میں ذوالفقار علی بھٹو نے ان کے خصوصی مراسم تھے۔ بھٹو کے دور حکومت میں اسلامی سربراہ کانفرنس کا انعقاد لاہور میں ہوا تو سعودی عرب کے فرمانروا شاہ فیصل نے محمد علی کے کمر



پر ہی قیام کیا تھا۔ ذوالفقار علی بھٹو سے دوستی کا فراج محمد علی کو اس وقت دینا پڑا جب سیاہ دور حکومت میں انہیں پانچ ماہ کی جیل ہوئی۔ اس سے پہلے 1976ء میں ایک جیلے میں پاکستان پیپلز پارٹی کی حکومت کی حمایت کرنے پر کراچی میں ان کی فلموں کا بائیکاٹ بھی ہو چکا تھا جو اس ماہ تک جاری رہا تھا۔ محمد علی پانچ ماہ کی قید کا قصہ بھی دلچسپ ہے۔ 1981ء کا ذکر ہے سیاہ افق نے لاہور کی تقریباً تمام قابل ذکر شخصیات کو جیل میں قید کر دیا تھا۔ ان میں حمید اختر، شعیب ہاشمی، حبیب جالب، محمد علی قصوری، منظر علی خان، عبداللہ ملک، رضا کاظم اداکار حبیب راؤ رشید

ان قیدیوں نے دلی بال کی ٹیم بنائی تھی۔ ایک ٹیم کے کپتان حمید اختر اور نائب کپتان محمد علی تھے۔ اس ٹیم میں حبیب جالب سمیت دیگر افراد بھی تھے جبکہ دوسری ٹیم میں ایک وکیل اداکار حبیب اور کچھ دوسرے لوگ تھے۔ دونوں ٹیموں کے درمیان اکثر مقابلے ہوتے رہتے تھے اور اکثر ایسا ہوتا کہ محمد علی حبیب جالب غمے سے انہیں ٹیم سے نکالنے کا مطالبہ کرتے۔ ایک بار دونوں ٹیموں کے مقابلے میں میاں محمود قصوری نے ٹرائی دینے کا اعلان کیا۔ محمد علی کی غلط دوس کی وجہ سے ان کی ٹیم ہار گئی اور رائی

زبیا کی یہ تیسری شادی محمد علی سے پہلے وہ اداکار سدر اور عبداللہ صاکی کی تھی۔ چوتھی رہ چکی تھیں۔ عبداللہ صاکی زبیا کی ایک بیٹی شہینہ کی جیکہ محمد

دوسری ٹیم نے جیت لی۔ حبیب جالب اس بار پر اتنے شدید غصے میں تھے کہ انہوں نے رات کا کھانا بھی نہیں کھایا تھا لیکن اس قسم کی لڑائیوں اور ناہنجاریوں کے باوجود محمد علی اور حبیب جالب میں دوٹی اور جدوجہد کا ٹھوس رشتہ تھا۔ صبح ناٹھتے سے فارغ ہو کر دو بجتے تاش کے کمرے میں جا کر باہر بازی پر سرگرمی کی ڈبی لگ جاتی۔ ایک بار تاش کھیتے ہوئے حبیب جالب نے بازی میں دوڑیں جیتیں اور دونوں اگلی بازی میں لگا دیں۔ وہ باہر بھی حبیب جالب جیت گئے تو چاروں ڈبیاں بازی میں لگا دیں۔ یہ بازی بھی جالب صاحب کے نام ہی اور وہ آٹھ ڈبوں کے مختار بن گئے۔ پاس بیٹھے میزبان نے انہیں سمجھایا کہ بس اب بازی آج سگرمت کی یہ ڈبیاں آٹھ دنوں کے لیے کافی ہیں مگر حبیب صاحب نہیں مانے اور اگلی بازی میں یہ آٹھوں ڈبیاں لگا دیں مگر یہ بازی محمد علی جیت گئے۔ اکثر یوں ہوتا کہ محمد علی کو جب یہ چل کر حبیب صاحب کے پاس سگرمت ختم ہو گئے ہیں تو وہ جان بوجھ کر بار جاتے اور یوں حبیب جالب کی سگریٹوں کا مسئلہ حل ہو جاتا تھا۔ جیل میں محمد علی کا کھانا کمرے آتا تھا جسے وہ جیل کے دوستوں کے ساتھ لے کر کھاتے تھے۔ ان کے مداح اکثر شطرنج اور پھلوں کے ڈوکر سے بھجواتے تھے جنہیں وہ تھیلوں میں باندھ دیتے تھے۔

محمد علی جیتنے بڑے ذکاوت سے اس سے کہیں زیادہ بڑے انسان تھے۔ ان کے سینے میں ایسا ہیرومان دل دھڑکتا تھا جو ہر وقت ہر ایک کی پریشانی اور تکلیف دور کرنے کو چاہتا تھا۔ ان کی زندگی ایسے واقعات سے بھری پڑی ہے کہ جب انہوں نے مشکل کے وقت میں اپنے دوستوں اور ساتھیوں کے ذکاوت کی اور ایسے لوگوں کی بھی مدد کی جن کا نام نہ کوئی تعلق نہیں ہوتا تھا شطرنج یا ریش شاد کی فلم ”یاسن“ سن کر کے

مسائل میں پھنسی تو یہ محمد علی تھے جنہوں نے بھاگ دوڑ کر کے ریش شاد کی فلم کو سن کر کے معاملات سے آزاد کر لیا اور یوں فلم کی ریلیز ممکن ہو سکی۔ اسی طرح جب اداکار فریدون حومت کی چاہنے سے واجب نے ہی اس کڑے وقت میں اپنی ساتھی اداکارہ کی مدد کی تھی۔ انہوں نے گوہر علی کی فلم ”ناگ میری بھرد“ میں بغیر معاوضے کے کام کیا تھا کیونکہ گوہر علی مالی پریشانیوں میں گھرے ہوئے تھے۔

1977ء میں جبکہ محمد علی اپنے عروج کو انجوائے کر رہے تھے کہ اچانک وہ بیمار پڑ گئے۔ انہیں گردے کا عارضہ لاحق ہو گیا تھا۔ تین سال تک وہ اس بیماری سے لڑتے رہے پھر 1980ء میں ڈاکٹروں نے آپریشن کے ذریعے ایک گردہ نکال دیا۔ جب وہ اس بیماری سے تسخیر تو انہیں شوگر کا مرض لاحق ہو گیا۔ شہرت نے محمد علی کا چہرہ کھینچ لیا تھا۔ دوسرے دن بھی ان کا دور یہ آسکار سے بھر پور ہوتا تھا۔ 1969ء میں جبکہ وہ اپنے کیریئر کی بلندی پر تھے اس وقت انہوں نے ریڈیو پاکستان لاہور سے نشر ہونے والے ایک گفتے کے ذریعہ ”چاند نہیں لگا“ میں کام کیا تھا۔ یہ ان کی ریڈیو سے بحث کا منہ بولا جوت تھا۔ محمد علی نے دو فلمیں بھی پروڈیوس کیں جن میں ”آگ“ اور ”جیسے جانتے نہیں“ شامل ہیں یہ دونوں فلمیں باکس آفس پر کامیاب رہی تھیں۔

محمد علی کا احترام ملک میں ہی نہیں ملک سے باہر بھی کیا جاتا تھا۔ جب وہ ہندوستان گئے تو وہاں کی پارلیمنٹ کے ایک رکن یونس احمد نے انہیں شال تحفے میں دی تھی۔ اسی طرح ایک بار جب وہ بنگلہ دیش میں ایک فلم کی شوٹنگ میں مصروف تھے اس وقت کے بنگلہ دیشی صدر جہاں رشا احمد نے انہیں قرآن مجید اور تختہ دیا تھا۔ انہیں ہندوستان میں

”نوشاد اپارو“ سے بھی نوازا گیا تھا۔

محمد علی نے اپنے کیریئر میں تقریباً پچاس ہزاروں کے ساتھ کام کیا ہے جو خود اپنی جگہ ایک انفرادیت ہے۔ ان کی جوڑی سب سے زیادہ زینا تیکم کے ساتھ پسند کی گئی۔ زینا اور محمد علی نے ایک ساتھ کل 70 فلموں میں کام کیا جن میں 59 فلمیں ایسی ہیں جن میں وہ ہیر و ہیروں کی حیثیت سے بروہ تیسرے چلوں میں گھرے ہوئے۔ ان میں ایک بھارتی فلم ”کلرک“ بھی شامل ہے۔ یہ جوڑی پاکستان فلم انڈسٹری کی سب سے قابل احترام جوڑی بھی جانی جاتی تھی اور علی زیب کے نام سے مشہور تھی۔ اس جوڑی کی کامیاب فلموں میں ”تم نے ہمارا ملا انسان اور آدمی انصاف اور قانون انسانہ زندگی کا دامن اور جنگاری پھول میرے گلشن کا“ جب پھول گلے تو کرمیت زندگی میں شمع“ عورت ایک نیکی“ بیسی فلمیں شامل ہیں۔ اسی جوڑی کی بطور ہیر و ہیروں کی فلم ”ہیڈ کاسٹیل“ بھی 1964ء کی ریلیز تھی۔

سنہ کے ساتھ محمد علی چالیس فلموں میں نظر آئے جن میں سے 32 فلموں میں یہ دونوں ہیر و ہیروں تھے۔ محمد علی کی شہنشاہی پہلی فلم ”سرسرا“ (1969ء) بھی اور آخری فلم 1987ء میں ریلیز ہوئے والی ”تیری باہنوں میں“ تھی۔ اس جوڑی کی بڑی فلموں میں ”دوریاں“ اور ”اس پاس“ شامل ہیں جبکہ ”باورانی“ اچھے مابا آئینہ اور صورت انتخاب“ اور ”نصیب“ اس جوڑی کی قابل ذکر فلمیں ہیں۔

دیا اور محمد علی ”چراغ جلتا رہا“ میں حعارف ہوئے جس میں دونوں کے سائیز رول تھے۔ بطور ہیر و ہیروں اس جوڑی کی پہلی فلم ”دل کے گلے“ تھی اور آخری فلم ”کمرے کے قائل“ رہی۔ دونوں 20 فلموں میں اکٹھے نظر آئے جن میں سے 19 فلموں میں مرکزی کردار کیے۔ دیا محمد علی کی فلم ”آئینہ“

ہے جبکہ اس جوڑی کی قابل ذکر فلموں میں ”دل کے گلے“ حقیقت مشکوہ“ اور ”میر“ شامل ہیں۔

رانی اور محمد علی 33 فلموں میں جلوہ گر ہوئے جن میں سے 13 فلموں میں بطور ہیر و ہیروں نظر آئے۔ اس جوڑی کی پہلی فلم ”سفید خان“ اور آخری فلم ”خون اور پانی“ تھی اور قابل ذکر فلموں میں ”بیتیم ہزار ملاستان کا“ سیتامیرا ہرگز بے بنام شامل ہیں۔

محمد علی اور محمد آراء کی جوڑی 60ء کے عشرے کی مقبول ترین جوڑی تھی۔ اس جوڑی کی کامیاب ترین فلم ”آگ کا دریا“ ہے یہیں وہ فلم سے جو محمد علی کی کیریئر کا نقطہ آغاز ثابت ہوئی۔ اس جوڑی کی ایک سربز پھٹ فلم ”ساعت“ تھی۔ ”دستی“ بھی اس جوڑی کی بڑی فلموں میں سے ایک ہے۔ اس جوڑی نے کل دس فلمیں کیں جن میں سے 9 میں مرکزی کردار ادا کیے۔ اس جوڑی کی آخری فلم ”خاک اور خون“ تھی۔

گیتیا کے ساتھ محمد علی 18 فلموں میں نظر آئے جن میں سے آٹھ میں وہ گیتیا کے ہیر و ہیرے۔ اس جوڑی کی پہلی فلم ”انصاف اور قانون“ تھی اور بطور ہیر و ہیروں پہلی فلم ”تیرے میرے سینے“ ہے۔ ”عورت ایک نیکی“ میں میرا بیٹا نام“ اور ”جانتے نہیں“ دونوں کی اس جوڑی کی سپر ہٹ فلمیں ہیں۔ ممتاز اور محمد علی پہلی بار ”تم سلاطین رنو“ میں ایک ساتھ دکھائی دئے تاہم ہیر و ہیروں کی حیثیت سے اس جوڑی کی پہلی فلم ”عورت اور سیرت“ ہے۔ اس جوڑی کی کامیاب ترین فلم ”منزل“ ہے جبکہ قابل سائنس فلموں میں ”آن آتا سنگرام“ اور ”ذریعہ بات“ شامل ہیں۔

فریدون اور محمد علیوں نے ”غدار“ نامی فلم میں پہلی بار نظر آئے تاہم ”ناگے“ ناگے جن میں ”بطور ہیر و ہیر و اس جوڑی کی پہلی فلم تھی۔ اس جوڑی نے کل

12 فلمیں کیں اور 7 فلموں میں مرکزی کرداروں میں نظر آئے۔ اس جڑی کی کامیاب فلمیں ”جاگ اٹھا انسان“ اور ”سردی کو دھس“ ہیں۔

بابر شریف کے ساتھ محمد علی نے یوں تو 33 فلمیں کی ہیں مگر ان میں صرف دو فلمیں ایسی ہیں جن میں یہ دونوں ہیڈ ہیروئن کے روپ میں نظر آئے۔

بابر کے چھوٹے بھائی کے جیڈ سے محمد علی کے ساتھ سوئٹ نہیں کرتی تھیں۔ فلم ”ملاحین“ میں بابر نے محمد علی کی بیٹی اور اوسا کی کردار بہت خوبصورتی سے نبھایا ہے۔

محمد علی نے کل 277 فلموں میں کام کیا جن میں 248 اردو 17 پنجابی 9 پشتو 2 ڈبل ڈورن ایک ہندی اور ایک بنگالی فلم ہے جبکہ ایک دستاویزی فلم میں ان کی خوبصورت آواز کو شامل کیا گیا ہے۔

محمد علی نے ایک خاص انداز سے زندگی گزار دی۔ علی زیب کو فلمی دنیا کی شاہانہ جڑی کہا جاتا تھا۔ محمد علی کا رہن اور نصیب و برصاقت کی شہینشاہ سے کم نہیں تھا۔ لاہور میں محمد علی کی کوٹھی ایسی پر سائیں تھی کہ کسی بادشاہ کا کاشی کی تھی۔ ان کا انداز زندگی بھی شاہانہ تھا۔ ان کے بارے میں مشہور تھا کہ جب وہ ملک سے باہر جاتے تھے تو اعلیٰ ترین ہوٹلر کے اعلیٰ کمرہ میں رہائش اختیار کرتے تھے حتیٰ کہ امریکہ میں بھی پانچ ستارہ ہیٹ سٹار ہوٹل کے ڈیسکس کمرے ان کا انتخاب ہوتے تھے۔

یوں تو محمد علی نے 277 فلموں میں کام کیا لیکن انہیں ایک فلم میں کام کرنے کا چھپتا دہیشہ رباوردہ فلم منوج کار کی ہندوستانی فلم ”طرک“ تھی محمد علی انکے تھے کہ ”طرک“ میں کام کرنا ان کے کیریئر کی سب سے بڑی غلطی ہے۔ دراصل ”طرک“ کے معاملے میں ان کے ساتھ دھوکا ہوا تھا۔ جب وہ ہندوستان گئے تھے تو منوج کار جو ان کے دوستوں

محمد علی کے کیریئر سے بہت سے منفرد اعزازات جڑے ہوئے ہیں۔ انہیں پاکستانی فلموں کا ایس جی ڈی ایسٹار کا خطاب ملا۔ دہلی میں انہیں پاکستان کے بڑے فن کار کے ایوارڈ سے نوازا گیا۔ وہ پاکستان کے علاوہ برطانیہ امریکہ کویت ترکی سعودی عرب چین اور ہندوستان میں بھی یکساں طور پر مقبول فن کار تھے۔ وہ پاکستان کے واحد اداکار ہیں جنہیں تینہ امتیاز سے نوازا گیا۔ چار مارچ 2015ء کو امریکی نشریاتی ادارے سی این این نے ایک سروے کے تحت ایشیا کے 25 بہترین اداکاروں کی فہرست بنائی تو محمد علی بھی اس میں شامل

اپنے پرانے گھر اور پرانے واقف کاروں سے ملا چائے پائیں اسی خیال کے تحت ڈرامیٹر کو ساتھ لیا اور حیدر آباد کے لیے نکل کھڑے ہوئے۔ ان کی گاڑی جب حیدر آباد شہر کی حدود میں داخل ہوئی تو جیتے نکھوں کی تمام یادیں جیتے جاتے منظر کی صورت ان کی نگاہوں کے سامنے آ گئیں۔ مٹی کا گج میں طالب علمی کے دور کا نو جوان ہوم اسٹیٹ ہال میں واقع سامنے آ گیا۔ منظر بدل تو ہوم اسٹیٹ ہال میں واقع ریڈیو پاکستان کا مینیکر ڈون کان میں سرگوشیاں کرنے لگی اور ریڈیو کے پرانے دوست اور ساتھیوں کے چہرے نگاہوں کے سامنے گھومنے لگے۔ ٹھنڈی



تھے۔ ان کے علاوہ ایم اور حیدر اوسا بھی اس فہرست کا حصہ تھے۔ دس نگار ایوارڈز اور تینہ حسن کارکردگی بھی ان کے فن کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ یہ تینہ 1984ء میں اسی ضیاء الحق نے انہیں عطا کیا تھا جس نے پہلے پارٹی کی حمایت کرنے پر انہیں جیل میں بند کر دیا تھا۔ وہ پاکستان کے واحد فن کار تھے جن کی ذات کو مد نظر رکھ کر افسانہ لکھا گیا۔ اس افسانے کا عنوان ”محمد علی کا ڈرامیٹر“ تھا۔ اس کے مصنف ناصر رضا تھے۔ انہوں نے یہ افسانہ کرشن چندر کے افسانہ ”دلیپ لکھنا تانی“ سے متاثر ہو کر لکھا تھا۔

یہ زندگی کے آخری ایام کا قصہ ہے۔ ایک روز اچانک ان کے دل میں خیال آیا کہ حیدر آباد جا کر

مرکب آؤں کوئٹہ رانی باغ کا قیصر اور بھی جانے کیا کچھان کی نگاہوں میں گھومنے لگا۔ وہ اسی کی اسی سنہری یادوں میں گم تھے کہ گاڑی ایک جھٹکے سے رکی محمد علی نے چونک کر نظر پر اٹھائیں گاڑی عین اس گلی کے سامنے ٹھکری تھی جہاں ان کا پرانا گھر تھا۔ انہوں نے گردن تھا کر سرنگ کے اس پر نظر ڈالی تو یہ دیکھ کر دل دکھ سے بھر گیا کہ جس جگہ فردوس سنبھا ہوا کرتا تھا اب وہاں پیڑوں لپ پپ و جود میں آ چکا تھا۔ یہ ایک فلم انڈسٹری کے عروج و زوال کی پوری کہانی بیان کر گیا اور ان کی آنکھیں جھپک گئیں۔ ڈرامیٹر گاڑی کو گلی کے اندر لے جانا چاہتا تھا مگر محمد علی نے اسے روک دیا اور گاڑی سے اتر کر



داعش اور پھر سے سب روشنی نشان

گل جید کا خیال
قلعہ جس حد سے بڑی ہیں کئی پھوٹے گی کرن؟
اب مقدمہ میری دھرتی کا سنور جائے گا

آسکر اوارڈ یافتہ پہلی پاکستانی شرمین عبید چٹانے کے کیرئیر کی حقیقی کہانی

”سیوینگ فیس“ صرف تیزاب سے جلانے گئے عورت کے چہرے کی تصویر نہیں ہے ان ظالم اور بے رحم مردوں کے خلاف کی جانے والی جدوجہد کا نام بھی ہے جو زندگی خلیصہ روٹی اور روشنی کے دشمن ہیں۔ شرمین عبید چٹانے کی اس دستاویزی فلم نے



مارچ 2006ء کو اختتام پذیر ہوئی۔

وہ اقرار کا دن تھا۔ محمد علی جگ کیراہہ بچے ہاتھ دہم جانے کے لیے ہسپتال سے اٹھے مگر انہی چند قدم ہی اٹھانے تھے کہ لڑکھڑا کر بیندرم کے فرش پر پڑی کر پڑے۔ آواز سن کر لڑکھڑا کر دوڑی دوڑی آئیں اور محمد علی کو فرش پر گرا ہوا دیکھ کر اپنے ملازم عباس کو آواز دے کر نکارا۔ ملازم اور دریاہائے سہارا دے کر انہیں کرسی پر بٹھایا مگر ان کی حالت انتہائی تشویش ناک تھی فوراً ڈاکٹر کو بلوایا گیا مگر

زندگی کا سفر مکمل ہو چکا تھا۔ تقریباً دن ڈیڑھ بچے محمد علی نے کلرے شہادت پر دعا اور ان کی گردن ایک طرف ڈھلک گئی اور روح اپنے خالق حقیقی سے جا ملی۔ اُس وقت بیٹی شمینہ امریکہ میں تھی۔ باپ کی وفات کی خبر سن کر وہ دوڑی چلی آئی

اور اس کی آمد کے بعد محمد علی کا جنازہ آہوں و سسکیوں کے ساتھ اٹھایا گیا۔ نماز جنازہ 21 مارچ بروز منگل کو بعد نماز ظہر گلبرگ کے سامنے واقع میدان میں ادا کی گئی اور پھر ان کا جسد خاکی لاہور میں حضرت میاں میر صاحب کے مزار کی چوکھٹ پر سپرد خاک کر دیا گیا۔

محمد علی نے 75 برس دنیا کے اسٹیج پر اپنا کردار بخوبی ادا کر کے اپنے مختلط اپنے کام کی صورت ثبوت کر کے اس فانی دنیا کو چھوڑ گئے اور اپنے لاکھوں پرستاروں کو سوکار کر گئے۔

☆☆☆

پہل گلی میں داخل ہو گئے۔ انہیں دیکھ کر گلی میں شور مچ گیا۔

”ارے..... تو محمد علی ہیں۔“

”دیکھو محمد علی آئے ہیں۔“

گلی میں موجود لوگ قریب آ کر مصافحہ کرنے لگے اور وہ رواجی مسکراہٹ کے ساتھ سب سے ملنے ملائے اپنی آبا کے گھر کے دروازے پر پہنچ گئے۔ یہ آبا حیدر آباد کے معروف صحافی مسعود جاوید کی والدہ تھیں اور اسی گلی

میں برسوں سے رہتی تھیں۔ محمد علی انہیں آپا کہا کرتے تھے وہ بھی شورش کر گھر کے دروازے پر آ کھڑی ہوئی تھیں۔ محمد علی نے انہیں سلام کیا تو آپا نے سلام کا جواب دیتے ہوئے بے اختیار پوچھا۔

”بہنو نہیں لائے؟“

اس بے تکلفانہ سوال سے ہی اعزازہ کیا جاسکتا ہے کہ ان کا محمد علی سے کیا تعلق تھا۔

”آپا! جلدی میں آیا ہوں اب آؤں گا تو آپ کی بہنو کو ضرور لاؤں گا۔“ محمد علی نے مسکراتے ہوئے

جواب دیا تھا مگر انہیں دوبارہ حیدر آباد آنا نصیب نہیں ہوا تھا۔

گھر والوں کا منہ دو ستوں کے لیے بھورے سیانہ ساچی اداکاروں کا علی بھائی اور قلمی صحافیوں و نقادوں کے اس شہنشاہ و جذباتی کی بھرپور زندگی 19



زیبا محمد علی فلم ”انصاف اور قانون“ کے ایک منظر میں

جو ایک گورت ہونے کے باوجود انہیں دستاویزی فلم سے وابستہ ہے شمار مردوں سے ممتاز کرتی ہے۔ 2010ء میں شرمین کو ان کی ایک نہایت ہی خوبصورت، ماحیقی دستاویزی فلم ”چلڈرن آف دی پاکستان“ پر انٹرنیشنل ایچی ایوارڈ دیا گیا تھا۔

شرمین عبید چٹائے نے زندگی کی زمین پر اپنا پہلا قدم شکر کچی میں پیدا ہونے کی صورت 1978ء میں رکھا۔ ابتدائی تعلیم کے بعد اعلیٰ تعلیم کی صورت Smith College امریکہ سے انکاس میں بیچلری ڈگری پھر امریکی یونیورسٹی اسٹین فورڈ سے انٹرنیشنل ایسی اسٹڈیز کے علاوہ کیونٹی کینن میں ماسٹرز کیا لیکن حیرت کی بات یہ ہے کہ صحافت اور سیاسیات کا علم حاصل کرنے والی شرمین نے فلم میکنگ کے حوالے سے کوئی ڈگری نہیں لی۔ اس حوالے سے وہ گفتگو کے درمیان پوچھے جانے والے ایک سوال کے جواب میں کہتی ہیں۔

”میں دورانِ تعلیم امریکہ سے چھٹیوں پر پاکستان آئی تھی تو یہاں موجود افغان مہاجرین کا ایک کیمپ دیکھنے کی گئی۔ وہاں میں نے ان کی خصوصیات بچوں کی جو حالت دیکھی تھی تو ان کے بارے میں ڈاکیمنٹری بنانے کا سوچا تھا۔ میں ہمیشہ سے ایسی مختصر ڈاکیمنٹری فلموں کو دیکھنے میں دلچسپی رکھتی تھی جو اپنے دیکھنے والوں تک کوئی بڑا ماحیقی پیغام پہنچانے کا باعث بنتی ہوں۔“

2002ء میں شرمین نے تعلیم کے حصول کے بعد پاکستان واپسی پر دستاویزی فلم کی دنیا میں پہلا قدم رکھا۔ اس پہلی فلم میں ان کے ساتھ اسمتھ کالج اور نیویارک ٹائمز نے فنڈز کی صورت تعاون ہی نہیں کیا تھا بلکہ فلم سازی کے equipments کے علاوہ اور دوسری سہولیات بھی فراہم کی تھیں اور پھر اس کے بعد یہ سلسلہ چلتی ہی چلا گیا تھا جس کے نتیجے میں شرمین

اب تک سولہ دستاویزی فلمیں بنا چکی ہیں اور ”چلڈرن آف دی طالبان“ دی لاسٹ جزیٹن میوررز چلڈرن پاکستانیڈ بٹل ٹیم ڈون آف دی لنگ ڈم“ اور ”افغانان“ دی ولڈ“ جیسی فلمیں ہیں اس ان پینل فوریسی کی انجریہ ڈانچ لی اسے دکھائی جا چکی ہیں۔ یہاں اس بات کا ذکر بھی بہت ضروری ہے کہ ”دونن آف دی ہولی لنگ ڈم“ سعودی عرب کی ایک خاتون کے حوالے سے وہ ڈاکیمنٹری ہے جس کی شوٹنگ کی اجازت شرمین کو سعودی حکومت نے پہلی بار نہایت خصوصی طور پر دی گئی۔

شرمین عبید چٹائے کا تعلق ان لوگوں کے قبیلے سے ہے جو زندگی کو گزارنے نہیں رہتے بلکہ یقین رکھتے ہیں۔ اپنے زندگی نامے پر اپنے کام کی صورت ایسے دستخط پر یقین رکھتے ہیں جو وقت کی کتاب پر رشاخ کا باعث ہے۔ سو وہ دستاویزی فلموں کی تخلیق والے کام کے ساتھ سماجی امور اور ”سٹیٹیزز آف کراچی آف پاکستان“ نام کے ایک ادارے کی ریسرچ رول بھی ہیں اس ادارے کا بنیادی مقصد اور کام تاریخ پاکستان کو آبدہ لسنوں کے لیے محفوظ بنانا ہے۔

”سیونگ فیس“ شرمین کے اس آسکر ایوارڈ یافتہ کام کا خیال ان کے سماجی ڈائریکٹر ڈینیل ریک کے ذہن میں آیا تھا کہ پاکستانی خزاں برطانوی ڈاکٹر محمد جواد کی زندگی اور ان کے کام یعنی پاکستان میں تیزاب کا شکار عورتوں کا علاج ڈاکیمنٹری کا موضوع بنایا جائے۔

”سیونگ فیس“ کی کہانی جنوبی پنجاب سے تعلق رکھنے والی دو ایسی عورتوں (رخسانہ اور ذکیہ) کا لوہ ہے جن کی زندگی تیزاب میں گھول دی گئی۔ اس ڈاکیمنٹری میں ان تیزاب کا شکار ہونے والی عورتوں کا علاج ان کے معالج پاکستانی خزاں برطانوی ڈاکٹر

محمد جواد کی ان عورتوں کو زمانے کے آئینے کے سامنے کھڑا کرنے کی کوشش اور ان عورتوں پر تیزاب چھینکنے والے مردوں کے خلاف معاشرے اور عدالت میں آواز اٹھانی، کیس لٹوی راولپنڈی کی دیکل ڈکری کی جدوجہد میں موجود ہے جس کا حاصل جرم کا جیل کی سلاخوں کے پیچھے جانا ہے۔ اس فلم کی شوٹنگ اسلام آباد راولپنڈی اور جنوبی پنجاب کے بہت سے مضائقہ مقامات پر کی گئی۔ یہ فلم سب سے پہلے امریکہ میں ریلیز کی گئی تھی اور اکتوبر 2011ء میں آسکر کے لیے نامزد ہوئی۔ اس ایوارڈ والی نامزدگی اور پھر ایوارڈ کے حصول سے پہلے شرمین اور خاے ام ایوارڈ حاصل کر چکی ہیں۔ ان میں انٹرنیشنل ایچی ایوارڈ لیگنٹن ایوارڈ فار بیک جرنلسٹ ساتھ ساتھ انٹین ایسوسی ایشن ایوارڈ ون ولڈ میڈیا جرنلسٹ آف دی ایئر ایوارڈ ٹیلکوڈ ڈیو لپوٹاٹ ایوارڈ کے علاوہ سنے کولڈن ایگل ایوارڈ بھی شامل ہیں۔

اپنی اس کامیابی پر شرمین کہتی ہیں۔ ”ایک مرد اپنے غصے نفرت اور انتقام میں گورت سے چہرے پر تیزاب چھینکنے میں ایک لمحہ کا تپا ہے لیکن وہ تیزاب کا شکار گورت ساری زندگی اس مذہب کو چھینکنے ہے۔ اس موضوع کو ڈاکیمنٹری ”سیونگ فیس“ کی شکل

دینے میں تقریباً ڈیڑھ سال کا عرصہ لگا۔ ہم نے اس پر بہت محنت کی، ہمیں اس کام کے حوالے سے یہ امید تو یقینی طور پر تھی کہ ”سیونگ فیس“ کو بین الاقوامی پلیٹ فارم پر بہت زیادہ Acknowledgement حاصل ہوگی لیکن یہ نہیں سوچا تھا کہ یہ آسکر کے لیے نامزد نہیں ایوارڈ بھی حاصل کرے گی۔“

شرمین ایک اچھی پروڈیوسر اور ڈائریکٹر نہیں ایک مندرجہ ذیل اور خیال رکھنے والی کہانی کار بھی ہیں۔ تقریباً چودہ پندرہ برس کی عمر میں پہلی کہانی

لکھنے والی شرمین اس کام کے حوالے سے کہتی ہیں۔ ”میں اپنی کہانی کے لیے ان موضوعات کا انتخاب کرتی ہوں جن کی طرف لوگ اوجھلے والوں کی نظر نہیں جاتی ہے۔“

شرمین عبید چٹائے اپنے کام کے حوالے سے ایک خاص نام آسکر کے حصول کے بعد بہت خاص کام کا درجہ حاصل کرنے والی شرمین عام زندگی میں ایک عام ہی عورت کا درجہ رکھتی ہیں۔ ان کی پانچ بہنیں اور ایک بھائی ہے۔ شادی شدہ زندگی کی حامل شرمین ایک انجی بیٹی بہو ہونے کے علاوہ ایک پیاری سی بیٹی تقریباً ڈیڑھ دو سالہ ایلیا کی ماں بھی ہیں۔ اپنی تمام تر مصروفیات میں سے بھی وقت نکال کر کہہ کا سودا خود لانے اور پکانے کی شوٹیں شرمین کو اس فلم کی دینا سے رشتہ جوڑے تقریباً گیارہ برس کا عرصہ ہو رہا ہے۔ اس دوران میں بہت سے ایسے مقام آئے جس شرمین کے کام کو وہ تمام اور اہمیت دیتی تھی جس کے لیے وہ اور ان کا کام کا deserve کرتا تھا لیکن شرمین نے بہت حوصلے بہت ذہانت اور مستقل مزاجی سے اپنا سفر جاری رکھا ہے اور یہ ”سیونگ فیس“ کا آسکر حاصل کرنا ہی کار نامہ مکمل کا Reward ہے۔

موجودہ وقت میں ہمارے پیارے ملک پاکستان کے چہرے کو بے شمار لوگ ہیں جو انداز غرور نے کی کوشش کر رہے ہیں، کرپشن، دہشت گردی، مذہبی انتہا پسندی اور خواتین کے ساتھ غیر انسانی سلوک..... ان داغوں کے درمیان اس واقعہ چہرے پر عزت اور کامیابی کا یہ نشان بہت اہم ہے۔ اہمیت کے اس احساس پر دل کی گہرائیوں سے

Thanks to Sharmeen!

مجر رضوان قیوم

انگارے بے جہنم

مذہب سلطانہ مثل کا خیال

شرکی جب میرے خرابے کا مقدر ٹھہری
میں نے چاند تاروں سے فیاہ جاتی تھی

برہنہ پلاست کی گر خاراہ پر چلنے والی ایک باحصول عورت کا قصہ خاص



اماں کے چہرے پر شندرابانی ڈال کر نہیں ہوش میں لایا گیا اور ہم روئے پٹنے کھر پٹنے تھوڑی دیر بعد ابا کی میت گھر کے باہر کالج کی چار پائی پر رکھ دی گئی کیونکہ انھن میں اتنی جگہ نہ تھی۔ گھر کے اندر ہم بہن بھائی ایک دوسرے سے لپٹ کر رو رہے تھے۔ ماں اپنے سر پر پٹی باندھے تین کر رہی تھی کہ اب ہمارا سہارا کون سنے گا؟ ہمیں کس کے سہارے چھوڑ گئے ہو؟ اماں کی اس آواز زاری کی وجہ سے ہمارا دل اور تڑپ جاتا اور دم اور زور زور سے رونے لگتے۔

ابھی ابا کی میت گھر کے باہر ہی رکھی ہوئی تھی کہ ہمارے گھر میں پرکاش سندراس کے تین چار نوکر اور اس کا بیٹا ملری پرکاش آئے روٹی ماں نے ان کا چہرہ دیکھا تو چلائے ہوئے کہا۔

”کاش میرا مجبور خرب خاوند تمہاری حویلی میں

لے جاتے ہوئے اور پی سڑی پر سے پاؤں پھسل جانے کی وجہ سے مر گیا تھا۔۔۔۔۔ ابا کی موت کی خبر سن کر اماں میں اور بھائی روئے پٹنے پرکاش سندری حویلی پہنچے تو وہاں ان کی میت حویلی کے باہر خون میں نشتری ہوئی پڑی تھی جس کے گرد گاؤں کے اکثر دیہاتی ہندو سکھ کھڑے تھے۔ ان میں ایک اکا دھ مسلمان بھی تھے۔ اماں تو ابا کی میت دیکھتے ہی کرا کر بے ہوش ہو گئی تھیں جبکہ میں اور تو صیف ابا کی لاش سے چمٹ کے رو رو کر ہکان ہونے لگے تھے کہ وہاں کھڑے گاؤں کے واحد مطلب کے حکیم جی بوئے تھے۔ ”کم از کم ٹھاکر یا حویلی کے کسی اور فرد کو تو اس موقع پر یہاں مرنے والے کی بیوہ اور بچوں کی دلجوئی کے لیے ہونا چاہیے تھا۔ ارے یہ بڑے لوگ ہیں انہیں کسی خرب مزدور کے مرنے کا کیا درد؟ بچو۔۔۔۔۔! صبر کرو۔ اللہ بڑھ کرے گا۔“

سردیوں میں اس کے کام کی ٹھنڈ ہمارے گھر کے چولہے پر بجی پڑتی تھی یعنی گھر میں بھوک ہی بھوک مٹلائی تھی۔ یہاں یہ بتانا ضروری ہے کہ گھر میں میرے علاوہ ایک بھائی تو صیف بھی تھا۔ ہمیں جب بھوک ستانی تو مجبوراً ہم بہن بھائی گاؤں کے ہندو اسکھ گھروں میں جا کر کھانے اور پیون کی بھیک مانگا کرتے تھے۔ یہی کسی جگہ سے ایک آدھ پیسہ اور بچا کچا کھانا مل جاتا تو کسی جگہ سے دھکے ملتے تھے۔ اس گاؤں میں مسلمانوں کے چند ہی گھرانے تھے اور چلی بات یہ ہے کہ سارے کے سارے ہماری طرح کے بھکاری ہی تھے۔ ان میں سے زیادہ تر ہندو سکھوں کے ہاں خاصی ذلت والی نوکریاں کیا کرتے تھے۔ خیر قصہ مختصر یہ کہ ایک تو ہم پہلے ہی انتہائی غربت کے نہایت صحت حالات سے گزر رہے تھے کہ اچانک میرا ایک ایک ہندو جاگیردار پرکاش سندری کی حویلی کی چمٹ پر بھاری آغی بیڈ مثل فین

یہ کہانی مجھے جن چپکای سالہ بزرگ خاتون شائستہ بیگم نے سنائی ہے وہ شدید بیماری کے عالم میں بستہ رہ گئی ہوئی ہیں۔ اپنی کہانی سناتے ہوئے قہقہے کی وجہ سے ان کی آواز خاصی مدہم تھی اس لیے میں نے اپنے کان ان کے لبوں کے بہت قریب کر کے کہانی سنی اور لگشی ہے۔ قارئین کرامی اس کہانی میں بیان کردہ مقامات اور کرداروں کے نام سننے میں اگر مجھ سے کوئی غلطی ہوگئی ہو تو معاف کیجئے گیے۔ شائستہ بیگم نے اپنی کہانی کا آغاز کچھ یوں کیا تھا۔

”میں موجودہ بھارت کے شہر امرتسر کے ایک مضافاتی گاؤں بھوند میں ایک ایسے غریب خاندان میں پیدا ہوئی جہاں کی معاشی حالت انتہائی پگھلا پڑی تھی۔ میرا پاپ نور و بس اڈے پر لیکوں کی ”بجین“ ستور اور دیگر شروبات کی ریڑھی لگا کر کتا قصابوں وہ گرمیوں میں تو گزارہ لائق ضروری کر لیتا تھا لیکن

آج بھوک پیاس سے مجبور ہو کر سرحدوری کے لیے نہ جاتا۔ دیکھو آج اس کے مرنے سے ہم سب بے آسرا اور میرے بیٹے یتیم ہو گئے ہیں۔

پڑوں کی ایک بوڑھی عورت نے کہا کہ یہ بے چاری بھری جوانی میں بیوہ ہو گئی ہے۔

”مجھے بہت دکھ ہوا ہے کہ یہ بے چارہ غریب اتنی دردناک موت مرا لیکن میرے نوکر سووے بھلے نے مجھے بتایا ہے کہ روروا اپنی گھٹلی کی وجہ سے مرا ہے۔ اس نے جانا چارو روکھا تھا کہ روروا اپنا بھاری پٹھلا کیلا نہ اٹھائے لیکن وہ نہ اٹھا کہنے لگا کہ مجھے جلدی ہے میں نے مزدوری کے چپوس سے یوزی بچوں کے لیے کھانے پکانے کا سامان لے کر جانا ہے۔ بہر حال اب ان باتوں کا کیا فائدہ کہ کیسے مرا کیوں مرا؟“

پرکاش سندرنے اپنی بھاری دار پر اب آواز میں کہا پھر اس نے اپنے بھتیجے پریم سنگھ کے ہاتھوں میں 100 روپے رکھتے ہوئے کہا۔ ”اس رقم سے تو روٹی نہ بھین اور میت میں آنے والوں کی روٹی پانی کا انتظام کرو دینا اور ہاں تو اسے اپنا تازہ میسر می موجودگی کا احساس دلانا ہے۔ مجھے آج ضروری کام کے سلسلہ میں لالہ موگی لکھن گیس کے اجلاس میں شرکت کے لیے جانا ہے۔ اس نے بڑے سفر و راجا میں توصیف اور میرے سر پر ہاتھ پیچھے ہوئے کہا کہ بچہ.....! پریشان بالکل نہ ہونا میں دابھن آکر تمہاری گزربسر کے لیے کچھ نہ کھنڈ کر دوں گا۔ یہ میرا تم کو لوں سے وعدہ ہے۔

شام کے وقت ابا کو گاؤں کے مقامی قبرستان میں دفنایا گیا تھا۔

بھتیجے پریم سنگھ نے بڑے اچھے طریقے سے میت میں آنے والوں کو کھانا کھلایا۔ چکی بات ہے کہ ہر روز ہم نے زندگی میں پہلی بار اتنا چھاکھا پیٹ بھر کر کھایا تھا۔ ہم نے خوب جی بھر کے گوشت اور

زردے سے اپنے آپ کو بھر لیا۔ اس دوران مکے اور پڑوں کے ہندو سکھ ہمارے کھرنیت کے لیے آتے رہے۔ اوجیر پریم سنگھ تین روز تک ہماری خبر گیری کرتا رہا۔ اس نے جانے وقت اماں کے ہاتھ پر پرکاش سندرن کی جانب سے دیے گئے 100 روپے میں سے بقیہ 40 روپے رکھ دیے اور جاتے ہوئے کہہ گیا کہ وہ کسی مسئلے کے لیے یا کسی ضرورت کے لیے بلا جھگڑا حویلی آ سکتی ہے۔

بھتیجے پریم سنگھ کی جانب سے دیے گئے روپے چند دنوں میں ہی کاغذی طرح خرچ ہو گئے جیسے وہ تھے ہی نہیں۔ مگر میں ایک بار پھر بھوک افلاس نے اپنا ڈھیر جمایا۔ اب ہمارے گھر میں نہ کڑوی روٹی کی صورت میں پلاؤ تو مرے آ رہا تھا اور نہ ہی کوئی پاس پڑوں سے ہم پر ترس کھا کر دال مہزی کا پچالہ دے رہا تھا۔

”ہائے.....! بھوک لگی ہے اماں.....! بھوک سے میرے پیٹ میں درد ہو رہا ہے۔“ توصیف نے داو بلا شروع کر دیا تھا۔ اماں پریشان لگا ہوں سے ہونٹوں کی طرح ہمیں دیکھتے ہوئے خاموشی سے روئے جاری تھی۔ بلا جھجھور بھائی اور میں فوری طور پر موڑوں حکیم الدین کے پاس گئے۔ اسے اپنے خاندان کی بھوک افلاس کے بارے میں بتایا تو اس نے ہمیں اپنے تجربے میں اور گرد کے مسلمانوں کے گھروں سے آئے مختلف کھانوں کے پالوں میں سے آباؤ ابا ایک پیالہ خاگر کھیں دیا اور کہا۔ ”تم روزانہ آجایا کرو اور کھانا لے جایا کرو۔“ ہم خوش خوش خیرات کا یہ کھانا کھلے آئے اور اس طرح اپنا پیٹ بھرا۔

شام کو موڈوں حاجی حکیم خصوصی طور پر اپنے پالوں اور داڑھی پر خضاب لگائے صاف سترے کپڑے پہن کر ہمارے گھر آیا۔ اس نے پہلے ہم

سب بچوں کو پیسے اور ٹانیاں دیں۔

تھوڑی دیر بعد اس نے اے کو اپنے پاس بلا کر کہا۔ ”تم بیک وقت در بدر بھر اور بھیک مانگ کر اپنا گزارہ کرو گی؟ کسی ایسے شریف انسان سے نکاح کیوں نہیں کر سکتی جو نہ صرف پیسے بچوں کو پیٹ بھر کر دے بلکہ اسے اور تو سہاگن بھی بن جائے۔ دیکھ“

یہ کہ اس معاشرے میں کوئی شہیت نہیں ہے۔“

”مغز کڑ میں تیری بچی کی طرح ہوں تیری پہلے بھی اس کا ڈن اور شہر میں تین یوں یا موجود ہیں اور تو نے انہیں کس عذاب میں رکھا ہوا ہے سب جانتے ہیں۔“ اماں نے اسے لڑتے ہوئے کہا۔

”اچھا میں نے تو تیرے فائدے کے لیے ایک مشورہ دیا تھا آگے تیری مرضی سے لیکن سوچ لے اگر تو مجھ سے نکاح کر لے تو انشاء اللہ تیرے بیٹے اور تو بھی بھوکے نہیں رہیں گے کیونکہ اللہ کے کرم سے میرے بچے میں دیسی گھی کا ترکا لگی دالوں چھوٹے گوشت کی بوٹیوں سے بھرے پیالے آتے ہیں اور ساتھ ہی سکھ کے ساتھ میری رہائش بھی ہے۔ اس کی ان باتوں کے جواب میں اماں نے اسے حق تعالیٰ کے باہر نکال دیا تھا۔

دوسرے دن جب ہمیں کسی نے پوچھا تھا کہ ہمیں گھر میں بھوک نے اپنا زیروہ ڈالا تو اس نے مجھے کہا کہ چل بھتیجے پریم سنگھ کے پاس حویلی میں چلے ہیں۔ ویسے بھی اس نے کہا تھا کہ اگر کوئی پریشان ہو یا بھوک ستائے تو آ جانا۔

اماں اور میں جب حویلی پہنچے تو اتفاق سے بھتیجے پریم سنگھ نے ہی دروازہ کھولا۔ اس نے اماں اور مجھے دیکھا تو ہمیں اپنے ایک چھوٹے سے کمرے میں بٹھا کر کہا کہ میں ابھی خاگر پرکاش سندرن بلا کر لانا ہوں مجھ جیسا حکم کریں گے میں دیا ہی کروں گا کیونکہ میں تو خدا کا ملازم ہوں اور ان کے حکم کے

بغیر کچھ نہیں کر سکتا۔ وہ باہر چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد وہی جھلاوہا جھار کے ساتھ ہمارے گھر آیا تھا۔ دہائی رال پٹا ہوا لوٹ پٹا بنگ باٹھن کرنا کمرے میں آ گیا۔ وہ ہم پٹھوں کی طرح اپنی سیدی مریٹس کرتا نہ جانے۔ منہ میں کیا کیا بوڑوارا تھا جس کی کچھ سمجھ آ رہی تھی اور کچھ نہیں لیکن اس کا مطلب سمجھ آ جاتا تھا۔ تھوڑی دیر بعد بھتیجے پریم سنگھ آ آ اس نے کہا کہ خاگر صاحب اس وقت حویلی سے باہر گئے ہوئے ہیں۔ ہمیں ایسا کر کوئی الجال دورو ہے مجھ سے لے لو اور پناہ دھان پان کرو۔

”بھتیجے صاحب یہ ہمارے مہمان ہیں ان کی کچھ سیوا کرو۔“ بیٹلے نے ناک میں بولتے ہوئے چڑھوں کی طرح کہا۔

”توجہ کر اور کل یہاں سے۔“ بھتیجے نے اسے ڈانٹتے ہوئے کہا۔

”کیون ہے؟“ اماں نے بھتیجے سے پوچھا۔

”یہ خاگر صاحب نے اپنے گلے میں مندر کا گھنٹہ بندھا ہوا ہے جو ہر وقت بجنا رہتا ہے۔ وہ کمرے سے چلا گیا تو بھتیجے نے مزید بتایا۔

”درحقیقت یہ اس حویلی کا کھلو نہ ہے یہ سب کو ہنساتا ہے۔“

”یہ کیا کہاں سے ہے؟“

اماں نے جب بھتیجے سے سوال پوچھا تو اس نے مسکرا کر کہا۔ ”یہ میں نہیں بتا سکتا۔“ وہ مسکراتا رہا۔ اس نے اس سوال کا جواب نہ دیا تھا پھر اس نے ہمیں کہا کہ تم کل یہاں آنا میرا وعدہ ہے کہ میں خاگر پرکاش سندرن سے کہہ کر تمہاری مالی امداد کا بندوبست کروادوں گا۔

اکلی منج بھتیجے اور خاگر خود ہی ہمارے گھر آ گئے۔ خاگر نے آتے ہی کہا۔ ”ہماری حویلی میں نوروی موت واقع ہوئی ہے۔ اب یہ ہمارا فرض ہے کہ ہم

تھیں ہے اس آسرا بھوکا پیاسا نہ چھوڑیں۔ اس نے
اماں کو کہا۔ تو اس سڑی بڑو دار کوٹھری کو چھوڑ دو
میری حویلی میں آ جا۔ مجھے صدف پر ہاش دور
کا بلکہ نوکری کی کٹھن میں تیرا مستقل روزگار بھی لگا
دوں گا۔ تمہارے 50 روپے اماں کو دیئے۔ شام
کو نہا دھو کر اچھے کپڑے پہن کر حویلی خالی ہاتھ آ
جانا۔ وہاں بھوکاں کا دیا تب کچھ ہے۔
شام کو جب ہم سب گھر والے ٹھاکر کی حویلی کی
طرف جانے لگے تو ایک ہندو بڑوں نے طنز کرتے
ہوئے کہا تھا۔ تم لوگ اس شخص کی حویلی میں جا
رہے ہو جس نے نو روپیہ سیٹ حویلی کی حد سے باہر
لاواڑوں کی طرح پھینک دی کی تمہارا چچا انسان
نہیں ہے تم وہاں جا کر کچھ تو کئے۔
اماں نے جواباً کہا۔ تو ہم لوگوں سے مل رہی
ہے۔

ہم جب حویلی کے دروازے پر پہنچے تو نشی نے
ہمیں اپنے اس کمرے میں بوی عزت سے نبھایا
جہاں ہم پہلے بھی آئے تھے۔ تھوڑی دیر بعد ٹھاکر
اندر کمرے میں آیا۔ اس کے ساتھ دو آدمی اور بھی
تھے۔ ان میں سے ایک تو شریف لگ رہا تھا جبکہ
دوسرا آدمی لیے لپٹے بڑی بڑی مونچھوں والا اور
چہرے ہی سے سخت اور بد معاش لگ رہا تھا۔ ٹھاکر
نے آتے ہی کہا۔

”تم نے میری بات مان کر اچھا کیا ہے۔ میرا
چھوٹا بھائی ہے۔ ہاں ٹھاکر بزم کمار یہ نو روپیہ اور
اس کے بچے ہیں۔ تمہارے اپنے چھوٹے بھائی
سے مخاطب ہو کر کہا پھر دوسرے کا تعارف کر دیا۔
”یہ میرا بیٹھجہ ہے۔ ہاں، یعنی سندر تو نے ان کو حویلی
میں بلا تو لیا ہے اب بتلاؤں تم کا کیا ہے؟ بس
ان سب کو حویلی کے کھٹکے کاٹوں میں لگا نا ہے۔
نو روپیہ ہونا اندرونی کی صفائی کرے گی جبکہ یہ نو روپیہ

..... کیا نام ہے تیرا؟“
”بی شائستہ“ میں نے شراب کہا۔

”ارے شربانی کیوں ہے؟ زور ہے بات کیا
کر۔“ بزم کمار نے اپنی مچھوٹ کو ڈاڑھ دیئے ہوئے
کہا۔ ”چھوڑ کر کس کے حوالے کریں؟“
”اسے لی اجال چھوڑو۔“

استے میں جھلا مودا آیا اس نے وہی دیوانگی کا
مظاہرہ کرتے ہوئے کہا کہ میرا بھی اس سے تعارف
کر دوا دیں۔

”ہاں یہ مودا صاحب ہیں اس حویلی کے
چھوٹے ٹھاکر ہیں۔ تم کاش سندر سے طنز یہ انداز
میں مسکراتے ہوئے کہا۔ ”چھوٹے ٹھاکر صاحب“
آپ ایسا کریں کہ نو روپیہ طور پر باورچی خانے میں جا
کر آئے گی بوریاں ڈبوں میں ڈالیں اور بعد میں
گھوڑے پر کاشی ڈال کر تاکہ تیار کریں۔ مجھے
تیرے ساتھ راجپوری گاؤں جانا ہے۔ ہاں تو چچی
شائستہ کو بڑی بینک کے پاؤں دبانے خدمت کرنے
کے لیے کہہ لیتے ہیں۔

ہمیں حویلی کے اندر لے جایا گیا وہاں کی دنیا
ہی کچھ اور تھی۔ وہ حویلی بڑی شان و شوکت والی تھی
داخلی دروازہ انتہائی مضبوط تھا اس کے پیچھے لوہے کا
ایک اور دروازہ تھا اس کے بعد وہاں ہال تھا اور پھر
تین چار بڑے بڑے کمرے تھے۔ پہلے کمرے میں
ایک نو جوان بڑی مچھوٹی

”یہ چھوٹی ٹھاکرانی سریشہ دیوی ہیں۔ تمہار
نے بتایا۔

اس نے ہمیں دیکھ کر اپنی ناک پر رد مال رکھا۔
دوسرے کمرے میں ایک ادھیڑ عمر کی اپناج عورت
مچھوٹی جس کی نائیں ایک اپنی ایشینڈ سے بندھی
ہوئی تھیں جس طرح آج کل گھوڑوں لگانے والا ایشینڈ
ہوتا ہے۔ اس کے قریب ٹھاکر ہمیں لے کر گئے تو

انہوں نے ان کا تعارف کر دیتے ہوئے کہا۔ ”یہ
شائستہ تیری خدمت کرے گی۔ اولڑکی.....! تو نے
بڑی ٹھاکرانی کی روزانہ نائیں دہانی ہیں اور ان کی
خدمت کرنی ہے۔“ مودا جھلے ساتھ ساتھ تھا اس
نے چپکے سے میرے کان میں کہا۔
”ٹھاکرانی کو یہاں پوچھتا کوئی نہیں ہے اور ان
کی نائیں ٹوٹ چکی ہے۔“

”تو چپ کر۔“ ٹھاکر نے اس کو دھکا دیئے
ہوئے کہا۔ ”دفع ہو یہاں سے اس سائیں نے
تو ہمیں بہت تنگ کرنا شروع کر دیا ہے۔ لگتا ہے اس
کا کوئی علاج نہ پڑے گا۔“

اور اس میں بزم کمار کی باتوں سے بھی
تعارف ہوا کیا گیا۔ ان کی تعداد دو تین کے قریب تھی
اور اس کے علاوہ دو نوں بھائیوں کے ان کی مختلف
بیویوں سے چھوٹے بڑے کافی بچے تھے۔ وہ سب
تنگ چڑھے تھے اور ان کو اپنے اپنے ہونے کا غرور
مثبت سے تھا۔ وہ اپنے نوکر کو بھی منہ نہ لگاتے
تھے۔ حویلی کا کھلو مودا جھلے تھا۔ حویلی کی عورتیں
اور بچے اس کی اوٹ چائنگ حرکتوں سے بہت محظوظ
ہوتے تھے۔ بعض دفعہ وہ ایسی ایسی ہنسنے والی باتیں
کرنا تھا کہ ہمیں خود بھی آجاتی تھی۔ وہ کسی بندر
بن کر اچھل کود کرتا اور کسی ٹھوڑا بن کر بچوں کو پیٹنے پر
سوار کرواتا۔ اگر حویلی کے سب چھوٹے بڑے اسے
زیادہ تنگ کرتے تو وہ مل بھین کر گندی گندی گالیاں
دیتا تھا۔

ہمیں اس حویلی کے سرونٹ کا وارڈ میں چھوٹے
چھوٹے دو کمروں پر مشتمل معمولی سہولت والا کاوارڈ
دے دیا گیا۔ اس سرونٹ کا وارڈ ہم تینوں خوشی
خوش زندگی گزارنے لگے۔ اماں اور میں حویلی کی
چاکری کے بعد جب اپنے کاوارڈ میں آتے تو رات
لگے تک ہم جاگ کر خرب باتیں کرتے۔ اماں کا

خیال تھا کہ اس حویلی میں سب باسیوں کا مزاج
خحت اور مضر ہے۔
”بس شئی پریم تنگہ اور بڑی ٹھاکرانی نورتی
خوش اخلاق ہیں لیکن اماں وہ مجھ سے سارا دن
ٹانگیں اور سر دہانی دیتی ہیں۔ وہ مجھے بالکل اچھی
نہیں لگتی۔ وہ مجھ سے سارا دن آرام بھی نہیں کرنے دیتی۔
ان کے کام سے ناراض ہوتی ہوں تو چھوٹی ٹھاکرانی
مجھ سے اپنا کر صاف کر دیتی ہیں۔“
”بھئی، کیا کریں جب زندگی گزارنی ہے تو
محنت مزدوری میں خرچہ کیا ہے تو سب برداشت کرنا ہی
پڑے گا۔“

ٹھاکر دن بھر کانٹیں کے حلسوں میں معروف
رہتے تھے۔ ان کی حویلی میں آئے دن بینک وغیرہ
ہوتی رہتی تھیں ان سٹنگٹوں کے اجلاس میں شریک
ہندو مسکے بعد میں مودے جھلے کو اپنے پاس قریح کر
لے لے لیتے تھے۔ وہ سب کے سامنے مسلم لگ اور
کانٹیں کے لیڈروں کی نقائص اتار کر ان کو ہنسیا کرتا
تھا۔ سب لوگ اسے تنگ کرتے تھے۔

منشی پریم تنگہ اکثر ہمارے کاوارڈ میں آ کر ہمارا
حالی احوال پوچھتا اور جب باتیں کیا کرتا تھا۔ اب
وہ بالکل گھر کا بندہ بن گیا تھا۔ وہ ہاتھ بکھر کسی
روک ٹوک کے ہمارے کاوارڈ میں آتا تھا۔ ہم دونوں
بہن بھائی ان کو پریم چاچا کہا کرتے تھے۔ اماں
بہت خوش رہنے لگی تھیں ان کی شکل دیکھ کر ایسا لگتا
جیسے وہ اب کی موت کا غم بھلا گیا ہیں۔

ایک دن اماں نے منشی پریم تنگہ سے کہا۔ ”آپ
سے جب میں نے پہلی ملاقات میں پوچھا تھا کہ یہ
چھلا مودا کون ہے؟ تو آپ نے پوری بات نہیں بتائی
تھی۔“
منشی نے کہا۔ ”یہ جھلا مودا درحقیقت شادی میں
یعنی ٹھاکر پر کاش سندر کے باپ کی رکھیل کا بیٹا

تھا۔ خاکر صاحب نے بعد میں اسے قتل کر دیا تھا لیکن اس کے سطن سے ایک بچہ پیدا ہوا جس کا نام محمود رکھا گیا جو کہ بعد میں سودا کے نام سے پکارا جانے لگا۔ اس کے بارے میں شری یاد پورام کہتے تھے کہ جب سے یہ جھلا پیدا ہوا ہے اس دن سے ان کے مابین مسائل مل ہو گئے ہیں۔ اس پر شاید کسی سامنے یہ قید نہ کیا ہوا ہے اس لیے انہوں نے اس کی مسلمان مان کو قتل کر دیا لیکن اسے اپنا کام کا سمجھ کر زندہ رکھا۔ وہ دوڑ گئے لیکن یہ بڑا ہو کر اب تمام حویلی کا کھلونہ بن گیا ہے۔ یہ بے چارہ نہ جانتا ہونے کی وجہ سے تو بڑے بھائی کا رتہ پا کر اس کا نہی چھوٹے بچوں کی طرف سے اس کو چاچا ہونے کا کاف حاصل ہو سکا لیکن یہ باتیں تم اس حویلی میں کسی کو نہ بتانا۔ اگر تم نے میری یہ بات ان کے سامنے کر دی تو تمہا کر صاحب میری ہڈیاں تو ڈوبیں گے۔“

مودہ جھلا سارا دن حویلی کے اندر رہنے والے پاسیوں کا خوشی رشتہ دار ہونے کے باوجود اس کی چاکری کیا کرتا تھا بیٹھ دھڑھوٹے حویلی کے رہنے والے اس سے اتنا تامل والا کام لیتے تھے کہ رہنے دیکھ کر میں بھی غصے آتی تھی۔ بیرم کہاں سے اپنے اسٹبل میں بندے موٹوں، کتوں کی لید اور فضلہ اٹھاوا کرتا تھا ان کو ہلوا کیا کرتا تھا۔

حویلی کا ساوہل انتہائی بے باک، فحش قسم کا تھا۔ چھوٹی بڑی شا کرانیاں اپنے دیوروں سے انہیں میں انتہائی لگی اور مردانہ گلیوں سے بات کرتی تھیں۔ یہ بات بھی ہم نے دیکھی تھی کہ بے لوگ آپس میں ایسی حرکات کرتے کہ انہیں شرم نہ آتی بالخصوص مرلی پرکاش اپنی جوان سوتیلی ماں کے ساتھ اس طرح بات کرتا تھا جیسے وہ اس کا سوتیلایا نہیں، کوئی عاشق ہو۔

حویلی کے تمام مرد ہر وقت شراب کے نشے میں

دھت رہتے تھے۔ بیرم کاڑ مرلی پرکاش کی نظر میں حویلی میں کام کاج کرنے والی عورتوں کے جھسوں کا طواف کرتی رہتی تھیں۔ وہ بظاہر ہمیں تو کچھ نہ کہتے تھے لیکن ان کی آنکھوں اور باتوں سے ہمیں ان کے اندر چھپے جھوس بھرے شیطان کی بوساٹ جھوس ہوتی تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ شری پریم سنگھ چپ بھی ہمارے کوارٹر میں آتا تو اس سے بے موقع اپنی سیدی فحش گفتگو کرتا تھا۔ ماں اسے ہوں ہاں کر کے ہر ممکن ٹالنے کی کوشش کرتی تھی۔ یہ صورت حال ہمارے لیے کسی عذاب سے کم نہیں تھی۔

میں اور ماں سارا دن حویلی کی چاکری کرتے تھے حالانکہ خاکر پرکاش سندر نے مجھے اپنی بڑی بیوی شاکرانی ٹورنی کی خدمت کے لیے رکھا تھا لیکن سرپرستہ یوٹی بھی سے اپنا جنم دیوائی تھی۔ میں جب انہیں دیوائی تو وہ بار بار مجھے کبھی کی کرادور زور دے دیا کرتا تھے اسے اندر نہیں ہے؟ ان سے فارغ ہوتی تو پھر حویلی کی کوئی نہ کوئی عورت مجھے بلارکھتی خدمت میں آتی کہ اندر تم نام کی کبھی چیز نہیں تھی۔ شاکرانی ٹورنی کو نہ جانے کون سی ایسی بیماری تھی کہ اس کا علاج کوئی حکیم طبیب نہ کر پا رہا تھا۔ وہ ہمیشہ چل پاتی تھی۔ اسے خاکر پرکاش سندر بھی گھاس نہیں ڈالتا تھا۔ وہ پرکاش سندر کی عدم توجہ کے باعث بہت بے زار تھی۔ میں جب ان کی خدمت کرتی تو وہ مجھ سے خوش ہو جاتی ہیں اور اکثر کہتی تھیں۔ ”تمہیں بھی موقع ملے تو فوراً یہاں سے بھاگ جانا۔“

میں ان سے پوچھتی۔ ”کیوں؟“ لیکن وہ اس کا جواب نہیں دیا کرتی تھیں۔

ایک دن میں نے ایک بڑی عجیب تبدیلی ماں میں محسوس کی جس سے مجھے تشویش ہوئی، وہ یہ تھی کہ ماں کا پیٹ معمول سے بہت کچھ بڑھ چکا تھا۔ اس کو

شاید تو صیغف نے بھی محسوس کیا تھا۔ ماں سارا دن سبب ہاشانی اورنت سے میرے کھانے دیتی تھی۔ وہ ہمیں بھی دیتی تھی۔ میں نے ایک بار اس سے تشویش بھرے انداز میں پوچھا تو اس نے مجھے کہا کہ اسے پیٹ کے گولے کی بیماری لاحق ہو گئی ہے اور وہ جلد مرے گا۔ میں نے ہسپتال جا کر اسے دکھانے کی۔ اسے میٹنگ فرٹ میو نے نہ جانے کون دیا تھا؟

ایک دن مودہ جھلا ہمارے کوارٹر میں آیا۔ اس اتفاق سے میں اور تو صیغف موجود تھے۔ ماں کوارٹر میں نہیں تھی۔ میں نے اسے اس کا لایا جو سبب دیا تو اس نے مجھے واپس دیتے ہوئے کہا کہ میں تم سے اب سبب نہیں لڑو گا۔

”لڑو کس بات کے؟“ میں نے پوچھا۔
جھلے نے اپنے جھلے والے مخصوص انداز میں کہا کہ تمہارا بھائی جو آئے والا ہے۔
”یو کیا کہو اس کر رہا ہے؟“ اس کی بات سے میرے تن بدن میں ایک گنگ لگی تھی تو صیغف نے بھی اسے غصے سے ڈانٹا تھا بلکہ اس کے جسم پر دو چار ککے لگائے تھے مگر جھلا تیز بڑولے لگا کہ میں تو تم سے لڑو لڑو کھائوں گا تمہارا بھائی آئے والا ہے۔ یہ کہتا ہوا وہ چلا گیا۔

شام ہوئی اور ماں آئی تو میں نے جب ماں کے پیٹ کی جانب دیکھا تو واقعی اس کا پیٹ اس امر کی چٹکی کھار رہا تھا کہ اس کے اندر کوئی گناہ چنپ رہا ہے۔ اب میرے سامنے بڑی مشکل یہ تھی کہ میں کس طرح بحیثیت بیٹی ماں سے یہ بات پوچھوں کہ وہ کس سے اپنا مذموم کالا کر داری ہے؟ اور کیوں؟

دوسری جانب حویلی کے پاسیوں کے وہی طور پر پلے تھے جیسا کہ اس کہانی کے شروع میں بیان کیا تھا کہ وہ لوگ عوامی فحاشی کی زندگیوں میں گم تھے۔

ایک دن میں نے بڑی شاکرانی کا بدن کوٹنے کے دوران انہیں کر لینے کی کوشش کی۔ ”آپ نے ایک دن مجھے کہا تھا کہ تمہارا بس چلے تو یہاں سے بھاگ جانا۔ آپ نے ایسا کیوں کیا تھا؟“
وہ غامض دیرک خاموش رہیں اور بھر بولیں۔
”شاکرانی نے حویلی کو نہیں بلکہ ایسا جنگل سے جہاں انسان نہیں ٹھکانے میں ہے۔ یہاں کوئی کسی کی بیوی نہیں لکھیں۔ یہاں سب کچھ۔۔۔۔۔۔ وہ بات کرتے کرتے کمرنگ ہوئے۔ انہوں نے اور حورا جملہ جملہ کیا۔
”یہاں رشتے صرف نام کے ہیں۔ چل جا مجھے آرام کرنا ہے۔“ وہ دوسری تھیں لیکن مجھے ان کی اس بات پر اس لیے یقین نہیں آ رہا تھا کہ میں تو حویلی کے مردوں نے ہاتھ بھگ لگایا تھا اور دوسری جانب ماں نے بھی اس کی کوئی شکایت نہ کی تھی۔ ہاں یہ ضرور سے مرد بڑی عجیب نظروں سے نہیں دیکھتے تھے۔ ہم لکھتے تھے کہ یہاں کی عادت ہے۔

ایک دن ایسا بھی آیا کہ اب ماں کا پیٹ مکمل طور پر بھول کر اس کا نظر آ رہا تھا۔ اب مجھے اور تو صیغف کو ہر طرف سے طے مل رہے تھے کہ تمہارا بھائی آئے والا ہے۔ حویلی کے تینوں کے طے ملنے سن کر ہمارے کان بک گئے تھے۔ بلاخر ایک دن جب مجھ سے نہیں رہا گیا تو میں نے ماں کو مجبور کر کہا کہ بتاؤ یہ کیا ہے تم نے کیوں کیا؟ کون تمہیں ایسا کرنا پر مجبور کر رہا ہے؟

ماں نے اپنی نگاہیں نیچے کرتے ہوئے کہا۔
”شاکرانی نہیں ہیں یہ بات کل صبح بتاؤں گی کہ میں نے کس مجبوری کے تحت اپنے ہمیر کا سودا کیا ہے۔ بیٹی۔۔۔۔۔۔! میں تیری تو صیغف اور اپنے ہمیر کی مجرم ہوں۔ مجھے معاف کر دینا اور ہاں جتنی جلدی ہو سکے یہاں سے بھاگ جاؤ۔“

”پر کیوں؟ ہمیں یہاں کیا تکلیف ہے؟ یہاں

پر کاش سندر کے رو برو پیش ہو گیا۔ اس کے ساتھ چند پولیس اہلکار بھی تھے۔ پر کاش سندر نے اسے ماں کی گھنڈی کے بارے میں بتایا تو قاتل نے وار نے اسے کہا کہ جیسا طلع آپ اس عورت کا ہاتھ سے ہیں، اس سے تو یہی لگتا ہے کہ وہ عورت حمل سے کی ہو یا لازماً حمل زچگی کے لیے کسی ہسپتال یا دوائی کے پاس گئی ہوگی۔

”وہ تو مجھے بتا رہا ہے کہ وہ حاملہ تھی لیکن میں نے تجھے اس لیے بلایا ہے کہ تو اسے تلاش کر۔“
”اچھا خاکر صاحب.....“ قاتل نے وار امرت بچن نے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔

دو پہر بارہ بجے تک دو دروازے کے قتلوان چوہدریوں ٹھاکروں کو یہ خبر دے دی گئی کہ وہ اپنے اپنے علاقہ میں اس کم شدہ عورت کو تلاش کریں۔ اس کے ساتھ ساتھ زچگی سے متعلق ہسپتالوں دوائیوں کے ڈسکالوں کو کشف کیا گیا لیکن ان کا کہیں سراغ نہیں مل سکا تھا۔ بالا در دو بجے قاتل نے جوئی میں آکر یہ دہانہ کہ خبر سنائی کہ کوئٹہ دار سے سیل دور سوئٹر گاؤں میں ایک عورت کی لاش ملی ہے جبکہ اس کے قریب ایک نو زائیدہ بچہ نیم بے ہوشی کے عالم میں ملا ہے۔ خاکر پر کاش سندر حیرم کماڑ میں تو صیف اور موداج اس گاؤں میں پہنچے تو وہاں ایک جگہ کھیتوں میں ماں کی لاش پڑی ہوئی تھی اور ایک زندہ نو زائیدہ بچہ کو ایک دیہان نے اپنی گود میں اٹھا ہوا تھا۔ میں اور تو صیف ماں سے لپٹ کر رونے لگے۔

”ہائے..... بے چاری حرام کا بچہ جن کرمر گئی.....“ وہاں کھڑے ایک دیہان نے ہمدردی کے انداز میں دل جلا جملہ کہا۔ اس علاقہ کا قاتل وار پولیس اہلکار اور مقامی دیہاتیوں کا بھوم لاش اور بچے کے گرد حلقہ بنائے کھڑے تھے۔ ان کی طرح

کی باتیں ہمارے کانوں میں پڑ رہی تھیں۔ قاتل نے دار نے مقامی دیہاتیوں سے پوچھا کہ یہ عورت کیسے آئی ہے کیونکہ یہاں صرف یہ مردہ عورت اور بچہ ملا ہے۔ انہوں نے مزید بتایا کہ بچوں کا یہاں سے گزر ہوا تو انہوں نے اس عورت کو ترپے دیکھا تھا۔ اس وقت اس میں جاگتی تھی۔

ٹھاکر حیرم کماڑ نے قاتلے دار سے کہا۔ ”اگر اس حرام زادی نے حرام کا بچہ دینا تھا تو اتنی دور کیوں آئی؟“

”ان بات تو میں بھی سوچ رہا ہوں۔“ سوئٹر قاتلے کے قاتلے دار نے کہا اور پھر وہاں کھڑی ایک بوڑھی دیہات سے پوچھا۔ ”کیا اس گاؤں میں کوئی دانی وغیرہ ہے کہیں؟“

”ہاں جو نام کی ایک ایسی دانی موجود ہے جو کہ زانیہ فاحشہ عورتوں کے بچے چپکے سے پیدا کرواتی ہے۔“

قاتلے دار نے فوری طور پر اپنے دو پولیس اہلکار بھیج کر دانی کو بلوایا۔

نجدادی شکل و صورت سے ہی حرافہ اور بد قماش لگ رہی تھی۔ قاتلے دار نے اس سے سخت لہجہ میں ڈانٹتے ہوئے پوچھا۔ ”یہ عورت جو تیرے سامنے پڑی ہوئی ہے تو اسے جاتی ہے؟“ جو خاموشی بھی ہوئی کھڑی رہی تب قاتلے دار نے اسے دھمکی دی اور کہا کہ میں تیری کمال قاتلے میں کھنڈاؤں گا تو تیرے فرشتے بھی بولیں گے پھر قاتلے دار نے بڑی دہجے سے اس کی پٹا پکڑ کر اسے جھجھڑا۔

”اے..... اپنے ہاتھوں میں قانون کو نہ لے.....“ وہاں کھڑے حیرم کماڑ نے قاتلے دار کو تنبیہ کرتے ہوئے کہا۔

قاتلے دار نے بڑے پر جلال انداز میں چلائے ہوئے کہا کہ سردار جی میں کسی قانون کو ہاتھ میں نہیں لے رہا ہوں میں دراصل اس کی قانونی مدد کر رہا ہوں۔

”کیسی مدد؟“ خاکر پر کاش سندر نے اس سے پوچھا۔

”مجھے سو فیصد یقین ہے کہ اس نجدادی نے ہی اس عورت کی زچگی میں مدد کی ہوگی۔“
نجدادی تک خاموشیت ہی کھڑی تھی اس کے ہوش خوف سے پکپکا رہے تھے۔

”چلو لوئے..... اس مردہ عورت اور بچے کو قاتلے لے کر چلو.....“ قاتلے دار نے اپنے اہلکاروں کو کہا۔

اماں کی لاش کو بڑے ذلت بھرے انداز میں ایک جھڑ پر بے پروا کیا جبکہ بچہ کو میری گود میں دے دیا گیا۔ نجو جو بھی ہوئی ایک طرف کھڑی تھی اسے قاتلے دار نے بوی کرخت آواز میں ٹھکرا۔

”تو بھی چل میرے ساتھ قاتلے وہاں میں تیری ہڈیاں تو فنا ہو چکی تھیں۔ میرا تجربہ بتاتا ہے کہ تیرا ہاتھ اس عورت کی ناجائز زچگی میں ضرور ہے۔“

”ارے..... کیوں اپنی ہڈیاں قاتلے میں گلوئے؟“ کیا بچے قاتلے دار صاحب کو سہیں بتا دے؟“

”مجھ میں سے ایک بڑھا بولا۔“
نجدو فوراً قاتلے دار کے پاؤں میں گر کر بولی۔
”خدا کے واسطے مجھے قاتلے نے لے کر جاؤں میں آپ کو سب بچ گاتا ہوں۔“

”جلدی بک کیا کہنا جاتی ہے؟“ ان سب لوگوں کے سامنے تانا کہ یہ بھی نہیں۔“
نجو نے وہاں کھڑے کھڑے کہنا شروع کیا۔ ”اس عورت نے اپنا نام کھان بٹایا تھا۔ اس نے مجھے کہا تھا کہ میں کسی کا ختم اپنے شکم میں اٹھائے

پھر رہی ہوں اور میں نے اسے ضائع کرانے کی بھی کوشش کی تھی لیکن یہ ضائع نہ ہو سکا لہذا میں نے مجھے ٹوٹوں کا لالچ دے کر کہا تھا کہ میں اس ناجائز بچے کی زچگی میں مدد کروں۔ یہ آج صبح میرے پاس آئی تھی۔ میں نے اس سے دے دینے کے 200 روپے کی بھاری رقم لے کر اسے ایسی دوائیاں دی تھیں جسے جو کہ زچگی کے عمل کو آسان بناتی ہیں لیکن انہوں نے وہ دوائیاں اسے نقصان نہ کریں۔ ان دوائیوں کا زہر اس کے پیٹ میں پھیل گیا تھا اور میں اسے بچانہ سکی۔“

”قاتلے دار صاحب“ نجدادی نے جھپٹے ماہ بھی حرام کو جتنے دانی ایک فاحشہ عورت کو بار بار قاتل۔“ مجمع میں سے نہ جانے کہاں سے آواز آئی تھی۔

”یہی بیان اگر میں نے قاتلے میں جا کر اس سے لیا ہوتا تو تم کہتے کہ میں نے اس سے زبردستی بیان لیا ہے۔“

سوئٹر قاتلے تک ماں کی لاش کو بڑے پر لے جایا گیا۔ دونوں ٹھاکر مجھے پیچے سمیت وہاں سے گئے۔ پہلے تو حلقہ قاتلے دار نے جو کی خوب کھائی لی لیکن بعد میں خاکر پر کاش سندر نے قاتلے دار کی مٹھی گرم کرتے ہوئے کہا کہ اس کیس کو سہیں ختم کر دے لہذا کیس واپس لیا گیا اور اس کے ساتھ ساتھ نجو کی جان بھی بچ گئی۔

مجھے ماں پر شہید ہوا تھا۔ رونا سا ساتھ ساتھ آ رہا تھا۔ اسے مردار جانوری طرح جھڑ پڑی گاؤں کی جانب لے جایا جا رہا تھا۔ تو صیف مسلسل سستہ کے عالم میں ماں کو دیکھے جا رہا تھا۔ میں نے اسے رلانے کی بہت کوشش کی لیکن اس کا سستہ نہیں ٹوٹا۔ میں اسے جھجھو جھجھو کر کہتی کہ ماں مر گئی ہے لیکن مودا جھلا میری بات یہ کہہ کر کاٹ دیتا تھا کہ آج تو تمہاری خوشی کا دن ہے تمہارا بھائی کا کا آتا ہے۔

اس کی بات سے وہاں کھڑے تماش بین دیکھنا ہمارا مذاق اڑانے لگتے تھے۔ ماں کے جنازے میں کسی گاؤں والے نے شرکت نہیں کی۔ اسے کھڑا کھود کر جانوروں کی طرح دبا دیا گیا۔

شام ہوئی تو ٹھاکر پرکاش شہر کمار نے ہم دونوں بہن بھائی کو اپنی حویلی کے کیٹ پر روکے ہوئے کہا، ”ٹھاکرانی سریشہ دیوی اور دیگر ٹھاکرائیاں ہمیں اس بات پر زور دے رہی ہیں کہ تم دونوں ایک بدقش ماں کی اولاد ہو لہذا ہم دونوں حویلی کے اندر قدم نہیں رکھ سکتے۔“

پرکاش سندھ نے حویلی کا دروازہ ہمارے لیے بند کر دیا تھا۔ میں اور تو صیف شہت تم سے روئے لگے۔ یہ میں کس نا کردہ جرم کی سزا ل رہی تھی؟ اماں نے جانے کس خاتمہ کا گناہ اپنے شکم میں پال کر اسے جنم دیا تھا؟ اور سراسیمہ ل رہی تھی۔

مودا جھلا ہم دونوں بہن بھائی کو اپنی کوٹھری نما رہائش میں لے گیا۔ وہاں اس نے ہمیں اپنی کوٹھری کے کچھوڑے میں جکڑ دے دی تھی کیونکہ ہمیں ہماری کوٹھری سے بھی بے دخل کر کے وہاں پتلا ڈال دیا گیا تھا۔ یہ مودے کا ہم پر پہلا احسان تھا کس نے ہماری رہائش کا عارضی بندوبست کر دیا تھا۔ وہ یاگل

ہے والے انداز میں اسے طوطے پر ہماری خدمت بھی کرنے لگا تھا۔ وہ اکثر ہم بہن بھائی کے لیے طرح طرح کی کھانے پینے کی چیزیں لے آتا تھا اور رات دیر تک ہمارے کوارٹر میں بیٹھا دیوانگی میں ایسا انا سیدھا ہونے لگا کہ اس کی دس باتوں میں سے ایک بات بھجھتی ہی تھی۔

اور محلے کے لوگ ہم دونوں بہن بھائی کو کوٹھری کے پاس دیکھتے تو ہم پر آواز دے سکتے بلکہ کچھ عورتیں مجھے کنواری ماں کہتی تھیں کیونکہ میری ماں کا وہ بچہ میری گود میں ہوتا تھا۔ میں لوگوں کے لیے ایک

تماش بین بنی تھی۔

ایک دن بعد وہ بچہ انتہائی بیمار ہو گیا تھا۔ وہ روئے جا رہا تھا۔ بچہ بات بے ہوشہ مجھ سے سنبھل نہیں رہا تھا۔ مودا اپنی کوٹھری سے چائے کی پتی لہال کر لے آیا تھا۔ اس سے بھی اسے کوئی آرام نہیں آیا تھا۔

رات تو میں نے بڑی مشکل سے گزاری جب صبح ہوئی تو میں نے گلے سے گزرتے لوگوں کی منتیں کرنا شروع کر دیں کہ مٹا رہا ہے۔ خدا کے لیے میری مدد کرو لیکن نہ جانے کیوں ان کے دل پتھر ہو گئے ہیں یا پھر وہ ٹھاکروں سے ڈر رہے تھے؟

انہوں نے میری بات پر کان نہیں دھرے۔ دیکھو ہر کوئی اتفاق سے محلے کا ہندو بڑا جواہر لعل میرے پاس آیا، اسے میں نے اپنا دکھ اور درد کرنا یا اور اس کے آگے آتھ جوڑ کر پیش کیا کہ خدا میرا یہ پیغام کس طرح بڑی ٹھاکرانی صاحبہ کو پہنچا دو کہ میں نے تمہاری

دل و جان سے خدمت کی ہے میں بہت پریشان ہوں میری گناہ گار ماں کا گناہ (بچی) مجھ سے اب سنبھل نہیں رہا۔ میری مدد کرو۔ خوش قسمتی سے جواہر لعل نے اپنی بیوی کے ذریعہ میرا پیغام بڑی ٹھاکرانی تک پہنچایا تھا۔

شام کے وقت نوری ٹھاکرانی حویلی کے دو نوجوان بچوں کے ہمارے چلتی ہوئی میرے پاس آئیں۔ انہوں نے جب ہم دونوں کے پاس پہنچے ہماری حالت دیکھی تو بہت پریشان ہو گئیں۔ ”مجھے تو بتلایا گیا تھا کہ تم دونوں اپنی خالہ کے پاس چکی گاؤں چلے گئے ہو کیا باہر آئے؟“

”بڑی ٹھاکرانی صاحبہ ہمیں ٹھاکر پرکاش سندھ نے کہا تھا کہ آپ نے اور سریشہ دیوی نے حویلی میں ہمارا داخلہ بند کر دیا ہے۔“

”یہ سراسر جھوٹ ہے۔ میں تو خود لاچار ہو کر

حویلی کے کچھوڑے میں پڑی ہوں۔ حویلی کے ٹھاکروں نے مجھے بوڑھا لاچار ناکارہ سمجھ کر ایک طرف مرنے کے لیے چھینک دیا ہے۔ شائستہ تم میرے ساتھ حویلی چلو اور اپنے کارڈز رہو۔ آج آنے دو پرکاش سندھ کو میں ان سے نمٹوں گی۔ ماں کے گناہ میں ان بچوں کا کیا قصور ہے؟ چلو شائستہ تم میرے ساتھ آؤ۔“

اپنی ٹھاکرانی مجھ سے یہ باتیں کر رہی تھیں بلکہ مجھے چھوٹی ٹھاکرانی سریشہ دیوی صفے میں بیٹھتی چلائی ہوئی آگئی۔ ”یہ نیاک“ کندے لوگ اور خاص طور پر یہ ناجائز بچہ کی قیمت پر حویلی میں نہیں آگے گا۔“

مودا جھلا پیچھے سے چلایا۔ ”بیگم صاحبہ یہ ناجائز بچہ حویلی کے اندر ہی کسی کا گناہ معلوم ہوتا ہے۔“

”کیا اس بندہ کو..... دوں گی تیرے منہ پر اگلے ہاتھ کا تھپھر.....“ سریشہ دیوی نے اسے ڈانٹتے ہوئے کہا۔

اب دونوں ٹھاکرائیوں میں بحث شروع ہو گئی تھی۔ بڑی ٹھاکرانی بھی کچھ کرنا سیکھ چکی تھی کہ اندر سے کیسے کی طرح اس کا کام کرے گی جبکہ سریشہ دیوی اندر سے کیسے کیسے قیامت پر بھی ان کے ناپاک قدم اندر نہ آنے دے گی۔ میں نے سریشہ دیوی کے آگے

ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا کہ ہمارا اس معاملہ میں کیا دوش ہے؟

”تو کبواس بندہ کرو.....“ وہ مجھے مارنے کے لیے دوڑی تو بڑی ٹھاکرانی نے آگے بڑھ کر اسے روک دیا۔ اس جھگڑے کے دوران ٹھاکر پرکاش اور میرم کمار دی باہر آ گئے۔

پرکاش کو دیکھتے ہی بڑی ٹھاکرانی نے ان پر چلائے ہوئے کہا۔ ”تم نے ان بچوں کو حویلی سے دور رکھنے کے لیے سریشہ دیوی کے ساتھ میرا نام

کیوں لیا؟“

”میں نے تمہارا نام مطلق لیا تھا“ ویسے مجھے سریشہ دیوی اور میرم کمار نے شائستہ اور تو صیف کو حویلی کے اندر قدم رکھنے سے روکا تھا۔ اگر یہ دونوں اپنے ناجائز بھائی کے ساتھ اس حویلی کے اندر قدم رکھتے تو نہ جانے کس کس کی بدنامی ہوئی اور لوگ بلاویہ باتیں مانتے۔ ”پرکاش سندھ نے اپنی چھوٹی بھتیجی کی طرف زاری کرتے ہوئے کہا۔

”یاد رکھو جو حویلی تمہاری نہیں بلکہ میرے باپ کی طرف سے چھین دی گئی ہوئی ہے۔ میں جاؤں تو تمہیں دیکھ دے کہ اس حویلی سے نکلا سکتی ہوں۔“

”تو مجھے بلیک میل کر رہی ہے۔“ پرکاش نے کہا۔

”میں تجھے خردار کر رہی ہوں کہ یہاں دھٹی نہیں انسان بن کر اور انسانوں کی قدر کرنا سیکھ۔“ بڑی ٹھاکرانی نے اسے معبودتے ہوئے کہا۔

سریشہ دیوی پھر آگئی۔ اس نے ٹھاکر پرکاش سندھ سے کہا کہ تمہیں طلاق دوا یا اس بڑی ٹھاکرانی کو فارغ کر دو۔ دونوں ٹھاکرائیاں آپس میں لڑنے لگی تھیں۔

ٹھاکر پرکاش سندھ اپنی جوان اور بوڑھی بیویوں کے درمیان چکی کے پاٹ کی طرح پس رہا تھا۔ اچانک سریشہ دیوی چلائی۔

”دور کراس گندری کے کھڑے کو.....“ اس نے میری گود سے بچہ چھین کر زمین پر پھینک کر کوشش کی لیکن میں نے اس بچے کو بڑی مضبوطی سے اپنے سینے سے لگایا ہوا تھا۔ نورنی ٹھاکرانی نے ان سب کو سمجھانے کی کوشش کی کہ اماں کی جانب سے کیے گئے گناہ میں تو صیف اور شائستہ کا کیا دوش ہے؟ آخر بڑی مشکل سے یہ فیصلہ ہوا کہ اس ناجائز بچے کو حویلی میں نہیں رکھا جائے گا۔

”کیوں؟“ میں نے چھوٹی ٹھاکرانی سے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔
”کنگو گندگی کے ڈھیر میں پھینکا جاتا ہے گھر میں جا کر نہیں رکھا جاتا۔ اس گندگی سے بڑھ پیدا ہوگی۔“

ابھی وہ یہ بات کر رہی تھی گاؤں کے مندر کا ایک پنڈت جس کے گھنے سر پر چھوٹی سی انگلی برابر چٹائی رکھ رہی تھی وہ حویلی کے دالان میں آیا ہوا ایک طرف خاموشی سے کھڑا ہو گیا۔ ٹھاکر پرکاش مندر نے مجھے کہا کہ شاکستہ اس بچے کو پنڈت کے حوالے کر دے۔

”کیوں؟“ میں نے اس سے سوال کیا۔
ٹھاکر نے غصے سے میری جانب دیکھتے ہوئے کہا۔ ”تم دو دن بہن بھائی اس صورت میں حویلی کے اندر آ سکتے ہو جب یہ بچہ تمہارے ساتھ نہ ہو۔ چل دے اسے پنڈت کے ہاتھ میں۔“
لوہی ٹھاکرانی نے بھی مجھے ایسا کرنے کے لیے کہا تو چار میں نے بچہ کو پنڈت کی طرف بڑھایا۔

پنڈت نے بچہ اپنے ہاتھوں میں لیا اور اسے چومتے ہوئے بولا۔ ”اب یہ بچہ چاندی گاؤں کے مندر کی صفائی کرتی اور خدمت کر کے اپنی ماں کے پاس واپس آئے گا۔“ وہ یہ کہہ کر بچہ اٹھائے فوراً حویلی سے نکل گیا۔

وہ بچہ چاہے بچا نہ تھا لیکن قاتلوں میری ماں کا۔ مجھے اس کے جانے کا بہت دکھ تھا۔ سارے لوگ وہاں کھڑے تھے۔

لوہی دیوی نے مجھے کہا۔ ”شاکستہ تو پہلی طرح حویلی میں آ کر میری خدمت کیا کرتی۔“
توصیف کے بارے میں ہم کمار نے یہ فیصلہ کیا کہ وہ سووے جیسے کے ساتھ ان کے اطمینان کے

جانوروں کی خدمت کرے گا۔ میں حویلی میں پہلی طرح بڑی ٹھاکرانی کی خدمت کرنے لگی تھی۔
میں نے بڑی ٹھاکرانی کا شکر یہ ادا کیا کہ انہوں نے ہم دونوں بہن بھائی پر ترس کھار نہیں دوبارہ حویلی میں بلایا تھا۔

حویلی کے باقی لوگ ہم سے زیادہ باتیں نہیں کرتے تھے۔ ایک دن بڑی ٹھاکرانی نے مجھے کہا تھا۔ ”اس حویلی کے تقریباً تمام مرد و زنانی شرتانی اور عیاش ہیں۔ لوگ شراب شارب کے سیاہ ہیں۔“
مجھے بھی موقع ملے تو یہاں سے بھاگ جاتا۔ ایسا نہ ہو کہ کہیں تیری جی عزت یہاں پالنا نہ ہو جائے۔“

کانی دن گزر گئے ایسا محسوس ہوتا تھا کہ زندگی میں ٹھہراؤ اور بہتری آگئی ہے۔ توصیف ہرم کمار کے اطمینان میں سارا دن کام کرتا۔ وہ رات کو کھانک بار کمرسو جاتا تھا۔ اس سے میری کوئی خاص بات نہیں ہو پاتی تھی۔ اور حویلی کے اندر کسی باہر کے فرد کو آنے کی اجازت نہ تھی۔ صرف ایک دو میلے دار یا ان کے برائے جانے پھانے والے آتے تھے یا حویلی والے سودا جھلاؤں میلہ اور مذاق وغیرہ کے لیے بھی بھی بلاتے تھے۔ حویلی کے کینکین بچے بوڑھے اسے سنتے سنتے انداز سے گھٹ کر تے تو وہ جمل کر انہیں گالیاں دیا کرتا تھا جس کا کوئی برا نہیں مانتا تھا۔

وقت اسی طرح گزر رہا تھا کہ میں نے محسوس کیا توصیف کی شخصیت اور اس کے رہن بہن کے طور طریقے میں ہندو نہ انداز پڑتا جا رہا ہے۔ وہ اپنے ہاتھ پر تھک لگا کر ”السلام علیکم“ کی جگہ ہاتھ جوڑتے پرام کھڑے لگا تھا۔ میں نے جب اس کے یہ ہندو طور طریقے دیکھے تو اسے ٹوکا۔
”یہ تو کیا کرنے لگا ہے؟ یاد رکھو ہم مسلمان ہیں اور مسلمانوں کے گھر پیدا ہوئے ہیں۔“

اس نے میری بات کا کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ میں کبھی بھارنما پڑھ لیتی اور قرآن شریف بھی پڑھ لیتی تھی لیکن وہ تو اسلام سے بالکل ہی بچکر گیا تھا۔ ایک دن سووے جیسے نے مجھے گھڑی میں آ کر بتایا کہ میرا توصیف کو روزانہ اس مندر میں لے کر جاتا ہے جہاں تیری ماں کا جنا ہوا ہے۔ یہاں سے وہاں کا پنڈت اسے ہندو مذہب کی جانب راغب کر رہا ہے۔ یہ میرے لیے ایک نئی پریشانی تھی۔

سووے کی بات سچ تھی۔ اس ہندو پنڈت نے نہ جانتے توصیف کو کیا چنی پڑھا کر کہ وہ اسلام سے بالکل ہی بے بہرہ ہو گیا تھا اور ہندو مذہب کو اپنا جا رہا تھا۔ میں نے توصیف کو اپنے آباؤ اجداد کا کالہ بدلنے سے روکا تھا لیکن وہ نہ مانا۔

میں مکمل ہندو نہ ماحول میں رہ رہی تھی۔ اب میرا آخری مسلمان سہارا بھائی کی ہندو بہن چکا تھا۔ میں نے بھائی سے ناراض ہو کر اپنی کنیا الگ کر لی تھی۔ جیسے اس سے نفرت اور خوف محسوس ہونے لگا تھا۔ توصیف اب سارا دن مندر میں رہتا تھا۔

ایک دن حویلی میں پوجا کی کوئی تقریب تھی۔ مندر کا پنڈت حویلی کے باسیوں کے درمیان بیٹھا ہوا تھا۔ نہ جانے کس قسم کی عبادت تھی؟ حویلی کے تمام باسی بار بار بھکوان کی موتی کے سامنے جا کر گنگے پر نام کرتے اور بچہ بہن وغیرہ پڑھتے تھے۔ توصیف بھی ان کے دھم میں رنگا بالنگل ان جیسا لگ رہا تھا۔ مجھے وہ اس طے میں بہت برا لگ رہا تھا۔ اس دن حویلی میں اس بھکوان پوجا کے دن مجھے بھی خصوصی طور پر بڑے بڑے پہنچائے گئے تھے۔ پہلے تو میں بھی کہہ کر حویلی والوں نے معمول کے مطابق میرے کپڑے بنوائے ہیں لیکن تھوڑی دیر کے بعد جب حویلی کے اندر باقاعدہ بھکوان پوجا شروع ہوئی تو سب سے پہلے پنڈت نے توصیف کو

اپنے پاس بلایا اور اسے اپنے پاس بڑی محبت اور عزت سے بٹھایا۔

کچھ وقت کے بعد اس نے بڑے غریب انداز میں کہا۔ ”توصیف نے اب اپنا اہرم چھوڑ کر ہمارا اہرم دل سے قبول کر لیا ہے لہذا آج سے اس کا ہندو نام مہن بن ہوگا۔“ میں نے یہ سطر دیکھا تو مجھے کچھ میرادل اچھل کر منکوحہ ہو گیا۔ میں دل ہی دل میں اس دن کو یاد کر کے رونے لگی جس مخصوص گھڑی ہمارے بے بس مجبور خاندان نے اس حویلی میں قدم رکھا تھا۔

پرکاش مندر نے مجھے بڑے پارے سے اپنے پاس بلایا اور مجھے کہا کہ سب کے ساتھ تم بھی ہندو پوجا میں بیٹھو۔ انہوں نے اتنی بڑی بات اسنے آرام سے کہہ دی کہ مجھے اپنے قدموں کے نیچے سے زمین سرکتی ہوئی محسوس ہوئی۔ میں گھبرا گئی۔

”آؤ بیٹی۔“ سریشہ دیوی نے مجھے کہا۔
”ارے آنا تو پوجا پر بیٹھ۔“ مرلی پرکاش نے اپنے ہندو انداز میں کہا۔

”نہیں۔“ نہیں۔ توصیف۔“ میں گھبراہٹ میں اناسیدھا ہالونے لگی۔
”آ۔۔۔ آ۔۔۔“ سریشہ دیوی مجھے اس پوجا میں بٹھانے پر بلند ہو گئیں۔

”نہیں۔“ میں مسلمان ہوں۔ میں بھکوان کی موتی کی پوجا نہیں کر سکتی۔“

میرے بھائی توصیف نے جو کہ ہندو ہو چکا تھا اس نے مجھے بھی پوجا کی طرف لانے کی کوشش کی تو میں نے خدا تعالیٰ سے یہی دعا کی کہ ”خدا! مجھے میرے ایمان پر ثابت قدم رہنے کی طاقت عطا فرما۔“

”جا۔۔۔ شاکستہ۔“ پنڈت نے کہا۔
”نہیں۔۔۔ میں نے پوجا نہیں کی۔ آنا۔“ میں

نے اس بارگاہی سے کہا۔

تو صیف نے غصے سے بچھے کہا۔ ”میں تجھے کبہ رہا ہوں میرے واسطے بیٹے میں تیرا بھائی ہوں۔“

میں نے ایک زوردار چٹا اس کے منہ پر بھرا۔

”تو میرا بھائی نہیں ہے اور نہ ہی اب تو صیف ہے بلکہ موہن ہے۔“

”خوفی رشتہ سے تیرا بھائی ہوں۔“

”تو اب ہندو ہو گیا ہے۔ تیرا میرا کوئی رشتہ نہ نہیں ہے۔“

پھر خاکہ پر کاش سندر میرے پاس آیا اور کہا۔

”سنگھان پوچا کی اس محفل کو بدعزہ نہ کرو۔ آ جاؤ بیٹی۔“ میں نے مسلسل انکار کیا تو مجھے ڈانٹنے ہوئے کہا۔

”جا۔۔۔۔۔ بھاگ یہاں سے۔۔۔۔۔“

میرے بھائی نے بھی میری تذلیل پر کوئی رد عمل نہیں کیا تھا۔ میں اپنی کھڑکی میں آ کر اپنی قسمت کو روئے لگی۔

رات کو تو صیف (موہن) کو خڑکی میں آیا اور کہا۔ ”میں اپنی مرضی سے ہندو مذہب میں داخل ہوا ہوں۔ اب یہی مرضی ہے مجھے بھائی کی مشیت سے قبول کرے یا نہیں کرے۔“

میں اُٹھی جگ جب حویلی میں نورنی خاکہ کرانی کی خدمت کے لیے گئی تو انہوں نے مجھے زور دہامیت نہیں دی تھی۔ وہ خاموشی سے مجھ سے اپنا چشم دروائی رہیں۔ ان کا منہ دیواری کی جانب رہا۔ انہوں نے مجھ سے کوئی بات بھی نہیں کی تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ حویلی کے دیگر کینوں کا رویہ بھی میرے ساتھ عجیب سا ہو گیا۔ تو صیف سے میری بول چال بندھی۔ وہ سارا دن سندر میں رہتا تھا اور اپنی زندگی میں مست تھا۔ اے مجھ سے کوئی نہ دیکھتا تھا۔

چند دنوں بعد خاکہ کر کے رشتہ دار کی شادی

جو ناگزیر میں ہو رہی تھی۔

حویلی والوں نے ایک ہفتہ کے لیے وہاں جانا تھا۔ اب حویلی میں مودا چھلا پیار تھا کرانی نورنی دیوی کی خدمت کے لیے ایک بڑی عمر کی درکرانی موجود تھی۔

حویلی کے کینوں کو جو ناگزیر گئے ہوئے ابھی تین دن ہوئے تھے کہ ایک رات میں کھڑکی میں گہری نیند ہو رہی تھی۔ تو صیف (موہن) رات کو ہی مندر چلا گیا تھا۔ میں نے نیند میں محسوس کیا کہ

میرے جسم کو دو تین مردوں نے بری طرح دبوچا ہوا ہے۔ سب سے پہلے تو انہوں نے میرے منہ پر ایک دوپٹہ کو گولہ بنا کر ٹھوسا اس کے بعد انہوں نے میرے ہاتھ پاؤں کی رسی سے باندھے۔ میں نے زور سے ہونک کر شروع کر دیا۔ خوش قسمتی سے

میرے پاؤں باندھنے والے نے مضبوطی سے نہیں باندھے تھے۔ میرے زور لگانے کی وجہ سے پاؤں کھل گئے۔ میں نے مزاحمت کرتے ہوئے ایک بندے کو اتنی زوردار مار دی کہ وہ زمین پر گر گیا۔

اس کے بعد میں نے جدوجہد کر کے ہاتھ پاؤں مارنے شروع کر دیے۔ اللہ کے فضل و کرم سے میرے منہ میں پھنسا مودا دبوچا کا گولہ بھی نکل چکا تھا۔

میں نے زور زور سے چلانا شروع کر دیا۔

”بچاؤ۔۔۔۔۔ بچاؤ۔۔۔۔۔“

استغ میں مودا چھلا نیند میں بوڑھا ہوا اپنے مخصوص انداز میں چلانا ہوا آیا۔ اس نے آؤ دیکھنا تاؤ ایک اینٹ اٹھا کر ایک فنڈے کے سر پر دے

ماری جبکہ میں ان فنڈوں کی گرفت سے چھوٹ کر زمین پر آگری تھی۔ نہ جانے میرے ہاتھ کیسے کھل گئے تھے میں نے اپنی آنکھوں پر بندھی پٹی ہٹا کر دیکھا کہ مودو چھلا ان فنڈوں سے جسم کھٹکھٹا کر لڑا ہے۔ وہ دو تھے ایک غالب کیا گیا تھا۔ مودے نے

ایک فنڈے کی گردن کو زور سے پکڑ کر اسے نیچے گرایا ہوا تھا اور ساتھ ساتھ چلائے جا رہا تھا۔

”شائستہ۔۔۔۔۔! اینٹ اٹھا کر نہیں بار۔۔۔۔۔“

میں فنڈوں کو دیکھ کر کھوکھلائی ہوئی تھی۔ بہر حال میں نے ایک اینٹ اٹھا کر مودے سے اچھے فنڈے کی کمر پر زور سے دے ماری۔ وہ اینٹ کھا کر میری جانب لگا تو میں نے حویلی کے دروازے کی جانب بھاگنے کی کوشش کی جو کہ بند تھا۔ میں نے زور زور سے حویلی کے بند دروازہ پر پانی پھینکا اور شروع کر دیں۔ شکر ہے تھوڑی دیر میں حویلی کی خادمہ نے دروازہ کھول دیا۔ وہ بھی مودے اور فنڈوں کی لڑائی کو دیکھ کر دم بخور ہو گئی۔ اس نے بھی زور زور سے اسے گالیاں دینا شروع کر دیں۔ اس شو میں ساتھ والے دو تین بڑی بھی آگئے تھے لیکن اس دوران ایک دل خراش واقعہ یہ اس کا اس قسم جسم کی دوران ایک فنڈے سے مودے کے پیٹ میں رام پوری چار کھونچ دیا تھا۔ پڑوسیوں نے آہیں

چڑھنے کی بہت کوشش کی لیکن وہ دونوں بڑی بھرتی سے بھاگ گئے۔

میں بڑی پیار خاکہ کرانی کے پاس جا کر ان سے چٹ کر دوئے لگی۔ وہ صبح طریقے سے چل نہیں سکتی تھیں۔ بہر حال وہ میرے سہارے چل کر آئیں تو

باہر کا منظر دیکھا۔ انہوں نے فین پر پڑے شدید زخمی مودے کو فوری طور پر ہسپتال لے جانے کو کہا اور مجھے کہا کہ تم فوری طور پر حویلی کے اندر آ جاؤ۔ اتنے

میں زخمی مودے کو ہسپتال پہنچا دیا گیا۔

میں جب حویلی کے اندر واپس آئی تو روتی ہوئی تھی تو بڑی حویلی کے مجھے کہا۔ ”آئی اور ابھی اس حویلی سے بھاگ جا۔ تیرا یہاں اب کچھ نہیں بچا ہے تیرے ماں باپ دونوں کو حویلی نکل گئی ہے۔ دوسری طرف تیرا آخری سہارا بھائی کو کٹھا کر کے

ایک سازش کے تحت ہندو بنایا ہے۔ میری زندگی کا اب کوئی مجبور نہیں ہے۔ آج تجھے ماحولم بدعاشوں نے اٹھانے کی کوشش کی ہے کل نہ جانے تیرے ساتھ کیا ہونے لگا۔“

”لیکن کہاں جاؤں؟ ہم لوگوں کا یہاں کوئی جانتے والا نہیں ہے۔“

”جی۔۔۔۔۔ جن کا کوئی نہیں ہوتا ان کا اوپر خدا۔۔۔۔۔ سنگھان تنگہاں ہوتا ہے۔“ خاکہ کرانی نے کہا۔ انہوں نے اپنی خادمہ کے ذریعے بڑیوں کے ایک ریز جو ان شگلے کو بلوایا۔ وہ آیا تو خاکہ کرانی نے اس کے ہاتھ پر 20 روپے سونے کے لاکٹ کر کے رکھے اور کہا۔ ”اس لڑکی کو ابھی مسلمان اتا دینتر مدر اس پہنچاؤ۔“

”میں اپنے صحن مودے سامیں اور بھائی تو صیف (موہن) کو لے بغیر نہ جاؤں گی۔“ میں نے کہا۔

”بس فوراً پہلی جاؤ اور پلٹ کر نہ دیکھنا کیونکہ یہاں پیچھے اب تیرا کچھ نہیں بچا ہے۔“ پھر انہوں نے شگلے کو کہا۔

”بار کو مٹی۔۔۔۔۔ اگر تجھ میں ذرا مگر انسانیت ہے تو سنگھان کے واسطے سے منزل پر پہنچاؤ۔“

مگنا خود بدعاش قسم کا تھا۔ مجھ سے بھی ڈر لگ رہا تھا لیکن میں اس کے ساتھ تھی۔ میں مگنا بدعاش کے ساتھ ہسپتال میں دہاں مودا شدید زخمی حالت میں تھا۔ موت کا فرشتہ اس کی روح قبض کرنے کے انتظار میں تھا۔ میں نے اس کے پاؤں چھو کر دوئے ہوئے اپنی جان بچانے کا شکر ہے ادا کیا۔ اس نے انتہائی کرب کے عالم میں میرے سر پر ہاتھ پھیرا اور مرے مرتے مجھے کہا۔ ”شائستہ خدا تیری حفاظت کرے تو بس یہاں سے بھاگ جا۔“

ایک سازش کے تحت ہندو بنایا ہے۔ میری زندگی کا اب کوئی مجبور نہیں ہے۔ آج تجھے ماحولم بدعاشوں نے اٹھانے کی کوشش کی ہے کل نہ جانے تیرے ساتھ کیا ہونے لگا۔“

”لیکن کہاں جاؤں؟ ہم لوگوں کا یہاں کوئی جانتے والا نہیں ہے۔“

”جی۔۔۔۔۔ جن کا کوئی نہیں ہوتا ان کا اوپر خدا۔۔۔۔۔ سنگھان تنگہاں ہوتا ہے۔“ خاکہ کرانی نے کہا۔ انہوں نے اپنی خادمہ کے ذریعے بڑیوں کے ایک ریز جو ان شگلے کو بلوایا۔ وہ آیا تو خاکہ کرانی نے اس کے ہاتھ پر 20 روپے سونے کے لاکٹ کر کے رکھے اور کہا۔ ”اس لڑکی کو ابھی مسلمان اتا دینتر مدر اس پہنچاؤ۔“

”میں اپنے صحن مودے سامیں اور بھائی تو صیف (موہن) کو لے بغیر نہ جاؤں گی۔“ میں نے کہا۔

”بس فوراً پہلی جاؤ اور پلٹ کر نہ دیکھنا کیونکہ یہاں پیچھے اب تیرا کچھ نہیں بچا ہے۔“ پھر انہوں نے شگلے کو کہا۔

”بار کو مٹی۔۔۔۔۔ اگر تجھ میں ذرا مگر انسانیت ہے تو سنگھان کے واسطے سے منزل پر پہنچاؤ۔“

مگنا خود بدعاش قسم کا تھا۔ مجھ سے بھی ڈر لگ رہا تھا لیکن میں اس کے ساتھ تھی۔ میں مگنا بدعاش کے ساتھ ہسپتال میں دہاں مودا شدید زخمی حالت میں تھا۔ موت کا فرشتہ اس کی روح قبض کرنے کے انتظار میں تھا۔ میں نے اس کے پاؤں چھو کر دوئے ہوئے اپنی جان بچانے کا شکر ہے ادا کیا۔ اس نے انتہائی کرب کے عالم میں میرے سر پر ہاتھ پھیرا اور مرے مرتے مجھے کہا۔ ”شائستہ خدا تیری حفاظت کرے تو بس یہاں سے بھاگ جا۔“

ایک سازش کے تحت ہندو بنایا ہے۔ میری زندگی کا اب کوئی مجبور نہیں ہے۔ آج تجھے ماحولم بدعاشوں نے اٹھانے کی کوشش کی ہے کل نہ جانے تیرے ساتھ کیا ہونے لگا۔“

”لیکن کہاں جاؤں؟ ہم لوگوں کا یہاں کوئی جانتے والا نہیں ہے۔“

”جی۔۔۔۔۔ جن کا کوئی نہیں ہوتا ان کا اوپر خدا۔۔۔۔۔ سنگھان تنگہاں ہوتا ہے۔“ خاکہ کرانی نے کہا۔ انہوں نے اپنی خادمہ کے ذریعے بڑیوں کے ایک ریز جو ان شگلے کو بلوایا۔ وہ آیا تو خاکہ کرانی نے اس کے ہاتھ پر 20 روپے سونے کے لاکٹ کر کے رکھے اور کہا۔ ”اس لڑکی کو ابھی مسلمان اتا دینتر مدر اس پہنچاؤ۔“

”میں اپنے صحن مودے سامیں اور بھائی تو صیف (موہن) کو لے بغیر نہ جاؤں گی۔“ میں نے کہا۔

”بس فوراً پہلی جاؤ اور پلٹ کر نہ دیکھنا کیونکہ یہاں پیچھے اب تیرا کچھ نہیں بچا ہے۔“ پھر انہوں نے شگلے کو کہا۔

”بار کو مٹی۔۔۔۔۔ اگر تجھ میں ذرا مگر انسانیت ہے تو سنگھان کے واسطے سے منزل پر پہنچاؤ۔“

مگنا خود بدعاش قسم کا تھا۔ مجھ سے بھی ڈر لگ رہا تھا لیکن میں اس کے ساتھ تھی۔ میں مگنا بدعاش کے ساتھ ہسپتال میں دہاں مودا شدید زخمی حالت میں تھا۔ موت کا فرشتہ اس کی روح قبض کرنے کے انتظار میں تھا۔ میں نے اس کے پاؤں چھو کر دوئے ہوئے اپنی جان بچانے کا شکر ہے ادا کیا۔ اس نے انتہائی کرب کے عالم میں میرے سر پر ہاتھ پھیرا اور مرے مرتے مجھے کہا۔ ”شائستہ خدا تیری حفاظت کرے تو بس یہاں سے بھاگ جا۔“

جھیل مچلو



ننگ کا دریا

لمحہ محبت ہزاروں کا خیال

ہم نے جینے کی سزا کاٹی ہے
کیسے گزرا یہ سفر، جانے دو

ایک ایسی ماں کی کہانی جس نے بیس برسوں کا کرب جیلا تھا

چلی منزل پہ خوشی کی دھوک بچ رہی تھی۔
میرے بیٹے کی شادی تھی لیکن میرے دل میں سالوں
کا غبار بھرا ہوا تھا جو ہر کھٹکے کو بے قرار تھا۔ بیس
جور درمیں نے سہا ہے وہ ایک دم کس طرح بھولا
جائے؟ ان بیس برسوں میں میں بل میں روتی ہوں
جانے کتنی راتیں میں نے خواب کزناری جین
کرنے کا ایک طوفان میں نے جھپٹا ہے اور کتنی ہی
بار گہرا کبر موت کو گلے لگنے کی کوشش کی ہے لیکن ہر



یہ کہتے ہی وہ مر گیا۔ مجھے اس وقت لگا جیسے میرا سگا
بھائی مجھ سے جدا ہو گیا ہو۔
پھر میں مندر گئی تو وہاں تو صیف (موہن) اپنی
عبادت میں مصروف تھا۔ اسے میری آمد کا علم ہوا تو
وہ میرے پاس آ گیا۔
”یہاں کیوں آئی ہو؟“
”سنگے نے کہا۔“ تو یہاں بھگوان کی پوجا کر رہا
تھا۔ وہاں آج تیری بہن کی عزت لٹ جاتی.....“
”کیا کہا؟“ اس نے چلا تے ہوئے کہا۔ ”میں“
اسے زندہ نہیں چھوڑوں گا جس نے میری بہن کی
عزت پر ہاتھ رکھا ہے۔“
”تو کس سے لڑے گا؟ تیری بہن پر جن
بد معاشوں نے ہاتھ ڈالا تھا؟ وہ نامعلوم تھے.....“
سنگے نے کہا۔
میں نے تو صیف کے آگے ہاتھ جوڑے کہ
خدا کے واسطے تو واپس اپنے مذہب میں آ اور
میرے ساتھ مدراس چل لیکن تو صیف نہ مانا۔
میری تمام التجائیں بے کار ثابت ہوئیں۔ وہ جس
سے سن نہ ہوا۔ ٹھاکروں اور مندر کے پندتوں
نے اسلام کی جانب سے اس کا دامغ آتھا تنگ کر
دیا تھا کہ اس نے اپنا مذہب تبدیل کرنے سے
صاف انکار کر دیا۔
”سنگے نے مجھے کہا۔“ یہ اس کا ذاتی معاملہ ہے تو
چل۔“
”تو صیف نے کہا۔“ میں دوبارہ اسلام قبول نہیں
کروں گا لیکن ایک منٹ..... تو مندر کی بیڑیوں پر
نظر بند ابھی آتا ہوں۔“
میں اور منکا جیسے اس کا انتظار کرنے
لگے۔ مجھے اندیشہ تھا کہ وہ مندر میں موجود ہندو
فٹنڈے نے آئے لیکن وہ اپنی دہائی میں میری ماں کا
ناجاڑ پچے لے آیا جو کہ گہری نیند میں تھا۔ اسے میری

مدراس میں اللہ کے فضل و کرم سے ہمیں ایک
ایسے نیک دل عالم وین شخص ملے۔ انہوں نے اس
بچے کا نام سارہ رکھا۔ ہم کچھ ماہ مدراس کے اس
سینٹر میں رہے اور جب پاکستان آیا تو اُن عالم وین
نے مجھے اور بچے کو ایک نیک دل و فیملی کے حوالے کیا
اور یوں ہم ملتان آ گئے۔ میں نے سارہ کی تعلیم و
حریت و دینی تعلیمات کے مطابق کی۔ میں نے
اسے معاشرے میں اسے عزت دار مقام دلوانے
کے لیے دن رات محنت کی۔ اسے پڑھا لکھا کر
پروفیسر بنایا اور اس کی خاطر میں نے زندگی بھر
شادی نہیں کی۔

میں آج بھی ایسے محسن مودے جیسے کو اور مسند
بڑی مشاکراتی کے احسانات کو یاد کرتی ہوں۔ خدا ان
دلوں کی رزقوں کو ہمیشہ بخشتا رہے لیکن میں یہ راز نہ
جان سکی کہ میری ماں کے بلبل سے پیدا ہونے والا یہ
بچہ کس عیاش شخص کی نشانی تھا؟
شائستہ بیگم اپنی سرگزشت ساگر خاموش ہو گئی
جس میں گمران کے چہرے کی جبریوں کی ایک ایک کیر
چچہ چیخ کر کہہ رہی تھی کہ جن انگاروں پر چل کر انہوں
نے زہیت کا سر پر ہونے پالے کیا تھا وہ کوئی ہنس مکھ
نہیں بلکہ بڑے بوسے کا نام تھا۔

بارماں کا دیکھی چہرہ نگاہوں کے سامنے آ جاتا تھا۔ ماں بیٹیوں کے دکھ مشترک ہوتے ہیں اور بیٹیوں کے دکھ تو ویسے بھی ماؤں کو رلاتے ہیں۔ اب ماں نہیں ہے اور نانی جذبات کا طوفان شاید اسی لیے زندگی میں ایک ٹھہراؤ سا آ گیا تھا مگر بیس سال بعد آج پھر جذبات ابل رہے ہیں۔ مجھے تو خوش ہونا چاہیے کہ میری پیاسی مستی سچا پاب ہونے جا رہی تھی کہ میرے گھر میں میری اپنی سگی بیٹی بہو کی صورت آنے والی تھی اور میری آنکھوں کے سوتے جو درد و کوشش ہو چکے تھے وہ پھر سے ہرے پورے تھے۔

پہلی منزل پہ میرے محلے والیوں کا ایک شور تھا؟ قہقہوں اور تالیوں کا شور ڈھولک پر شادی کے گانے گائے جا رہے تھے اور میرے ذہن میں پچھلے بیس برس کے واقعات کسی قلم کی طرح چل رہے تھے۔

.....

میری پھوپھو اور ای ایک دوسرے کی نندیں بھی تھیں اور بھابھیاں بھی۔ وٹے ٹٹے کی یہ رسم برسوں سے ہمارے خاندان میں چلی آ رہی تھی۔ یہ وہ سٹہ میری دادی کی مرضی سے ہوا تھا۔ پھوپھو کی بالکل بھی مرضی نہ تھی کہ ان کی شادی ماموں سے ہو۔ اسی وجہ سے وہ ہمیشہ ناخوش رہیں۔ اس کے برعکس میرے ای بابا اپنی زندگی میں بہت خوش تھے۔

ہم دو بہنیں تھیں اور پھوپھو کے ایک بیٹی اور ایک بیٹا تھا۔ پھوپھو چونکہ اپنی شادی سے مطمئن نہیں تھیں اس لیے زیادہ تر میکے میں ہی رہتی تھیں۔ ہمارا کوئی بھائی نہیں تھا اور ہماری شدید خواہش تھی کہ ہمارا بھائی بھی ہو پھر تقریباً سات سال بعد ہمارا بھائی پیدا ہوا جس کا نام تنویر رکھا گیا۔ بھائی کو پا کر ہم بہت خوش تھے۔ اسی دوران ای کو شہر میں ٹیچری مل گئی اور ہم شہر آ گئے۔ بابا نے بھی اپنی کچھ زمین بیچ کر ایک

چھوٹا سا گھر اور گھر کے قریب ہی دکان بھی لے لی اور اس طرح ہم شہر میں ہی رہنے لگے۔

زندگی معمول کے مطابق گزر رہی تھی کہ ایک بھونچال آیا۔ بابا کا روڈ ایکسپرنٹ میں اشتعال ہوا تو غموں کا ایک پہاڑ ہم پر ٹوٹ پڑا دکھ کتنا ہی بڑا کیوں نہ ہو وقت سب سے بڑا امر ہم ہوتا ہے اور اسی امر ہم سے ہم یہ کم جھیل گئے۔ ہم تو بچے تھے مگر امی کے ساتھ تو یہ غم آ سیب کی طرح چٹ گیا تھا اور وہ آ سیب تھا ہماری دادی جو اٹھتے بیٹھتے ہی پر طنز کے تیر برسائی رہتی تھیں کہ پہلے تو کڑی کا بھانہ کیا اور میرے بیٹے کو بہلا چلا کھر لے آئی مجھ سے دور کیا اور اب اسے کھائی..... اب تو کلچر ٹھنڈا ہو گیا؟ میں تو کہتی تھی یہ لوگ منحوس ہیں پھر بھی میری سنا کون ہے؟ اب یہ ماں بیٹیاں (یعنی ہماری ای اور نانی) اور کتنی نحوست پھیلائیں گی؟ ایسی باتوں سے امی کا چہرہ کرب کی تصویر بن جاتا تھا۔ امی کے ساتھ ہم جب بھی گاؤں جاتے تو ایسی باتیں سننے کو ملتیں۔ آخر ہم بچوں نے ماں کو گاؤں جانے سے روک دیا۔ جب ماں کہتیں گاؤں چلیں پھوپھو سے ملنے تو ہم منع کر دیتے کہ اگر دادی کو ہماری یاد آئے گی تو وہ خود آ جائیں گی۔ دادی شہر آئیں تو ای کا جینا دو بھر ہو جاتا۔ دادی طعنے تشنے دیتیں۔ ای بڑی صابر عورت تھیں انہوں نے کبھی پلٹ کر دادی کو جواب نہیں دیا۔ جب دادی چلی جاتیں تو گھر میں سکون ہو جاتا۔

ای اب ہماری ماں بھی تھیں اور باپ بھی۔ ہماری بہتر تعلیم اور پرورش ای کا اہم مقصد تھا۔ ہم تینوں بھائی بہن ہر سال اپنی جماعتوں میں امتیازی نمبر لے کر کامیاب ہوتے رہے۔ زندگی اسی طرح اپنی ڈگر پر چل رہی تھی کہ میری زندگی کے سمندر میں پہلا تھر پڑا اور پھلچل ہونے لگی۔

ایک روز ہم لوگ کالج سے واپس آئے تو دیکھا

ہلی گھر میں ایک چھوٹی سی دعوت کیے بیٹھی تھیں۔ وہ اکمل سے ہاف ٹائم میں ہی آگئی تھیں۔ دعوت کا یہ اعلام انہوں نے اس لیے کیا تھا کہ بہت دنوں کے بعد ماموں آئے تھے ویسے تو وہ کبھی نہ بھی آ جاتے تھے لیکن نانی اماں کے انتقال کے بعد تو ان کا آنا اصل ہی ختم ہو گیا تھا۔ اب اتنے سالوں کے بعد ان کے اچانک آنے سے میری ماں بہت خوش تھیں۔

لوٹل تو ہم بھی بہت تھے اپنے کزن حماد اور ماموں کے آنے سے چاہے اپنوں سے لاکھ شکوے ہوں لیکن اپنوں کے ساتھ مل کر بیٹھنا اچھا لگتا ہے۔ اس دن ہم تینوں یعنی مجھے، تویر اور نجمہ کو بہت اچھا لگا اور ہمیں وقت کا بالکل پتہ نہیں چلا کہ باتوں باتوں میں کب شام ہوگئی۔ ماموں جب جانے کے لیے اٹھے تو ای اداس ہونے لگیں۔

ماموں نے ان کی اداسی دیکھتے ہوئے کہا۔ ”اب تو آنا جانا لگا رہے گا۔ تم لوگوں نے تو اب ضرور گاؤں آنا جاس اتوار کو۔“

”انشاء اللہ ہم ضرور آئیں گے۔“ امی نے کہا اور پھر اکثر ہم گاؤں جانے لگے۔ ہم بھی اپنوں کی بہت کے بھوکے تھے پھوپھو، دادی اور دوسرے شہنے داروں سے مل کر خوشی ہوتی تھی۔ میں نے اس وقت کو یاد کیا تھا کہ حماد کی نظر میں میرا چھچھا کرتی رہتی تھی اور میں اُن نظروں کا مطلب خوب سمجھتی تھی اس لیے میرے لبوں پر بھی ایک خاص مسکراہٹ رہنے لگی تھی۔

اس دن اتوار تھا۔ امی کو ہلکا بخار تھا۔ وہ ٹیلیفٹ لکڑی میں تھیں۔ ہم لوگ اپنے معمول کے کاموں میں مصروف تھے۔ میں کپڑے پرپس کر رہی تھی۔ گھر خالی میں لگی ہوئی تھی اور تویر امی کا سر دبا رہا تھا کہ لیل بھی۔ تویر نے دروازہ کھولا اور نعرہ لگا تا ہوا

قائد کا فرمانا تھا یہ

کام سے ہرگز جی نہ چرانا

ترقی کی راہوں پہ جانا

لیکن ہم نے شروع کیا ہے

چھٹی کلچر..... بڑا ٹال کلچر..... شکفتہ شفیق

”ماموں جان آئے ہیں اور ساتھ میں حماد بھائی بھی ہیں۔“ وہ ہنستا ہوا آ رہا تھا۔ سب مسکرانے لگے۔ امی اٹھ کر بیٹھ گئیں۔ ماموں مٹھائی لائے تھے کیونکہ حماد نے انیسٹرنگ کا امتحان اچھے نمبروں سے پاس کیا تھا۔ وہ لوگ شام تک رہے۔ گھر میں رونق مچ گئی رہی۔ حماد سچیدہ لڑکا تھا مگر آج اس کی آنکھیں بہت کچھ کہہ رہی تھیں۔

رات کو جب سب سونے کے لیے چلے گئے اور میں کچن سمیٹ رہی تھی تب امی نے میرے پاس آ کر کہا تھا۔ ”بیٹا عانتہ! آج بھائی جان نے تمہارا ہاتھ مانگا ہے۔ تمہیں تو اس رشتے پر کوئی اعتراض نہیں ہے نا؟“ امی میری طرف دیکھنے لگیں۔

”امی! جو آپ مناسب سمجھیں۔“ میں نے سر جھکاتے ہوئے جواب دیا۔ امی نے میری پیشانی چومی اور چلی گئیں اور میں حماد کے بارے میں سوچنے لگی۔

پھر ایک بہار بھری شام میں ماموں اور ممانی آئے اور مجھے حماد کے نام کی انگوٹھی پہنا گئے اور بدلے میں ماموں کی بیٹی جو کہ بارہ برس کی تھی اور میرا بھائی تویر جو ابھی نیا نیا فرسٹ ایئر میں آیا تھا اُن کی بھی بات چلی ہوگئی۔ یہ کوئی نئی بات نہیں تھی ہمارے خاندان میں دئے شے کا یہ رواج برسوں سے تھا۔ حماد جوں ہی برسرِ روزگار ہوا ہماری

شادی ہو گئی۔ حماد کی محبت اور ماموں کی شفقت میں زندگی بہت حسین ہو گئی تھی البتہ میری ممانی جو کہ میری سگی چھٹی بھی اُن کا رو بہ میرے ساتھ سرد مہر تھا لیکن میرے دل میں ان کے لیے کوئی برائی بات نہ تھی اسی لیے میں ان سے محبت اور ران کی عزت کرتی تھی اور دل و جان سے سب کی خدمت بھی کرتی تھی لیکن پھر میری ماں کے دل میں جگہ نہ باقی تھی۔

دو سال اسی طرح گزر گئے اُن دور ران میرے کوئی اولاد نہیں ہوئی تھی۔ پہلے تو چھو پھو بے لطفوں میں طعنے دیتی تھیں کہ اب تو انہوں نے صاف صاف کہا شروع کر دیا تھا کہ مجھ سے لکھ کر لے لو یہ ماں نہیں ہے۔ تیسرا سال بھی اسی طرح سرک گیا اور کوئی امید نہ رہی۔ اس اثنا میں خود براؤ ٹیپ کی شادی کی تاریخ بھی طے ہوئی اور کمر میں شادی کے ہنگامے شروع ہو گئے اور میں بھی اپنے کمر اور سبکی اسی کے کمر رہنے لگی۔ بھائیوں کی شادی کا بھجوں کو بہت ارمان ہوتا ہے ہماری خوشی کا بھی ٹھکانہ نہ تھا۔

ہم اپنے اکلوتے بھائی کی شادی کے ارمان لگا لگی تیار کیاں کر رہے تھے اور پھر وہ مبارک دن بھی آیا جب ٹوپیہ ہمارے بھائی تنویر کی دہن بن کر ہمارے آئین میں آئی اور وہ دونوں خوش خوش خرم زندگی گزارنے لگے۔ اسی بھی بہت خوش تھیں۔ دن گزارنے پر یہی نہیں چلا۔ جب امی کی دادی بننے کی خبر ہمارے کمر پہنچی تو چھو پھو نے طنز کرتے ہوئے کہا کہ میں تو یہ حسرت قبر میں لے کر جاؤں گی کہ اپنے ہوتے پوتیاں دیکھوں اور میں آؤں بجا کر وہ مٹی۔ بھلا میرے بس میں کیا تھا؟ سب میرے مالک کا اختیار ہے۔

ایک دن دادی نے مجھے بلایا اور کہا۔ ”دیکھو جیٹا اگر تم اولاد نہیں جانتی تو مجھ سے کہہ دو میں راجہ کو

سمجھا دوں گی۔“ دادی کے اس طرح پوچھنے پر تو میرا دل ہی رہ گیا۔

”دادی! آپ ایسا سوچ رہی ہیں؟“ میں نے پوچھا۔

”ہاں کیونکہ تمہاری اماں بہت چالاک ہے۔“ میں نے کہا۔

”نہ میرے کمر سے بھی بھاگ آئی اور نہ کسی اور خدا کے حضور گڑا کرتی۔“ کچھ دنوں بعد ٹوپیہ نے ایک خوب صورت بچے کو جنم دیا۔ ہماری خوشیوں کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔ بچے کا نام شہاب رکھا گیا۔ خوب مناسبات باپ کی گئیں۔ امی میرے کمر بھی مٹھائی لے کر آئیں۔ شام کو جب وہ جا کر نکلیں تو چھو پھو نے کہا۔ ”میرے حماد کی بھی اولاد ہو جانی چاہیے۔“ سمجھا دیا۔

”یہ میرے بس میں تو نہیں ہے اور کیا میں نہیں چاہتی کہ زبیدہ ماں ہے؟“ امی نے جواب دیا۔

دادی نے کہا۔ ”تیری چالاکیاں تو میں اچھی طرح جانتی ہوں۔ پہلے تو نے میرا بیٹا مجھ سے چھین لیا تھا۔ پتے پتوں کی شکل دیکھنے سے ترسایا اور اب میری بیٹی کو بھی بیٹے کی اولاد دیکھنے سے ترسار رہا ہے۔“

”یہ خدا کی طرف سے کوئی آزمائش ہے۔ میری بیٹی کی نیت میں کوئی کھٹ نہیں ہے۔“ امی نے دعا سے کہا اور زہد ہی لوٹ گئیں۔

اب چھو پھو اٹھٹے بیٹھے مجھے طعنے دینے لگے۔ ”باجھ ہو اور میں اللہ کے حضور گڑا کرتے کہ سو اکیس سو تھی؟ ماموں اور حماد ہی میرا بھارتا ہے۔ چھو پھو اور دادی دونوں ہی جیسے سوتیلوں جیسا سلوک کرتی تھیں۔

ایک رات ماموں ایسا سوئے کہ پھر کبھی

ہوئے۔ ان کے جانے سے میرے دکھوں میں اضافہ ہو گیا کیونکہ ماموں میری ڈھال تھے اب وہ بھی نہ رہے تو چھو پھو کو نہ کئے والدہ امی کوئی نہ تھا۔ دادی اور چھو پھو دونوں سر جوڑے بیٹھی رہیں۔ میں باوجود محنت کرنے کے اُن کو بالکل نہ بھائی تھی۔ حماد کی بے کام کی وجہ سے دو دو دنوں ساٹھ پر ہوتے بلکہ کمر کی تحفہ کی وجہ سے اب تو وہ ہفتہ ہفتہ آتے تھے۔ ایسے ہی دن گزر رہے تھے کہ دادی بھی گزر گئیں۔ کمر میں خاموشی رہتی۔ چھو پھو نے مجھ سے کہا کہ اب ہی چھوڑ دی۔ میں پھر بھی ان کی جی جان سے خدمت کرتی تھی۔

اُن دن میں بچن میں کام کر رہی تھی۔ حماد آئے اور میں نے اور دوسری کی جواب دیتے ہوئے جن میں مجھے تھوڑی سی چھو پھو بھی بیٹھی تھیں کہ انہوں نے حماد سے کہا۔ ”ٹوپیہ کے ہاں اب دوسری بار اولاد ہونے والی ہے۔ میں تو یہ آرزو کرتے کہ تمہارا بچہ ابا کی طرح کمر میں چلی جاؤں گی۔“ اور روئے نکلیں۔

”یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں امی؟ خدا نہ کرے۔“ حماد نے پریشانی سے کہا۔

”اور کیا تم میرے بیٹے توڑ دی ہو جو ہمیں میرا دل لال ہو۔“ چھو پھو نے روئے ہوئے کہا۔

”امی! آپ کو کیا ہو گیا ہے؟“ حماد نے چھو پھو کا ہاتھ چومتے ہوئے کہا۔

”اگر ایسا ہے تو تم دوسری شادی کر لو۔“ چھو پھو نے صاف صاف کہہ دیا۔

”کمر امی!۔“ حماد حیرت سے ماں کو دیکھنے لگا۔

”امی! زبیدہ! میری بیوی ہی نہیں۔“ آپ کی بیٹی بھی تو ہے؟“

”میں باجھ بیٹی کا کیا کروں؟ اور پھر تم میرے اکلوتے بیٹے ہو؟“ یہ باتیں سن کر میں تو جیسے بالکل لٹ پڑ گئی۔

دوسرے دن حماد پوٹھی پر چلے گئے۔ اب میں خدا سے خوب بلک بلک کر دعا میں لگتی۔ میری اور حماد کی لمبر پرورش بھی بالکل درست تھیں۔ امی نے بھی میں وغیرہ خوب مانگی تھیں۔

ایک رات میں اپنے رب کے حضور بہت گڑا کرتی تھی۔ ”اے اللہ! تو میری آزمائش ختم کر دے اور میری گداز اپنے پیارے محبوب کے صدمے“ پھر دے میرے مولانا میں روتے روتے جاہ نماز پر ہی سو گئی۔ خواب میں دیکھا کہ سفید فراق میں لمبوں ایک بہت ہی پیاری بیٹی میری گود میں ہمک رہی ہے۔ جب اُنکھ کھلی تو دل پر بے بسی سرشاری تھی۔ دوام روم میں ایک ملیت کا احساس تھا حماد آئے تو میں نے انہیں بھی اپنا خواب بتایا۔

انہوں نے مجھے گلے لگاتے ہوئے کہا۔ ”خدا ہمیں ضرور اولاد کی خوشی دے گا اور میں کوئی حیدانہ نہ کہے گا۔“ میں نے دل ہی دل میں اُن کی بات پر آمین کہا اور پھر اسی ماہ ڈاکٹر نے مجھے ماں بننے کی نوید دی۔ اب جب ٹوپیہ دوسرے بیٹے کی ماں بنی تو میری گود بھی بھر گئی۔ چھو پھو سمیت سب کو دہری خوشی ملی۔ ٹھیک نو ماہ بعد میری گود میں ایک پیاری سی بیٹی پئی۔ اُس کا نام عائشہ زہرا رکھا گیا۔ چھو پھو بھی پوٹی کے ساتھ نکل گئیں اور ہمارے گھر میں خوشیاں ڈیرے لگائیں۔ مجھے خود کے بیٹے آئے اور ہماری عائشہ کو تو قلی زبان میں باتیں کرنے تو کہہ کر آگے بھی سکرانے لگا۔ میں سوچتی۔ بچوں کے بغیر تو زندگی بالکل بے مزہ تھی۔

اب حماد مذاق میں کہتے۔ ”اب دوسرا بچہ بھی ہو جاوے گا چاہے وہ نہ میں خدا واسے کہہ دوں گا میری دوسری شادی کرادیں۔“ میں انہیں آٹھیں دکھائی اور دھڑکتے سے سکرادیے۔

زندگی ای طرح خوشیوں کے ہنڈولے میں گزر رہی تھی مگر میری قسمت میں ہر خوشی کا ایک خراج کھانا تھا۔ اب جو نقد میرے مجھ سے مذاق کیا اس نے تو مجھے تو ذکر کھدایا۔

اس دن حمام نے فون کر کے بتایا کہ آج میں آ رہا ہوں۔ میں نے ان کی پسند کا کھانا بنایا، خود تیار ہوئی عاشق کو تیار کیا اور ہم ان کا انتظار کرنے لگے۔ دوپہر کے وہ آ جاتے تھے مگر دوپہر سے شام ہو گئی تھی فون بھی نہیں لگ رہا تھا۔ پھر پھر بار بار مجھ سے پوچھتیں۔ میں ان سے پوچھتی کہ فون ملایا؟ یہ نہیں کیوں میرا دل گھبرانے لگا تھا۔ سہ پہر کے وقت تو میرا دل لپے لگا آیا اور کہنے لگا کہ ساد بھائی کا فون آیا تھا کہ تمہیں اور پھر پھر کولے آؤں۔ میں حیران ہوئی کہ کیا باتیں ہیں اب اس کی۔

”جی جی تازہ کیا بات ہے؟“

”میں نے بے قراری سے پوچھا۔“

”کوئی بات نہیں ہے راستے میں حماد بھائی کا معمولی سا ایکسڈنٹ ہو گیا ہے۔“

”تو میرے کیا؟“

”کیا!!!!“

پھر پھر اور میں ایک ساتھ چیخے۔

”گھبرانے کی کوئی بات نہیں..... خدا خیر کرے گا۔“ ہم جلدی جلدی تو میرے ساتھ روانہ ہوئے اسپتال پہنچے تو حماد کو شہید چیمیں لگی تھیں۔ انہوں نے پھر پھر سے بس دو دھنیں لپٹی پھوٹی ہاتھ میں کیں اور دم خدا کے حوالے کر دیا۔ ہم پر تو قہر تھا۔ ٹوٹ پڑیں۔ اس دکھ کو لفظوں میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔ بہر حال حماد کا چالیسواں ہو گیا۔ رورور ہماری آنکھوں سے آنسو خشک ہو گئے تھے۔ کتنے کتنے تھا تو زندگی ختم ہو گئی ہے مگر زندگی کا پیہر جتنا رہتا ہے۔ مرنے والوں کے ساتھ مرنا نہیں جاتا۔ زندہ لوگ کھانا

کھاتے ہیں کپڑے بھی پہنتے ہیں اور دنیا داری بھی بھاتے ہیں بس دل کی رنجی بھجانی ہے۔ نقد میرے میری زندگی میں تو اب شاید تم ہی غم لکھ دیا تھا۔ چالیسویں کے بعد پھر پھر سے تو میرے کہا کہ میری بی بی نہیں جائے گی تمہارا ساتھ۔ اب بی بی نہیں کو لے گا اور جا کر اپنی اماں کے پاس رکھو۔ تو میرے بھی بحث نہیں کی کہ پھر پھر کا دکھ بڑا تھا اس لیے میں اپنی عاشق کے ساتھ اسی کے گھر آ گئی تھی۔ تو میری اپنی سرال میں رہنے لگا اور ہفتے آتا تھا مگر اس کی آمد کا وقت بڑھ گیا اور وہ سینے بعد آئے لگے۔ اسی نے کبھی شکایت نہیں کی اور میں بھی مبرا کرنے کی تلقین کرتیں۔ گھر میں عاشق کی وجہ سے روٹی نہ تھی، وہ میرے جینے کی ادھک اور زندگی کی خوشی تھی لیکن نقد میرے ترش میں ایک تیر بانی تھا جو کہ میری زندگی کی ناسور بنا گیا۔

ناسور پھر اب بھی کبھی میرے گھر آنے لگی تھیں اور چند دن روٹی بھی تھیں۔ ہم خوش تھے کہ شاید پھر پھر کو بھی قرار آ گیا ہے۔ وہ عاشق کے ساتھ کھیتی رہیں۔ عاشق تو ملی زبان میں دادی سے باتیں کرتی تو میری روح تک شرار ہو جاتی۔

”ایک دن پھر پھر نے کہا۔“ مجھے بازار سے کچھ چیزیں کتنی ہیں کھنے دو کھنے میں داپس آ جاؤں گی۔ تمہارے لیے کیا لاؤں چترا؟“ انہوں نے تو کتنی سے کھیتی عاشق سے پوچھا۔

”ملے لیے اسی ڈوڈی لانا۔“ عاشق نے تو کتنی زبان سے کہا۔

”اس جیسے؟“ انہوں نے عاشق کی گڑیا کی طرف اشارہ کیا۔

”میں نہیں۔“ اسے بھی اتھی۔

”عاشق بولی۔“

”ایسا کرو تم بھی ساتھ چلو میں جنہیں ایک خوبصورت فراک میں دلا دوں گی اور گڑیا بھی۔ تم خود

پسند کر کے لے لیتا۔“ پھر پھر نے کہا۔

”میں پھر پھر.....! یہ آپ کو کھک کر گی۔“

میں نے کہا۔

”ارے نہیں اولاد کا تنک کرنا بھی اچھا لگتا ہے۔“ انہوں نے ڈلارے کہا۔ ”چلو جلدی سے اسے تیار کر دو قریب ہی تو جانا ہے۔“

پھر پھر کوئی فکر تو تھیں نہیں جو مجھے اعتراض ہوتا۔ وہ عاشق کی دادی تھیں۔ میں نے عاشق کو نیا فراک پہنا کر تیار کیا۔ وہ ڈیڑھ گھنٹہ پہن کر ریل کی۔ میں نے نظروں نظر میں اس کی بلا میں لیں۔ وہ میری بی بی اپنی دادی کے ساتھ چلی گئی۔ میں جلدی جلدی گھر کا کام چھاننے لگی۔ امی اور بہن اسکو مل گئی ہوئی تھیں۔ کھانا بنانے کے بعد میں آرام کرنے لگی۔ امی وغیرہ بھی اسکو لے داپس آ گئیں۔ آتے ہی عاشق کا پوچھا۔

”وہ ذرا پھر پھر کے ساتھ شاپنگ کے لیے بازار تک گئی ہے۔ کھانا کھال دوں؟“ میں نے پوچھا۔

”میں نہیں۔ تمہاری بی بی آ جانے تو مل کر کھاتے ہیں۔“ ایک گھنٹہ گزرا۔

تب مجھے نے فکر سے کہا۔ ”کتنے سچے سچے ہیں محترمہ؟“

”پھر پھر ایک آکھ نہ بھائی میں امی نے اسے تیرے نظروں سے گھرا۔“

”وہ..... میں جیسے ہوں گے۔“ میں نے بھی فکر مند سی جواب دیا۔

”اب چار بج رہے ہیں کیا سارا کراچی خیر سی کی؟“ قریب ہی تو بازار ہے؟“

”مگر بڑا بڑا ہے۔“

”ابھی شام ہوئے کتنی کچھ پھر پھر کا کون سا پتہ نہ تھا۔ اب تو ہم کو فکر ہوئی تھی۔ کراچی کے حالات کا پتہ نہ چلتا تھا۔ کہا کیا ہو جائے۔ جب اندھیرا چھانے لگا تو میں نے رونا شروع کر دیا۔ امی

نے فون کر کے سب جگہ معلوم کیا وہ کسی عزیز کے گھر نہیں تھیں۔ ویسے بھی ہمارے فون سے زیادہ عزیز تھے..... تو پھر اور پھر پھر دونوں کے فون آف جا رہے تھے۔

”مجھے تو شروع سے پھر پھر اچھی نہیں لگتی تھیں۔“

”مگر بڑا بڑا ہے۔“

”مگر رات میں اسے ڈانٹنے جا رہی تھیں اور میں نے تو اب باقاعدہ میں شروع کر دیا تھا۔“

”دیکھو چپ ہو جاؤ اس طرح روتے دھونے سے کچھ نہیں ہوگا۔ خدا کو یاد کرو اے خدا کہ وہ خیریت سے ہوں گے۔“ امی مجھے سمجھانے لگیں۔

”خیریت سے ہی ہوں گی وہ بڑی بی بی کس میں پریشان کر کے تیار کیا نہیں تھیں ملتا ہے۔ ساری زندگی انہوں نے ہمیں تنگ ہی تو کیا ہے۔ پھر پھر ہیں ہماری۔“

”مگر بڑا بڑا ہے۔“

”امی نے اسے کھر کا تو وہ میری بی بی اندر کر کے میں چلی گئی۔ اب مغرب کا وقت بھی گزرا تھا اور عشاء کی آذان ہوئی تھی۔ ہم نے نماز پڑھی۔ روتے، گڑ گڑاتے، سوتے، جاگتے رات گئی۔

صبح چلی بس سے گاؤں بھاگے۔ دوپہر کے قریب وہاں پہنچے تو کھر کو لا کر کھ کر میں تو وہیں کر پڑی۔ سب رشتے دار بڑی بی بی ہو گئے۔ امی اور بھجے نے مجھے سنبھال دیا۔ ہوش آنے کے بعد روتے روتے میری تو آواز نہ بگھٹی تھی۔ گاؤں میں سب پھر پھر اس حرکت پر حیران تھے اور خبر کی دعا میں مانگ رہے تھے۔ عزیز اجاب سب ہمیں تیلیاں دے رہے تھے۔ ابھی شام ہوئے کچھ پھر پھر کا کون سا پتہ نہ تھا۔ اب تو ہم کو فکر ہوئی تھی۔ کراچی کے حالات کا پتہ نہ چلتا تھا۔ کہا کیا ہو جائے۔ جب اندھیرا چھانے لگا تو میں نے رونا شروع کر دیا۔ امی

شاید اسی لیے مجھے اور برکت بھی کم ہو گئی ہے۔ وہیں ہمیں یہ پتہ چلا کہ تنویر کا تاجدار دوسرے شہر میں ہو گیا ہے اور وہ کچھ سامان اور چار سالہ مہتاب کا ساتھ لے گیا ہے۔ خدا خدا کر کے تنویر کا ٹمبر ملا تو یہ جان کر جرت کا بھٹکا کہ اس کا تو تاجدار ہوا ہی نہیں ہے وہ کراچی میں ہی ہے مہتاب کے ساتھ۔ اس نے سب احوال سننے کے بعد کہا کہ میں فوراً نکلتا ہوں۔ مجھ پر تو بے ہوشی کے دورے پڑنے لگے۔ اسی مجھے کرائے کی گاڑی میں گاؤں سے واپس گھر لے آئیں۔ مجھے اسپتال میں داخل کروایا گیا۔ مجھے جب بھی ہوش آتا عائشہ.....! عائشہ.....! کہتی۔ وہیں پندرہ دنوں میں طبیعت کچھ مستحکم اور ڈیجانر ہو کر گھر آ گئی۔ تنویر اداری کی دونوں نے چٹھی لی ہوئی تھی۔ اخباری ڈی ریڈ پر یو ریکسٹا شہزادہ دیئے لیکن پھر پھوٹا اور فوج کا کوئی پتہ نہ تھا تنویر کو تو اس بات کی جرت تھی کہ وہ پتہ نہ ملے گا۔ اسے کچھ نہیں بتایا تھا اور خود بھی تو چار سال کا مہتاب چھوڑ گئی تھی۔ کیا اسے اپنے بچے کی پابندی سنائی؟ ہمارے پاس ان سب سوالوں کا کوئی جواب نہ تھا سوائے اس آجین بھرنے اور رونے کے.....!

وقت کسی کے لیے نہیں ٹھہرتا سو میرے دن بھی گزرنے لگے۔ تنویر نے مہتاب مجھے سونپے ہوئے کہا کہ اسے عائشہ کی جگہ لے لو۔ تمہاری موت کو کچھ نہ کچھ تسلی ہو جائے گی اور میں بھی چپ چاپ خالی خالی نظروں سے اُسے دیکھتی رہی گی۔ زندگی اپنی ڈگر پر چلنے لگی۔ اداری اسی ٹمبر پڑھنا نہ کھانے لگیں۔ تنویر اپنی ڈیوٹی پر لوٹ گیا۔ میں اور مہتاب گھر میں ہوتے۔ وہ بہت سادہ سادہ نہ رہتا تھا۔ کبھی نہیں کرتا تھا بلکہ اگر میں چپ چاپ لگتی ہوئی تو میرا سر دبا کر میرے آس پاس ہی رہتا۔ میرے ساتھ ہی سوتا اسی وجہ سے میرا دھیان

جمع کر دیتی تھی۔ اسکول میں میری ترقی ہوتی رہی۔ مہتاب بھی سال بے سال قد اور پڑھائی میں بڑھتا رہا۔ کسی اس نے باپ کے ساتھ جانے کی بات نہیں کی بلکہ میں نے بھی کہا تھا تو کہا کہ میں آپ کو چھوڑ کر گئیں جاؤں گا مایا جان۔ اور میں سرشار ہو جاؤں گا کہ میری سبھی خوشی تھی۔

ایک دن اسی ہی میرا ساتھ چھوڑ گئیں۔ تنویر آیا۔ چالیسواں کر کے چلا گیا۔ میں نے بھی وہ گھر نہ بھر چھوڑ دیا۔ مجھ اور مہتاب کو لے کر دوسرے شہر آ گئی۔ ایک سال بعد پھر بھی اچانک ہی ساتھ چھوڑ گئی اور میں تنہا رہ گئی۔ مہتاب جو کربا انجینئرنگ کے پہلے سال میں تھا میرا بہت خیال رکھنے لگا تھا۔ وہ ہاسل میں رہتا تھا تاہم جگہ کے بعد میرے ساتھ رہنے لگا۔ وہ بہت فرماں بردار پڑا تھا۔ وہی تو میری زندگی کا حاصل تھا۔ عائشہ تو اب تک بن کر مرنے لگی تھی۔

کئی دنوں سے میں نوٹ کر رہی تھی کہ مہتاب کے چہرے پر ہر وقت جھلکتی مسکراہٹ چھٹی رہتی تھی۔ میں چاہتے تھے کہ وہ اسی حال سے سوچ رہی تھی کہ مہتاب بانیگ کی چابی کھاتا ہوا آیا اور کہنے لگا۔

”مام.....! میں ذرا ایک دوست سے ملنے جا رہا ہوں آپ دروازہ دھاک کر کھینچے گا۔“
”بہت خوش لگ رہے ہو اور بڑے اہتمام سے تیار ہوئے ہو۔ کیا کوئی خاص دوست ہے؟“ میں نے مسکراتے ہوئے اس سے پوچھا۔

”ہاں مام“ کبھی آپ کو بھی ملوایا گا۔“
”فردوس ضرور۔“ میں نے جتنے ہاتھ گیٹ لاک کیا سب وہ انکر اپنی دوست کی ہاتھ سے بڑے شوق سے کھاتا تھا اس کا نام ستارہ تھا وہ اسے اپنے دوست کی شادی میں لی تھی اور مہتاب اسے دیکھتے

ہی دل ہار بیٹھا تھا۔
”ستارہ وہ ایک چھوٹا بھائی اور ایک بڑی بہن ہے جو کہ کسی اسکول میں پڑھاتی ہے۔“ مہتاب نے اس کے بارے میں بتاتے ہوئے کہا تھا۔
”پاپ.....“ میں نے سوالیہ نظروں سے اُسے دیکھا۔

”جینوں نہ بھی ستارہ نے بتایا نہ میں نے کبھی پوچھا۔“ مہتاب نے کہا۔
پھر امتحانات کی وجہ سے کئی مہینے چپکے سے بیت گئے۔ پہلے میرے اسکول میں سالانہ امتحانات پھر اس کا رزلٹ شیٹ کی تیاری پھر کئی کلانڈر اور پھر گرماں بھگتیں گرمیوں میں اترا چلی تھی۔ کسی طرف دھیان نہیں جاتا تھا۔

اس دن اتوار تھا میں قاریغ تھی۔ اسکول کے کاموں سے نہات ملی تھی، بس جینوں کا کچھ کام رہ گیا تھا۔ گرمیوں کی چٹپٹاں ہونے والی تھیں۔ میں ابھی تنہا کر نر نہیں ہو کر نکلتی تھی۔
”یہ نیچے کمر کس چائے۔“ مہتاب نے دوکپ رکھتے ہوئے کہا۔ ”میں اپنی مام کے لیے اپنے ہاتھ سے بنا کر لایا ہوں۔“
”شکر ہے۔ مای کہاں ہے؟“ میں نے پیار سے اُسے دیکھتے ہوئے کہا۔

”وہ دوپہر کا کھانا بنا رہی ہے۔“ مہتاب نے جواب دیا۔ ”مام اگر آپ کہیں تو میں آج ستارہ کو انوائٹ کر لوں شام کی چائے پر؟“
”ہاں ہاں“ کیوں نہیں۔“ میں خوش ہو گئی۔
ہر ماں کو بیٹے کی شادی کا ارمان ہوتا ہے مجھے بھی تھا۔

پھر کرب شام ہوئی۔ پتہ بھی نہ چلا۔ ستارہ سے ملنے کا بھتہ بہت اشتیاق تھا اس لیے میں لان میں بیٹھی سر ہا انتظار تھی۔ بار بار نظریں گیٹ کی طرف

اٹھ جاتی تھیں۔ مہتاب انہیں لینے گیا تھا اور میں نے
بچانے کی کوشش کی۔
انتظار کی گھڑیاں کھیں اور کار آ کر گیت پر کی۔
میں گیت کی طرف بڑھی۔ کار میں سے مہتاب اور
ایک اٹھارہ بیس سال کی لڑکی اتری۔ وہی ستارہ
تھی۔
”ستارہ! یہ میری ماں ہیں۔“ مہتاب نے
تعارف کر لیا۔ وہ گرم جوش سے کئی پھر ہم سے مل کر
چائے پی لیں۔ میری نظر اس کے چہرے سے
ہٹ ہی نہیں رہی تھی۔ مجھے ایک عجیب کشش
اُس میں محسوس ہو رہی تھی۔ اُس کے جانے کے بعد
میں نے بے چین رہی تھی۔
”مام! ستارہ کیسی لگی آپ کو؟“ مہتاب
نے مجھ سے پوچھا۔
”بہت ہی پیاری ہے۔“
”اوہ! شکر ہے مام۔!“ مہتاب مجھ سے لپٹ
گیا۔ میں نے بھی اُسے چوما۔
ایک شام گرمی اور صبح بھی بہت تھا۔ میں کھڑکی
سے لاکھ کو دیکھ رہی تھی کہ مہتاب آ گیا۔
”مام! اچیلے! باہر چلنے ہیں۔ اُس کریم
کھانے کو بھی چاہ رہا ہے۔“
”جہنمیں تم جاؤ۔“ میں نے کھنکھائی سے کہا۔
ہم نے اُس کریم کھانے کو لائیک ڈرائنگ تو موز
اور موسم دونوں تبدیل ہو گئے۔ خوشگوار ہوا چلنے لگی
تھی۔ رات ہونے لگی۔ مہتاب نے پھل اور مٹھائی
لے کر گاڑی میں رکھی۔
”انتا کچھ تو کھالیا ہے یہ سب۔۔۔؟“ میں نے
حیرت سے پوچھا۔
”مام! ہم ستارہ کے گھر جا رہے ہیں۔“ اُس
نے کہا۔ چہرے پر خوشی کا رنگ نمایاں تھا۔
”لیکن اس طرح اچانک۔۔۔؟“ میں ہچکچاتی۔

”اچھا! آپ کا موز نہیں تو کینسل۔۔۔۔۔“ اُس کا
چہرہ ہنسنے لگا۔
”نہیں! بات نہیں ہے۔“
”تو پھر چلے نا۔۔۔۔۔“ وہ اصرار کرنے لگا۔
”ٹھیک ہے بیٹا۔۔۔۔۔ چلو!“ میں نے مسکراتے
ہوئے کہا۔
”جیو مام۔۔۔۔۔!“ اُس نے نعرہ لگایا۔ کینشن
میں چابی کھائی۔ راستے بھر وہ ستارہ کے بارے میں
بتاتا رہا اور میں سنی رہی۔
”ستارہ کے ابو فوت ہو چکے ہیں۔ وہ چار بہن
بھائی ہیں۔ اُن ہی بہن منجھر ہے۔ ایک چھوٹی بہن اور
بھائی ہے۔ مام گھر پر کپڑے وغیرہ بیٹنی ہیں۔“ ابھی
اُس کی باتیں جاری تھیں کہ گاڑی ایک چھوٹے سے
گیت پر رکی۔ اب میں نے ارد گرد دیکھا کہ کوئی کئی
آبادی تھی۔ کچھ مکان بن رہے تھے، کچھ بے ہوئے
تھے آبادی بھی کم تھی۔ میں گاڑی میں بیٹھی رہی۔
مہتاب نے تیل دی تو ایک نو عمر لڑکے نے گیت کھولا
اور مہتاب کو دیکھ کر گیت سے ہٹ کر کھڑا ہو گیا۔ میں
بھی گاڑی سے اتری اور مہتاب نے پھل وغیرہ اٹھا
لیے تو تک ستارہ بھی گیت پر آ گئی اور میں اندر
لے گاڑی روانہ کر دی۔ اُس نے ہٹائی۔ اُن کے دوران
پتہ چلا کہ ستارہ کی اُمی اور بڑی بہن کبھی شادی کی
تقریب میں نہ ہوئی ہیں۔
”اگر یہ ہوتا تو لوگ آ رہے ہیں تو میں
انہیں روک لیتی۔“ ستارہ نے چپٹی آنکھوں کے
ساتھ مہتاب کو دیکھتے ہوئے کہا۔ وہ اسے دیکھ کر مسکرا
رہا تھا۔
”کوئی بات نہیں! بس اچانک ہی موز بن گیا۔
خیر! تمہاری اُمی سے پھر بھی مل لیں گے۔“ میں نے
کہا۔ اسی وقت ایک لڑکی چائے کی ٹرے تھامے
داخل ہوئی۔

”السلام علیکم۔۔۔۔۔“ اُس نے سلام کیا۔
”وعلیکم السلام!“ میں نے جواب دیا۔
”یہ میری چھوٹی بہن رخشہ ہے۔ یہ مرکز میں
ہے۔“ ستارہ نے تعارف کر دیا۔ یہ نہیں کیوں
رخشہ کو دیکھ کر میرے دل پر عجیب سا بھاری پن
چھانے لگا کیونکہ اس کی ہنسی اچھی سمجھے پھوپھو کی
یاد دلانا رہا تھا۔ میں زیادہ دیر بیٹھنے کی بجائے بی گئی۔
پھر لانا پی پانی ہونے لگا تھا۔ یہ دیکھ کر وہ بھی گھبرا
گئیں اور ہم گھر چلے آئے۔
”مام! آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی تو بتانا تھا
نا۔“ مہتاب پریشان ہو رہا تھا۔
”بس تھوڑا آرام کروں گی تو ٹھیک ہو جاؤں
گی۔“
”مام! آپ کو عاشر یاد رہی ہے نا؟“ اُس نے
اچانک پوچھا۔ میں اُسے دیکھتی رہی اور اذیت
میں مبتلا رہی۔ ”اگر وہ ہوتی تو۔۔۔۔۔“
”اُسے تو۔۔۔۔۔؟“ میں نے سوچتے ہوئے کہا۔
”میں اُسے تمہاری ذہن بتائی۔“ میرے سبب میں
دکھتا ہوا تھا۔
”یہ بات ہے تو انشاء اللہ ضرور بولے گی۔“
”اور ستارہ۔۔۔۔۔!“ میں بولی۔
”آپ سے زیادہ مجھے بھی عزیز نہیں۔“
اُس نے میری کوشش سرکھدی۔
”میری جان۔۔۔۔۔! میرے بچے۔۔۔۔۔!“ میں
ہلکی ہوئے لگی تھی۔
اگلی صبح بھی میں اسکول نہیں جا سکی اور مہتاب
بھی گھر پہنچا۔ ایسا اکثر ہوتا جب میری طبیعت ٹھیک
نہیں ہوتی تو وہ بھی چھٹی کر لیتا اور سارا دن میری
خدمت کرنے اور میرا دل بہلانے میں لگا رہتا۔ طبیعت کافی
سانسنا کر مجھے شہنااز رہا۔ شام تک میری طبیعت کافی
بہتر ہو چکی تھی۔ مہتاب باہر گیا وہاں تکمیل جتنے پر

عزل

آؤ سفر کی شام کوئی فیصلہ کریں
لے کر خدا کا نام کوئی فیصلہ کریں
آؤ کہ ہم تعین منزل کریں ابھی
یہ کیا کہ کام کام کوئی فیصلہ کریں
آؤ کہ توڑ ڈالیں انا کا بھرم ابھی
بس ہے غم کی شام کوئی فیصلہ کریں
ہم آج ہی سے چھوڑ دیں جھتیں بری
سب کو کریں سلام کوئی فیصلہ کریں
حسنِ فنا کے ہاتھ سے کوئی نہیں بچا
کس کو یہاں دوام کوئی فیصلہ کریں

محسن سلیم

شہید کی کہانی

چار روٹن کا دفاع کرینوالے شہیدوں کے حوالے سے ایک دلگذاڑ سوج

منزہ بہام مرزا



علامہ اقبال کی پر داغ خیال

شہادت ہے مطلوب و مقصود مومن

نہ مال غیرت، نہ کشور کشائی

قوم کو حیات بخشنے والے شہیدوں کی سوج برفی ایک دلگذاڑ سوج

بہت سارے دن گزر گئے امیدو آس کے درمیان.....! اپنوں سے بچھڑنے کا دکھ کیسا ہوتا ہے، کبھی نظر نہ آنے کا خوف کیسا ہوتا ہے مجھ سے بہتر کون بچھ سکتا ہے۔ ہاں یہ بھی جانتے ہیں کہ میں بہت اچھی جگہ پر ہوں گریہ بھی توجہ ہے کہ جن سے دور ہوا، جن سے بچھڑا وہ بھی بہت پیارے تھے۔ میں نیلے آسمانوں سے جب انہیں الٹی یاد میں جھپکے پچکے آسوا بتا رہا تھا تو دل بہت دکھتا تھا۔ میری بیوی نے میرے جانے کے بعد پھر بھی راتیں کپڑے نہیں پہنے، کالج کی چوڑیاں بھی نہیں پہنیں، مہندی سے انھوں پر گل بوٹے نہیں بنائے۔ سارا دن سر پر سفید دپدہ اوڑھے کمرے کا مومن میں ابھی رات کی اور رات میں طبی فائلز کو سینے سے لگا کر بولے بولے سکتی۔ کتنی عیدیں آئیں اور چلی گئیں پر اس کے سر سے وہ سفید اوڑھنی نہ ہٹتی۔ میں تو بہت خوش ہوں بہت اچھی جگہ ہوں پر میری بیوی نے بہت سخت وقت گزارا۔ رنگ خروشاں، لٹھی جیسے تینوں سے اس کی لڑائی ہوئی تھی۔ وہ بھی غلط نہیں تھی میں اس کے سر کا سامن تھا اس کی ذہال اس کی چادر اور چادر پوری سب کچھ تو میں تھا، میں یہ نہیں رہا تو وہ بے چارہ کیا کرئی؟ شریط جب ماں سے بٹے سنے اور جوتوں کے لیے ہاتھ تباہ اس کی بخت کی آکھیں جھللائے نکلیں۔ وہ بے بس تھی۔

ہم لوگوں کی زندگی بھی بڑی عجیب ہوتی ہے زندہ ہوتے ہیں تب بھی گھر والوں سے دربار جب واقعی میں دور ہو جاتے ہیں تب بھی گھر والے بیک بیک لگتے انھوں سے یاد کرتے ہیں، بس ہم اپنے پیاروں کو خط لکھ کر انکار دیتے ہیں لیکن سب سے بڑھ کر تو میرا تھا وطن کی خاطر جیاد اور وطن کی خاطر ہی جان دی۔ میں خوش ہوں، مطمئن ہوں، فاطمہ بیٹی نے کمر میں خوش شریط لپیٹ لی ماں کا بہت خیال کرتا ہے۔

مشکل وقت گزر گیا لیکن مشکل وقت کہاں گزرا؟ 07 اپریل 2012ء کو ایک بار پھر کئی خاندانوں پر

طوفان تھا تو گلے گھوٹے ہوئے اور ٹوہیر میرے قدموں میں پھٹی معافان باگ رہی تھی۔

اس نے بتایا: ”بھوپو نے نہ جانے کب یہ پلان بنایا تھا.....“ وہ بھی نہیں کسم تمہاری ماں بہت چالاک ہو اور وہ اپنے بیٹے کی جدائی میں بڑی جتنی ایک طرف وہ تھیں جس کی اولاد کے کسم میں بتایا جاتا تھی

میں اور یہ سب کچھ مجھے بھی نہ بتایا گیا۔ اگر بتا جاتا تو میں متباب کو توڑ کر ساتھ بھی نہ بچتی۔ ہم اتنی دور چلے گئے تھے کہ وہاں سے آنا مجھ اکیلی عورت کے لیے ممکن نہ تھا۔ میں نے بھی تو اپنے بیٹے کی جدائی کا بے بسی میں پل پل روئی ہوں جانے میرا بیٹا کیسا ہوگا؟ لیکن تمہارا دکھ میرے دکھ سے بڑا ہے۔ میرے پاس میری بیٹی سارا اور یہ عالم جو کہ میری کوکھ میں تھا، بعد میں پیدا ہوا تمہاری بھوپو قانع کا غضب سہہ کر چل گئیں۔ آخری وقت میں وہ تمہیں یاد کر کے اپنے گناہوں کی معافان لکھی رہی تھیں۔ ”تو یہ دور بھی“

”یہ رہا تمہارا بیٹا متباب!“ میں نے متباب کو اس کے سامنے کر دیا۔ ”توہیر نے یہ مجھے دے دیا تھا۔ اس نے دوسری شادی کر لی ہے۔ وہ یو کے میں ہے۔“

ساروں کی جدائی، متباب کا دروازے گھوٹے، ماب آسودگی کی صورت میں بہہ رہے تھے ہم سب رو رہے تھے کہ آسودگی میں دلوں کو دھونے کی طاقت ہے۔ یہ کون کون کر دیتے ہیں اور آکھیں صاف و شفاف ہو کر کمرے لگتی ہیں۔ میں نے سب کو دل سے معاف کر دیا تھا کیونکہ معافی میرے آپ کی مفت ہے۔ آگ کا نور یا یاد کر کے مجھے آج اتنی خروشاں ملی ہیں۔ آپ کو دکھا دے کہ خدا ان خوشیوں کو قائم و دائم رکھے (آمین!)

ماں نے آکھ کیا کہ ستارہ اور اس کی امی آئی ہیں۔ وہ چار لوگ ہیں۔

”ہائیں ڈرائنگ روم میں بٹھاؤ، میں آتی ہوں۔“ ماں کی گئی۔ میں نے اٹھ کر واٹس روم کا رخ کیا۔

ڈرائنگ روم میں قدم رکھنے ہی میں ساکت سی رہ گئی۔ سامنے صوفے پر بیٹھی عورت کو بھلا میں کیسے بھول سکتی تھی؟ میں سال کی دھول پڑنے کے باوجود میں نے ٹوہیر کو پہچان لیا تھا اور وہ بھی مجھے دیکھتی کی دیکھتی روئی تھی پھر اٹھ کر مجھ سے لپٹ گئی تھی اور رونے لگی تھی۔ وہ مجھے چوم رہی تھی۔ بچے حیران پریشان سے کھڑے تھے۔ اس دوران متباب بھی آچکا تھا۔ میں نے جھکے سے خود کو ٹوہیر سے چھڑایا۔ میں اُس وقت ختم اور عالم دونوں کیفیتوں سے دوچار تھی شاید میں کرنے کی تھی۔ متباب نے مجھے قہار کو صوفے پر بٹھا دیا۔ میری سردمہری کو ٹوہیر نے بھی جیسے محسوس کر لیا تھا اور وہ سب خاموشی سے مجھے دیکھ رہی تھی لیکن میرا ذہن تو سامنے سامنے کرا رہا تھا، کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا کیا کہوں؟ کیا نہ کہوں۔

ٹوہیر پھر اٹھی اور ستارہ کو میرے سامنے لاتے ہوئے بولی۔ ”یہ..... یہ..... دیکھو۔ یہ تمہاری بیٹی عائشہ ہے جسے میں نے اپنے بچوں سے بھی زیادہ پیار دیا ہے۔ میں تمہاری مجرم ہوں مجھ سے بے شک نہ ہو لیکن اپنی اپنی کوتاہیوں سے لگا لو۔“ میں نے ستارہ کی طرف دیکھا۔ وہ حیرت سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ میرے اندر جیسے یکدم کلا جوا لکھی ہو کر اٹھا اور میں نے اٹھ کر اسے سینے سے لگا لیا اور دیاؤں کی طرح اسے پیار کرنے لگی۔ اب آسو بہانے کی باری میری تھی۔

”میری بیٹی.....! میری عائشہ.....! میری جان.....!“ میں پکار کر رہی جب جذبات کا



آپ بیتی یہ کج بیتی سنانے والے آپ کے اور کارگردمیان ہی موجود ہیں

نفسہ فضل



گیا دہاں میں

مہنازب خان کا خیال

نہ خبر ہو دل یہ ہر ای رہے
ہیں ہی آنسوؤں کو پیا کرتے ہیں

اس غیب عورت کا قصہ حواما جیسے مقدس رشتے کی توہین تھی



قیامت گزر گئی۔ 139 سپاہیوں برف کے نیچے زندہ دب گئے۔ اُن کے گھر والے امیدوار کے درمیان متعلق..... زندہ لوٹے تو غازی اور نہ لوٹے تو شہید گردل چکے سے کہتا ہے کہ ”آ جاؤ“ ابھی مت جاؤ چھوڑ کر زندگی کا سفر بہت طویل اور بہت کھٹن ہے۔ دھوپ بہت شدید سر کے سائیں میرے پایاؤں پر لا ڈالے بیٹے! ہمیں پتہ ہے تمہیں پاکستان سے بہت پیار ہے مگر ہمیں بھی تو تم سے پیار ہے آ نکلیں تمہیں دیکھنے کو تڑپتی ہیں پھر پتہ نہیں چلتے کیا سوچا ہو گا؟ ہاں کی آغوش چاہی ہوگی۔ باپ کے بچکے بچکے کانہ سے دروازے کی آڑ میں مٹی کی انگی قھاسے کھڑا وہ لے ہو لے کا پتا وجود زندگی سے بھر پور نہیں سب بہت یاد آئے ہوں گے۔ بچپن سے جوانی تک کاسٹریکٹوں میں لگا ہوں کے سامنے سے گزرا ہو گا۔ اپنے بہت یاد آئے ہوں گے۔ لکھوں میں حضور نے اپنی آغوش میں لے لیا ہو گا۔ چھٹی آنکھوں اور دیکتی پیشانیوں نے استقبال کیا ہو گا۔ رضوان نے دروازہ کھولا ہو گا۔ برف سے نکل کر کھلی فرش پر قدم رکھیں گے۔ ہر جانب پھول ہوں گے خوشبو ہوگی رنگ برنگ تیلیاں ہوں گی۔ دہاں سے زمین والوں پر تلاش کرنے والوں پر پیار بھری نظر ڈالی ہوگی۔ اُن کی محبت اور جذبے کو سراہا ہو گا۔ آساؤں سے آواز دی ہوگی۔ ”مت کرو اتنی محبت“ مت ڈھوٹو۔ ہمیں اس خون جمانی برف میں ہم تو دہاں ہیں جہاں جانے کی آرزو ہر مومن کرتا ہے۔ ہم تو زندہ ہیں بس تمہیں اب بھی نظر نہ آئیں گے کیونکہ ہم شہید ہیں اور شہید کسی مر نہیں کرتے۔

اپنی تلاش میں مصروف اپنے ساتھیوں پر پیار بھری نظر اُن کے اوپے درجوں کے لیے دُعا بھی کی ہوگی کیونکہ وہ شہید ہیں اُن کا رتبہ بہت بلند ہے وہ ہمیشہ اپنوں کے آس پاس ہی ہوں گے کیونکہ شہید مرا نہیں کرتے۔





انکس میں شہنشاہی ہے

عاشق وکیل راؤ کا خیال
یہاں آتے ہیں سب موسم گرما بھرت جاتے ہیں
تمہاری یاد کا موسم پھٹا بھول جاتا ہے

ایسے معاشرے کا کہانی جہاں آج بھی عورت رسوں اور تقاضوں کی حیثیت پر حائل جاتی ہے

میراثہ اسماعیلی خان ہے۔ میں عرصہ دراز سے
لندن میں مقیم ہوں۔ خوبصورت بیوی اور ایک بیٹا
ہے۔ گھر کا ڈھائی ایک میلٹس کیا نہیں ہے جو میرے
پاس نہ ہو مگر ایک کی سی ہے جو میری روح سے لپٹی
ہے ایک درودل میں بسا ہے میری غلش مجھے کسی
بل صین لینے نہیں دیتی۔



بیوی نہیں ہیں۔ پولیس آئی اور ان دونوں کو تھانے لے
گئی۔ ان پر حدود آؤ پیش کا کیس تھا۔ کسی طرح شاہ
زیب کے بڑے بھائی کو اس بارے میں پتہ چل گیا۔
انہوں نے محتاط کرنا بیوی رسوائی ہوئی پھر انہوں نے
کانی برا بھلا کہہ کر انہیں نکاح کرنے کے لیے کہا مگر
نجانے ان دونوں نے کیا سوچ رکھا تھا کہ نکاح نہیں
کیا۔ اس طرح بے غمخیزی کی زندگی گزارتے رہے۔

مدد دے آتے تو میں میڈیا پر ماں کے حوالے
سے لوگوں کے تاثرات سننے کی اور رسمی ہوں تو دل کٹ
رہا جاتا ہے کہ دنیا میں کسی کسی ماں ہیں اور ایک بیری
ماں ہے جس نے اپنی عیاشیوں کے لیے اپنی بیٹی کی
زندگی داؤ پر لگا دی۔ اس نے میری زندگی میں زبردست
کے رکھ دیاتے ماں کہتے ہوئے میں شرم آتی ہے۔
کاش ہمارے ابو کی بجائے ای کی موت آ جاتی۔
آج لوگوں کی بات میں تو نہ سناؤ پڑیں۔ قارئین! تعین
کر رہیں میں نے تو گھر سے نکلتا ہی چھوڑ دیا ہے۔ اب
کون شرف انسان مجھ سے شادی کرے گا؟ ابھی کچھ
دنوں پہلے لیان نے بھی اتفاقاً شاہ زیب کے خاندان
کی لڑکی بھکا کر کوٹ میرج کر لی۔ شاید اس نے ایسا
کر کے اپنے اندر کی آگ بجھائی مگر میں ایک کمزور
لڑکی رونے اور کڑھنے کے موافق کر سکتی ہوں؟ آپ
سب سے اتنا س ہے میرے لیے دعا کریں اللہ
پاک مجھے بھی خوشیاں عطا فرمائے۔ (آمین!)

یہ کہانی یہاں ختم نہیں ہوئی آئی کارشناس مگر میں
روڈ ایکسٹریٹ میں انتقال ہو گیا تو شاہ زیب نے بھی
شادی کر لی۔ شادی کے تین سال قبل تہمت اٹھے کہ زور
پھر اچانک ہی اس کی بیوی کا انتقال ہو گیا۔ اسے
چھ ماہ بعد ہی شاہ زیب ایک رات جو سویا تو صبح دیکھا
اسے نصیب ہی نہیں ہوئی۔ جب اسے موت آئی تو
کوئی اس کے منہ میں پانی ڈالنے والا بھی نہیں تھا وہ
سکسک کر مر گیا۔

لیان نے امی کو دلاکھ روپے دے دیے ہوئے کہا
تھا۔ "امی! ہم آپ کے ساتھ نہیں رہ سکتے آپ تو
بڑی وفا شعار بیوی ہیں آپ نے ابو کے ساتھ تو بے
وفائی کی ہے اب اپنی بیٹی کو بھی نہ چھوڑا؟ شاہ زیب تو
غیر موافق تھا آپ تو ماں ہیں آپ کو ذرا لاچ بھائی؟"
ای اس کی باتوں کے جواب میں کچھ نہ بول سکیں۔
کچھ عرصے بعد امی نے ہمارے گھر سے ذرا دور
مکان کرانے پر لے لیا۔ تھوڑے ہی دن بعد شاہ زیب
بھی اسلام آباد سے لاہور شفٹ ہو گیا اور امی کے ساتھ
اس گھر میں رہنے لگا لی۔ ان دنوں لاہور سے شاہ
زیب کو ایک چھوٹی سی دکان کراؤں ایک ہی محلے میں
رہنے کی جگہ سے امی کی ہر بات کی خبر میں ہوتی
تھی۔ نجانے کس طرح لوگوں کو علم ہو گیا کراؤں اور شاہ
زیب میاں بیوی نہیں ہیں میں کسی نے تھانے میں
الطاف کر دی کہ فلاں گھر میں جو لوگ رہتے ہیں وہ میاں



اپنے آنے کی اطلاع بھی انہیں نہیں دی گئی۔ خوشی کے مارے میرا دل چاہ رہا تھا کہ ریکس اور میں اڑتا ہوا اس وسیع و عریض میرے پیارے رہنے پر پھیلے شاعرانہ حوصلے پہنچ جاؤں جہاں میرے پیارے رہنے پر پھیلے شاعرانہ حوصلے پہنچ جاؤں اور ان کا کیسٹ سا بیٹا مسدا گل بیٹا چچی اور ان کی دونوں بیٹیاں ہر التواء اور نور التواء!

چھوٹے چچا خان امین علی خان نے آغا جانی کی مخالفت کے باوجود گل بیٹا چچی سے شادی کی گئی جو خاندان سے باہر کی تھیں۔ بیٹے کے اس تصور پر آغا جانی نے انہیں بھی معاف نہیں کیا تھا۔ وہ سال قبل چچا اپنے انتقال سے پہلے اپنی بیوی گل بیٹا چچی اور اپنی دونوں بیٹیوں کو حلیے لے آئے تھے۔

چچا نے فرسودہ خاندانی رسوں اور قوائیں سے بغاوت کر کے گل بیٹا سے شادی کی تھی اور میرے خیال میں اس میں کوئی بری بات نہیں کی مگر آغا جانی انتہائی سخت طبیعت کے مالک تھے وہ اپنی خاندانی رسوں کو سینے سے لگائے بیٹھے تھے۔ میرے اور آغا جانی کے درمیان یہی اختلاف تھا جس کی وجہ سے باپ بیٹا ہونے کے باوجود ہم ذاتی طور پر ہمیشہ دور رہے۔

گل بیٹا چچی کو امر چچی کی وفات کے بعد حویلی میں جگہ تو مل گئی مگر دلوں میں بدل گئی۔ ان کی بنائیت سکھ پڑن اور لٹری کے باوجود وہ حویلی میں کوئی مقام حاصل نہ کر سکیں۔ یہ حال ان کے چہرے پر بہت حد تک ظاہر تھا مگر انہوں نے ہر التواء اور نور التواء کی پرورش کی خاطر یہ قبول کر لیا تھا کہ جو کچھ بھی ہو آخر وہ دونوں میں تو آغا جانی کا خون۔

لی لی جان کی وفات کے بعد مجھے اور فیروز بیما کو گل بیٹا چچی نے ہی سنبھالا تھا اور انہوں نے ہمیں

کبھی ماں کی کمی محسوس نہیں ہونے دی تھی۔ ہم دونوں بھائیوں کو ان سے خاص قسم کی انسیت تھی۔ ان کی بڑی بیٹی ہر التواء اور ہم دونوں بھائیوں کا بچپن ساتھ گزرا تھا۔ نور التواء اپنی وقت بہت چھوٹی تھی۔ مہرہ خاص شوق اور ہنس کھی۔ میں اور فیروز بیما جب بھی شہر سے آتے تو ان دونوں کے لیے ڈبھروں چیزیں لاتے تھے جنہیں باکر مہرہ کی آنکھیں چیر لیتی تھیں۔ مجھے اس کی آنکھوں کے یہ جگنو بہت عزیز تھے۔ گزرتے وقت کے ساتھ ساتھ مجھے مہرہ سے خاص الفت ہو گئی اور میری محبت کا علم وقت کے ساتھ ساتھ فیروز بیما کے علاوہ زینہ پھو پھو کو بھی ہو گیا تھا۔

زینہ پھو پھو ہماری حویلی کا سنجیدہ ملکہ الیہ کردار تھیں۔ انہیں ہم نے بھی نہیں دیکھا تھا۔ وہ سفید لباس میں یوں لگتی جیسے حویلی میں کوئی روح بینک رہی ہو۔ ان کے ساتھ ہونے والے ظلم نے انہیں بہت خاموش سا کر دیا تھا۔ آغا جانی نے جہاں حویلی کی اور فرسودہ رسوں پر وہاں چڑھایا تھا وہیں قرآن پاک سے نکاح جیسی فحش رسم میں ان سے ایک تھی۔

ان کے مطابق خاندان کی لڑکیاں باہر نہیں بیاہی جاتی تھیں اور اگر خاندان میں کسی لڑکی کا کوئی جوڑ نہیں ہوتا تو اس کا نکاح قرآن پاک سے کر دیا جاتا تھا۔ زینہ پھو پھو اس رسم کی بیعت چڑھ گئی تھیں۔ وہ دل جس میں جیسے کی اسنگھی گئی جو ہواؤں اور ٹھنڈاؤں کے سنگ کا تھا تھا اسے قید تنہائی میں ڈال دیا گیا۔

میری اور ہر التواء کی محبت دیکھ کر وہ ذرا مسکراتیں اور پھر ان کے چہرے پر دکھ و ملال کے رنگ بکھر جاتے تھے۔ انہیں دیکھ کر میں ہوتا دکھ تھا۔ ہر التواء تو اکثر ان کے کمرے میں دکھائی دیتی تھی۔

وہ ان سے بہت مالوس ہو گئی تھی۔ آغا جانی کے باروا سلوک کے باعث ہر التواء نے آغا جانی سے دور رہنے میں عافیت جانی گئی۔ نور بہت چھوٹی تھی اسی لیے اسے ابھی ان باتوں کا شعور نہیں تھا۔

میں باہمی کی بھولیں بھولیں میں کھویا ہوا تھا کہ ٹیکسی ایک جھگڑے سے رک گئی تھی۔ میں نے چونک کر نظر اٹھائی تو حویلی کو سامنے پایا تھا۔ میں فوراً حویلی میں داخل ہو گیا۔ سامنے ہی ہمارے برسوں پرانے لازم کریم بابا نظر آگئے۔ ان کی نظر مجھ پر پڑی تو ہنسنے لگے۔ اس طویل عرصے کے دوران کریم بابا مزید بوڑھے ہو گئے تھے۔ مجھے اچانک باکرہ حیران بھی ہوئے اور خوش بھی پھر وہ میرا سامان لانے کے لیے باہر کی جانب بڑھ گئے۔ سب سے ملاقات کے دوران میری نظرس ہر التواء کو ڈھونڈ لیتی تھی۔ نور بھی اب بڑی ہو گئی تھی۔ 15 سال دور نے بھی ماں کے سینے تلخ چرائے تھے۔ کوہر کوہر کی نسبت نور بہت خوبصورت تھی کمرے سے دل کو ہر وہی بھائی تھی۔

میں نے فیروز بیما سے مہرہ کے متعلق پوچھا تو وہ ٹال گئے اور انہوں نے بڑی خوبصورتی سے موضوع بدل دیا۔ نور بھی خاموش خاموش کی لگ رہی تھی۔ حویلی کی کھانا میں ایک خاص قسم کی سوکھا رویت گھیا شاید مجھے ایسا لگ رہا تھا۔ گل بیٹا چچی جہاں میرے آنے پر خوش نظر آ رہی تھیں وہ ان کے چہرے پر دکھ کے سامنے واضح لرز رہے تھے۔ زینہ پھو پھو کی بہت شدت سے محسوس ہو رہی تھی۔ وہ آج ہمارے درمیان موجود ہیں۔ انہیں قید تنہائی کے عفریت نے انہیں اور ان کے خدایوں کو گل لایا تھا۔ وہ سال قبل زینہ پھو پھو نے اس عالم ساج سے نجات حاصل کر لی تھی۔ ان کی وفات کی خبر میں مجھے مہرہ کے خطوط کے ذریعے لی گئی مگر پچھلے چند ماہ سے مہرہ کے خطوط

سوال

فائل کھانے کو
راستے دکھانے کو
تیر کی مٹانے کو
اپنے اپنے کے
کب ویہ جلاؤ گے؟

ر ر ر ر ر ظریف احسن

بھی آتا بند ہو گئے تھے۔ نجانے کیا وجہ تھی؟ مہرہ بدل گئی تھی؟ یہ ممکن نہیں تھا مگر ایسا کیا ہوا تھا جس کا مجھے علم نہیں ہو سکا۔ سب سے مل کر میں اپنے کمرے میں آیا اور فریش ہو کر بستر پر دراز ہو گیا اور مہرہ کے بارے میں سوچے ہوئے نیند کی واہی میں اتر گیا۔ شام میں آنکھ ملی تو خود کو خاموشا بہتر محسوس کر رہا تھا۔

اب سڑی تھکان پر مہرہ کی حلائی غالب آ گئی تھی۔ ایک ماہ باہر آیا مہرہ کے کمرے میں نور التواء کو ایکے ایکے باہر لے کر خوش ہوئی۔ میں اندر داخل ہوا تو مہرہ کو نظر نہ آئی۔ نور سے بہت پوچھا تو اس نے خاموشی سے نظریں جھکا لیں۔

میری ناراضگی پر اس نے سسکتے ہوئے کہا۔ ”چند ماہ پہلے مہرہ کا نکاح قرآن پاک سے کر دیا گیا ہے۔“ یہ کہہ کر وہ چھوٹ چھوٹ کر رو دی۔ اپنی بہن کے دکھنے نور کو بھی غل حال کر دیا تھا۔ میں نے بیٹنی کے انداز میں تو کو کو دیکھا۔

”..... یہ نہیں ہو سکتا۔“ میں بڑبڑایا۔
”حقیقت ہے۔“ نور نے جواب دیا۔
”آغا جان ایسا کیسے کر سکتے ہیں؟ میں نے

سوچا چرم میں نے زور دینا چھو پھو کے کمرے کی طرف
قدم بڑھا دیئے۔ دسک دینے بغیر میں اندر داخل
ہو گیا۔ کمرے میں سفید لباس میں لہجوں مہر و نظر
آئی۔

”کمرہ..... ہے..... وہ ہمہ دھن کی جسے میں چھوڑ
گیا تھا۔ یہ تو کوئی بھٹی ہوئی روح تھی یا پھر زینہ
چھو پھو کی روح تھی جو ہر وہ کے اندر داخل ہو گئی تھی۔
میں بے تابی سے مہر کی طرف بڑھا۔ مہر نے مجھے
بڑھتے دیکھ کر رخ موڑ لیا تھا۔

”مہر؟ یہ سب کیا ہو گیا؟“ میں نے تڑپ کر
پوچھا۔
”بہن میری تقدیر تھی.....“ اس کا لہجہ سہا تھا
مگر میں اس کے کرب کو محسوس کیے بغیر نہیں رہ سکا۔
”بہنیں تقدیر نہیں ہے ظلم ہے.....“ میں چلائی۔
”کچھ بھی کہہ لیں اب بہن میرا نصیب ہے۔“

وہ پھر ایسا انداز میں بولی۔
”میں تمہیں زندہ درگور نہیں ہونے دوں گا۔“
”تم ایسا کچھ نہیں کرو گے اسٹریٹ میں نہیں چاہتی
کہ میری وجہ سے کوئی فساد ہو۔“
”یہ ظلم ہے مہر.....“ میں نے بے بسی سے
کہا۔

”اسٹریٹ واپس لوٹ جاؤ۔“
”میں تمہیں ساتھ لے کر جاؤں گا۔“ میں نے
اٹل لہجہ میں کہا۔ مہر نے میری طرف دیکھا۔ اس
کی نظروں میں دھک کا سندھو ٹھہریں مار رہا تھا۔ اس کی
آنکھوں کے وہ چنگو جو مجھے بہت عزیز تھے اب مجھ
سے کیے تھے۔ اس کی حالت پر میرا دل دکھ سے بھر گیا
تھا۔ وہ شرم کی مہر ہو جانے کہاں گم ہو گئی تھی۔ سناج
کے ظالم اصولوں نے زور دینا چھو پھو کے عذاب مہر و
کو بھی نکل لیا تھا۔

”میں نہیں نہیں جاؤں گی۔“ مہر نے تھی لہجہ

میں کہا۔ میں جانتا تھا مہر واپس فیصلے سے ٹس سے
مس نہیں ہوگی۔

”میں آقا جان کے اصولوں سے ٹکرانے کا
حوصلہ نہیں رکھتی۔“ مہر واپس نہ گئے ہوئے کہا۔

”ان سے میں بات کروں گا۔“ میں نے اسے
حوصلہ دینے کی کوشش کی۔

”کوئی فائدہ نہیں اسٹریٹ چلے جاؤ یہاں
سے۔“ وہ دکھ سے چلائی۔ میں نے کرب کی شدت
سے آنکھیں بند کر دیں اور دوبارہ اس کے لیے قدم بڑھا
دیئے۔

”مہر.....“ اس کی آواز پر میں مڑا۔ ”مجھ پر
ایک احسان کرتے جاؤ۔“ اس کی آنکھوں میں اسی
تھی۔ میں نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا
تھا۔

”نور کو اپنے ساتھ لے جاؤ۔“
”کیا مطلب؟“ میں نے حیرانی سے پوچھا۔

”اس سے شادی کر لو۔“ اس نے آتی ٹھہری
بات یوں آسانی سے کہہ دی تھی۔ ”میں نہیں چاہتی
میرے بعد میری بہن اس کمرے کو آباد کرے۔
میرے لیے اب کچھ نہیں بچا۔ میں تمہارا ساتھ نہیں
دے سکتی مگر فوراً میری قید تہائی کی اسیر نہیں ہوتی چاہئے
کب وقت کے ظالم ہاتھ اسے بھی میری طرح محروم
کر دیں پیلز اسٹریٹ میری خاطر اس محبت کی خاطر جو
تمہیں مجھ سے تھی، نور کو قبول کر لو۔“ مہر واپس
امید بھری نگاہوں سے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔ میں
کوئی جواب دینے بغیر کمرے سے نکل گیا۔

آقا جان شہر سے واپس آ چکے تھے تو کہ میں اندر
سے دکی تھا اور اس کے ذمہ دار بھی آقا جان تھے مگر
ان سے ملنا ضروری تھا۔ میں ان کے کمرے میں
داخل ہوا۔ آقا جان نے مجھے دیکھا اور محبت سے
نگلے لگایا پھر میں ان کے پاس بیٹھ گیا۔

”آقا جان! آپ سے ایک ضروری بات کرنی
ہے؟“ میں نے تمام حوصلہ جمع کر کے کہا۔

”بولو۔“ انہوں نے بارعب آواز میں کہا۔
”آپ نے مہر واپس کے ساتھ اچھا نہیں کیا۔“ میں

نے مذکور طریقے سے شکوہ کیا۔
”اب تم مجھے سمجھاؤ کہ کیا اچھا ہے اور کیا
برا؟“ وہ غصہ ناک لہجہ میں بولے۔

”آقا جان! ظلم ہے۔“
”یہ جوئی کے اصول ہیں اور تم ان سے نہ گراؤ تو
بہتر ہے۔“ انہوں نے اٹھ کر انداز میں کہا۔

کچھ دیر یوں خاموش رہی پھر میں نے ہمت
کی۔ ”آقا جان! میں نور کو اپنے ساتھ لے کر جا رہا
ہوں۔“ آقا جان نے حیرت سے میری طرف دیکھا
تھا۔ ”میرا مطلب ہے میں اس سے شادی کر کے
اسے ساتھ لے جاؤں گا۔“

”یہ نہیں ہو سکتا۔“ آقا جان براہم ہو گئے۔ ”تم
حد سے بڑھ رہے ہو اسٹریٹ۔“

”پیلز آقا جان! مہر واپس کے بعد نور کے ساتھ یہ ظلم
مت کرنا۔ آپ آکر شرم نہ کھ گھٹنا چھٹی کے
خانان سے باہر ہونے کے تصور کو حائف نہیں کریں
گے؟ اس میں مہر واپس نور کو کیا قصور ہے کہ آپ اپنے
بے بنے کے لیے ان کا انتخاب نہیں کر سکتے؟ اگر خانان
کی لڑکیاں خانان سے باہر نہیں دی جاسکتی تو یہ کہاں
کا انصاف ہے کہ ان کے ساتھ یہ ظلم کیا جائے؟
قرآن پاک سے نکاح کرنا؟ کیا اسلام اس کی
اجازت دیتا ہے؟“ میں نے انہیں اپنی دلیلوں سے
تاش کرنے کی کوشش کی تھی۔

”تم ہمارے خانانہ اصولوں سے بغاوت کر
رہے ہو؟“ آقا جان دھڑلے سے تھے۔

”کسٹائی حائف آقا جان! تمہیں نے نور کو اس
قید سے آزاد کرانے کا فیصلہ کر لیا ہے۔“ میں نے

اٹل انداز میں کہا۔ ”میں جانتا ہوں اس صورت میں
میرا آپ سے اس جوئی سے کوئی رشتہ بنا نہیں رہے
گا۔“ میری بات پر آقا جان خاموش رہے تھے اور

میں بھی ان کا جواب نہ بغیر کمرے سے نکل گیا تھا۔
جوئی سے رخصت ہوتے ہوئے نیز درمیانے

گلے لگ کر میرا حوصلہ بڑھایا تھا۔ میں اپنی جی کے
چہرے پر اظہارِ فکر صاف دیکھا جاسکتا تھا۔ میرے

لیے یہی کافی تھا اور پھر صرف محبت کو پالنے ہی سے تو
محبت کی جیت نہیں ہوتی۔

مہر النساء کو کہنے یا اس سے ملنے کی مجھ میں
ہمت نہیں تھی۔ میں جانتا تھا وہ میری احسان مند
ہو گی کہ یہ احسان نہیں تھا۔ تھائی بھی جو آقا جان
کے ظلم کے جواب میں مجھے نور کو اپنا کر کرنی پڑی تھی
پھر میں نور کو لے کر لندن آ گیا تھا۔

.....

اب اس بات کو بھی دس برس ہو گئے ہیں۔
ہمارے آنے کے کچھ عرصے بعد گلہ بنا چھٹی نے بھی

اس جہاں سے ناٹو لیا تھا۔ دو سال تک مہر النساء
بھی یہ جہاں چھوڑ گئی تھی۔ مہر النساء نہیں سے مگر

میرے دل میں وہ ہمیشہ زندہ رہی۔ میرے دل میں
میں بار بار مجھے مہر النساء کو کھلانے میں دیتا۔

نور بہت اچھی بیوی ثابت ہوئی ہے۔ وہ مجھ
سے بہت محبت کرتی ہے اور میری احسان مند ہوتی

ہے۔ عموں کے فرق کے باوجود ہم نے کامیاب
زندگی گزار دی ہے۔ مجھے نور سے کوئی شکایت نہیں

سوائے اس کے کہ وہ نور النساء سے مہر النساء نہیں۔
آپ کو شاید میرے درد کی بخوبی سمجھ آگئی ہوگی

کہ مہر واپس کے لیے کچھ نہ کر سکا۔ اسے ظلم سے
نجات نہ دلا سکا۔ شاید میں بد دل تھا۔ یہ سوچ

میرے سن میں ایک میں کی صورت ہمیشہ رہتی
ہے۔

اپنی آنکھوں کے سامنے موکلات سے کام کرادیں.....

مسز تو قیر کسی ایسے اشتہارات پڑھ کر ہنسی تھیں کہ ہر کام منوں میں کر کے کا دعویٰ کرنے والے خود کیوں ایک معمولی سی جگہ پر بیٹھے ہوئے ہیں؟ مگر آمودہ حال ہونے کا کام نہیں کر دیتے؟ مگر آج وہ خود ایک عامل کے پاس اپنا مسئلہ کر دوانے بیٹھی تھیں۔

”آپ خرچہ تو بتائیں، کتنا ہوگا؟“ انہوں نے پھر پوچھا۔

”بی بی!..... ہم کسی کو خواہوا خرچے میں نہیں ڈالتے۔ آپ کے اصرار پر صرف اتنا بتا سکتے ہیں کہ آپ کے دشمنوں کا نام۔ ام۔ ام۔ ام۔ سے شروع ہوتا ہے آپ کو نام کا پہلا حرف بتانے پر بھی ہمیں موکلات کی دقت کرنی پڑے گی۔ گوشت کا صحت اور مضامی کی نیاز کرنی پڑے گی۔ تقریباً دو ڈھائی ہزار روپے تو اسی میں خرچ ہوگا اگر اچھا نہیں ٹھیک ہے میں سوئکل کو بلانے کے لیے بخوات و دیگرہ کا اپنے پاس سے انتظام کر لوں گا۔ میں دیکھتا ہوں شاید میرے پاس کچھ بڑا ہوا ہو۔“

عامل صاحب تجالے کی کیا بول رہے تھے جبکہ مسز تو قیر تو اپنے خیالوں میں تھیں وہ تو س۔ ام۔ ام۔ کے چکر میں تھیں بیوی بوجھ رہی تھیں۔

”میں سے تو خرام شروع ہوتا ہے اور سر میری دیواری ہے۔ بظاہر تو بھائی بھائی سمجھتے زبان سوکتی ہے اور اندر سے دشمنی کر رہی ہے بڑی کھلی ہے اور ان سے مجھ میری ہند ہے ویسے اور ہے یہ بھی بڑی اچھی طرح لکھی ہے بہت پر غلطی نہ آتی ہے اور ہاں.....“

”میں نے“ بی بی جب بھی میرے گھر آتی ہیں سے مجھ سے ملتی ہیں۔ جب بھی میرے گھر آتی ہیں میرے گھر اور سامان کو لگاتی ہوئی نظروں سے دیکھتی

ہیں۔ حدان کے لیے اور نظروں سے صاف ظاہر ہوتا ہے کئی بار ہر نگلی ہیں۔ ”مجھی تمہارا کیا ہے تم تو خود بھی کمائی ہو تمہارے میاں بھی اتنی اچھی پوسٹ پر فائز ہیں تمہارا تو گھر بھی کرائے پر اٹھا ہوا ہے تمہیں کسی چیز کی ہے؟“ وہ یہ نہیں دیکھیں کہ میں نے محنت کی ہے۔ میں نے تو شادی کے بعد بھی اپنی بڑھائی جاری رکھی، تعلیم مکمل کی تو فکری کی اور پھر خدمت کرائے گھر کی اوپر منزل بنوائی۔ اب کرائے پر اٹھایا ہے تو اس سے خرمہ اتار رہی ہوں۔ خود تو میرے بھیا کی کمائی پر عیش کر رہی ہیں۔ میری طرح محنت تو کر کے دکھائیں؟“ ان کا ذہن بڑی تیزی سے چل رہا تھا شک کا جھج جھال صاحب نے ان کے دماغ میں بویا تھا وہ انہوں میں تباہ و درخت بن چکا تھا۔

مسز تو قیر کسی تھی نہیں وہ سیدھی سادی مراد علی تعلیم یافتہ قدرے مذہبی خاتون تھیں۔ وہ ایک سیکنڈری اسکول میں معلمہ کے فرائض انجام دے رہی تھیں۔ وہ بڑی مطمئن زندگی گزار رہی تھیں۔ شوہر ایک تجارتی فرم میں مارکیٹنگ منیجر تھے۔ ان کے چار بچے تھے دو بیٹے اور دو بیٹیاں مگر اصرار کچھ عرصے سے ان کے مالی حالات خراب ہو رہے تھے جس کی وجہ سے وہ سخت پریشان تھیں۔ ان کے شوہر کی فرم کچھ دنوں سے خسارہ میں جاری تھی جس کی وجہ سے تقریباً آٹھ مہینے سے ان کی خواہ اسٹاپ ہوئی سو سز تو قیر کو اپنی خواہ سے گھر کا خرچ چلانا پڑ رہا تھا اس لیے ان کو کانٹا شکل پیش آ رہی تھی۔

اسکول میں پچھڑ تو آئیں میں بے تکلف ہوتی ہیں سب ایک دوسرے کے حالات سے واقف ہوتی ہیں وہ آپس میں اتنی بے تکلف ہوتی ہیں کہ جو گھر بلو باتیں مکی بہن کے سامنے نہیں کر سکتیں وہ

اسٹاف سے کر لیتی ہیں چاہے وہ سرال کی حکایتیں ہوں یا میاں کی بے وفائی یا لاپرواہیوں کا راز سب ایک دوسرے پر عیاں ہوتا ہے۔ اس طرح سب آپس میں ایک دوسرے سے اپنے دل کی باتیں کر کے اپنی فینکشن ریلیز کر لیتی ہیں اور اس سلسلے میں سب ایک دوسرے کو شہرے بھی خوب دیتی ہیں۔ مسز تو قیر کینکرا بچے گھریلو حالات کی وجہ سے خاص پریشان ہیں اس وجہ سے وہ ہر چیز کی بوری تھیں وہ بچوں اور میاں سے بلاوجہ الجھ پڑتی تھیں شوہر پہلے ہی پریشان تھے اوپر سے بیوی کی بد مزاجی نے ان کو چڑچڑایا دیا تھا۔ دونوں اکثر بلاوجہ ٹھکارا شروع کر دیتے۔ اس فینکشن نے گھریلو حالات پر اثر ڈال دیا تھا اسکول میں بھی ان کی دیکھ کر ذمہ داریوں پر بھی فرق پڑنے لگا تھا۔

ایک روز مسز تو قیر کی زبان تمام حالات سن کر ان کی ایک ساتھی سمجھنے نے ایک عامل صاحب کا پتہ بتایا تھا اور ان کے عملیات کے ذریعے سے لوگوں کو دلی والی کامیابیوں کے لیے سے خائے تھے کہ وہ بھی اس بات پر تیار ہو گئی تھیں کہ عامل باران عامل صاحب سے ملاقات کر لی جائے اور یوں مسز تو قیر اپنے میاں سے چھپ کر ان عامل صاحب کے بیچ گئی تھیں جنہوں نے ان کو ایک نئی فینکشن میں جلا کر دیا تھا۔ مختصر بہت سوچ بچار کے انہوں نے اپنے پس سے دو ہزار روپے نکال کر عامل صاحب کی طرف بڑھانے تھے۔

عامل صاحب نے ہزار ہزار کے دو تھے نوٹوں کو لپٹائی ہوئی نظروں سے دیکھتے ہوئے بظاہر بے اعتنائی سے کہا تھا۔ ”بی بی!..... اس پورے کام میں پانچ ہزار سے خرچ نہیں ہوتا اور اس میں میری کوئی فیس یا ہدیہ نہیں یہ صرف آپ کے کام کے لیے موکل کو بلانے کا خرچہ ہے۔“

”لیکن میں تو اسے نہیں لائی دے بھی آج کل میرے حالات ایسے نہیں کہ میں اتنی بڑی رقم خرچ کر سکوں۔“

”لیکن آپ کے لیے یہ بہت ضروری ہے۔“ ”گھر میں بہت مجبور ہوں آپ کا مہر شروع کر میں میرے میاں کی جوتھار دی ہوئی ہے وہ آپ اپنے عمل سے نکلا دیں تو پھر میں آپ کو میرے رقم دے دوں گی۔“

”بی بی!..... آپ اپنے شوہر سے کہیں کہ وہ باقی رقم کا انتظام کر دیں۔“ عامل صاحب نے مشورہ دیا تھا۔

”عامل صاحب! میرے شوہر نہ تو عملیات وغیرہ کے قائل ہیں نہ اس قسم کے کام وہ پسند کرتے ہیں میں ان کے علم میں لائے بغیر یہی آئی ہوں۔“

”لیکن بی بی!..... پہلے یہ کام ہوگا تو آپ کے میاں کو رکی ہوئی خواہ لے لی اس کے لیے پھر خرچ تو کرنا ہوگا۔“ عامل صاحب نے مسز تو قیر کو اپنے مطلب کی سمجھانے کی کوشش کی مگر کچھ سوچ کر کہنے لگے۔ ”آپ ایسا کریں کہ یہ رقم والدین میں جمع کر دے دیں میں کام شروع کرنا ہوں آپ دو چار دن میں انتظام کر کے باقی رقم دے دیجیے گا۔“

”ٹھیک ہے۔“ مسز تو قیر نے بے چارگی سے کہا تھا پھر اپنے خون پیسے کی کمائی دو ہزار روپے عامل صاحب کے حوالے کر کے چلی آئی تھیں اور دل میں یہ سوچ رہی تھیں کہ عامل صاحب کو باقی پیسے اسٹاف سے قرض لے کر دے دوں گی۔

عامل صاحب کے آمتانے سے گھر واپسی کے بعد بھی مسز تو قیر کے ذہن میں اپنی منہ دیواری اور بھائی کا نام گھر کرنا ہزار روپے اور دل میں بیچ و تاب کھاتے ہوئے انہیں خوب برا بھلا کہتی رہیں تھیں مگر ان کو کبھل کر بھی یہ خیال نہیں آیا تھا کہ سُن سے

ان کا بہن سارہ کا نام بھی آتا ہے اور میم سے اُن کی والدہ معینہ کا نام بھی ہے اور فیضان کی نانی ہیں جن کا نام اُن سے شروع ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ اُن کی بہن سی سیلیاں اور جانیہ والیاں بھی ہیں جن کا نام س۔ م اور ن سے شروع ہوتا ہے۔ سب سے بڑی بات یہ کہ خود ان کا نام بھی منیرہ ہے جو ہم سے شروع ہوتا ہے مگر وہ روایتی حدود اور ملن جو سہرا ل والوں اور بھائی سے ہوتی ہے اب اس کی بنیاد پر چکی کی دو سٹاس سے پہلے نند بھادج اور پوری سب سے خلوص کا رشتہ قائم تھا۔ یہ سب عامل صاحب کی باتوں کا کمال تھا جو بل برہمن خلوص اور محبت ختم کر گیا تھا۔

.....
عامل صاحب نے فوٹل پانچ ہزار کا خرچ بیٹا تھا مگر دو تین ہفتوں کے اندر سرتو قیر کے تقریباً تین ہزار روپے خرچ ہو گئے تھے جو انہوں نے نجائے کس سے ادھار لیے تھے مگر اس کے باوجود ان کے مسائل جوں کے توں بچے بلکہ ایک اور مسئلہ قرض کا بھی ہو گیا تھا۔

دو تین مہینے یونیورسٹی گزر گئے تو قیر صاحب کے آفس کے مسئلے کا کوئی حل نکلنا نہ اُن کو چھوٹی کی ادائیگی ہوئی بلکہ سرتو قیر پر قرض میں بھٹس نہیں نہ جائے مانع نہ پائے رفتن کے مصداق وہ عامل اور معمول کے چکر میں الجھتی چلی گئیں۔ ایک عامل سے کوئی فائدہ نہ ہونے پر ان کو کسی اور نے دوسرے عامل صاحب کا پتہ اس یقین دہانی کے ساتھ بتایا تھا کہ ان کے عملیات سے ان کا ذاتی طرز پر اپنا فائدہ ہوا ہے۔

نئے عامل صاحب نے سرتو قیر کو صرف چار ہزار کا خرچ بیٹا تھا وہ بھی قسطوں میں انہوں نے تو سرتو قیر کو اپنے آستانے پر بھی بلایا بلکہ فون کے

ذریعے تمام معاملات طے کر کے اپنے بندے کو ان کی طرف بھیج دیا جس کو سرتو قیر نے اپنے گھر کے بجائے اپنے اسکول میں بلوایا۔ ان عامل صاحب نے ان کو صرف دو ہفتوں کا کارٹڈ یا قیاحس میں ان کے سارے کام سونپ دیا تھے ان کو یہ یقین دہانی کروا دی تھی کہ میرے عمل کے بعد آپ کے میاں کی ریکی ہوئی خواہ مخواہ ان کی ترقی کے راز کے ساتھ مل جائے گی یوں سرتو قیر نے عامل صاحب سے ایک نئی امید باندھی تھی لیکن حیرت کی بات یہ تھی کہ سرتو قیر کے شوہر جن کے لیے عملیات کروائے جارہے تھے ان کے فرشتوں کو بھی خبر نہیں تھی کہ ان کی بیگم صاحبہ کیا کمالات کر رہی ہیں؟ ویسے خبر بھی اسی تھی کہ ان کو کچھ خبر نہ تھی وہ سرتو قیر کا لپسا ہو کر ڈھنگا لنگا اور کچھ نہیں کر فوٹ شدی جاتا کیونکہ اُن کے میاں کو ایسے معاملات کے پیشہ ورین مخالف تھے ان کے لیے یہ ناقابل معافی غلطی ہوئی وہ یہی دیکھی کو بھی معاف نہیں کرتے۔

.....
تو قیر احمد کے آفس کے حالات تو خراب تھے ہی ان کے گھر کی حالت بھی خراب ہو رہی تھی۔ سرتو قیر کا زیادہ وقت اور پیسہ ایک اور نئے عامل صاحب کے چکر میں خرچ ہو رہا تھا۔ سب تو جب دیکھو موبائل پر ہدایات، مطالبے اور شورے ہوتے۔ ان معاملات کے باعث وہ گھر سے دور ہوتی جا رہی تھیں۔ جب گھر کی مالک گھر سے بے گانہ ہو جائے گی تو گھر کی حالت بگڑے ہی کی۔ ان حالات نے تو قیر صاحب کو اور بھی زیادہ پریشان کر دیا تھا۔ مینشن اور ڈپریشن نے اُن کو بہت زیادہ چڑچڑاہا دیا تھا۔ ان حالات میں بجائے اس کے کہ وہ شوہر کی پریشانیوں کو شیش کر تیں جس میں اس کے شکایوں کا سلسلہ جاری رہتا۔ گھر میں عجب محنت

اور سگواری کی فضا چھا گئی تھی۔ ان حالات کی وجہ سے بچی بچہ پریشان تھے سوان کی کیسی مصروفیت پر بھی بہت برا اثر پڑا۔ اسکول سے شکایتیں آنے لگیں اور دونوں میاں بچی کو لڑائی کا ایک اور ایڈیشن مل گیا۔ دونوں ایک دوسرے کو ذمہ دار ٹھہرانے لگے تھے۔ سرتو قیر کو اب عامل حضرات کو پیسے دینے کے لیے سناچی پتھر سونے خرچ ملنا بھی بند ہو گیا تھا۔ پتھر سونے اب سیکلے عام نہیں۔ "سرتو قیر کو تو مانگنے کی عادت ہو گئی ہے" ایک دن وہ ہر طرف سے پریشان اپنے حالات پر غور کر رہی تھیں کہ عامل صاحب کا ایک نئے مطالبے کے ساتھ فون آ گیا تھا۔ وہ کہہ رہے تھے۔

"آپ کے لیے سون شریف جاکر پڑھائی کرنی ہے۔ گیارہ دن کا چلہ ہے" روزانہ گیارہ کوثر خرید کر آزاد کرنے ہیں اس کے علاوہ پڑھائی کے لیے جن چیزوں کی ضرورت ہے اس کا بھی خرچ ہے پھر آنے جانے کا کارایہ اور کھانے پینے کا خرچ ہے وہ آپ کو دینا ہوگا اور بااں روزانہ گیارہ سینکڑوں کو تین وقت کا کھانا کھانا ہے۔"

سرتو قیر نے حساب لگایا تو خرچ ہزاروں میں ہو رہا تھا۔ وہ بھلا کہاں سے اتنا خرچ کر تیں؟ اصل مسئلہ تو چھوٹی کی کا ہی تو تھا جس کو حاصل کرنے کے لیے انہوں نے مختلف عاملوں کا سہارا لیا تھا۔

انہوں نے اپنی اسی سناچی سے اس بات کا تذکرہ کیا تھا جس نے انہیں اس نئے عامل کا پتہ بتایا تھا۔ اُس سناچی نے ساری بات سن کر بے گانگی سے کہا تھا۔ "بھئی" خرچ تو کرنا پڑے گا۔ آخر تمہارا کام ہی تو ہو رہا ہے۔"

مگر ایک نیک تو کوئی کامیابی نہیں ہوئی؟ کوئی آس بھی نہیں بندھی کہیر اکام ہو جائے گا؟

"بھئی..... عمل تو پورا ہونے دو۔" سناچی نے پھر لاپرواہی سے کہا تھا۔

"عمل پورا ہونے کا خرچ میں کہاں سے کروں؟" سرتو قیر نے زچ ہو کر کہا تھا۔ "بھئی تمہارا اپنا مسئلہ ہے۔" وہ یہ کہہ کر اٹھ کے چلی دی گئی۔

سرتو قیر نے بہت سوچ سمجھ کر عامل صاحب کو فون پر بتایا تھا کہ میں اتنا خرچ کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہوں۔

"آپ کو کوئی ذکوئی انتظام تو کرنا ہی پڑے گا۔ اب تو میں اس عمل کی تیاری کر چکا ہوں۔" عامل کے لکچے میں دیکھی جس اس بات کے جواب میں وہ خاموش رہی تھیں تو قیر عامل نے زری سے کہا تھا۔

"دیکھو بی بی!.....! ہر عورت کے پاس زیورات کی فصل میں کچھ نہ کچھ سونا ضرور ہوتا ہے وہ فروخت کر دیں۔" عمل کو کچھ میں احوال نہ چھوڑیں۔

اب انہیں صورت حال کی سنگینی کا کچھ اندازہ ہوا تھا۔ وہ سمجھ گئی تھیں کہ وہ بڑی دلدل میں بھٹس رہی ہیں۔ انہوں نے مزید کچھ کے بغیر فون رکھ دیا تھا مگر دو تین دن کی خاموشی کے بعد ایک دن پھر عامل صاحب کا فون آ گیا تھا۔

"بی بی!..... آپ نے تو مجھے فون ہی نہیں کیا؟ خیر یہ بتائیں کہ پیسوں کا انتظام ہو گیا؟"

"میں نے تو آپ کو اس دن جواب دے دیا تھا کہ میں اب کچھ نہیں کر سکتی۔" سرتو قیر نے صاف جواب دیا تھا۔

"دیکھ بی بی!.....! میں تو آپ کے کام میں بھٹس گیا ہوں۔ جو تک موزکل کام مکمل نہیں کرے گا مجھے پریشان کرنا رہے گا۔ آپ عمل کو کچھ میں احوال نہ چھوڑیں ورنہ....."

”مگر میرے لیے اتنا خرچہ کرنا ناممکن ہے نہ میرے پاس زیورات ہیں جو فروخت کر دوں اور اگر ہوئے تب بھی میں نہیں کر سکتی گی۔“

”بی بی!.....! آپ مجھے کیوں پھنسا رہی ہیں؟ دیکھیں آپ کے پاس گاڑی بھی تو ہے وہ فروخت کر دیں۔“ یہ بات سن کر تو مسرتو قیر اچھل پڑی تھیں۔ ان کو کیسے معلوم ہوا کہ شوہر کی گاڑی میرے نام ہے؟ وہ دل میں سوچتے ہوئے بولی گئیں۔

”یہ بھی ناممکن ہے۔“

”تو پھر بی بی!.....! آپ ایسا کریں مکان بھی تو آپ کا اپنا ہے اس کے کفالت پر خرچہ لے لیں۔ آج کل جیکب سے بڑی آسانی سے قرض مل جاتا ہے۔“

اب تو مسرتو قیر کا صبر جواب دے گیا تھا۔ انہوں نے بڑی تکی سے کہا تھا۔ ”آپ عامل ہیں یا.....؟“ غمگن؟ کسی باتیں کر رہے ہیں؟ مجھے آپ کے کام نہیں کروانا، بس اب یہ معاملہ ختم کر دیں۔

”میں کام شروع کر کے چھ سال نہیں چھوڑ سکتا۔ آپ کو یہ خرچ اٹھانا ہی پڑے گا۔“ عامل نے پھر دھمکی دی تھی۔

”میں آپ کا یہ نمبر اپنے شوہر کو دے رہی ہوں“ وہی اب آپ سے بات کریں گے۔“ مسرتو قیر نے یہ کہہ کر فون بند کر دیا تھا اور پھر اس کم کو بی کال کر پھینک دیا تھا جس سے وہ عالم حضرات سے رابطہ کرتی تھیں۔ اس کے بعد انہوں نے وضو کر کے دو رکعت نفل پڑھنے کے بعد اللہ سے معافی مانگی تھی اور اس کا کھل اُدارا کیا تھا کہ اس نے انہیں ان جھوٹے عاملوں کے چکر سے نکالا اور عزت و رہم کی وردہ اگر تو قیر صاحب کو اس بات کا پتہ چل جاتا تو یہ نہیں کیا ہوتا۔ اس سے اُن میں کچھ سوچنے کی ہمت نہیں

صدف آصف

تو قیر صاحب

بائیں سہا کا خیال
اور جو چیز بھی ہے وہم و گمان ٹھہری
یہ نظر تیرے سوا اور کہاں ٹھہری ہے

اُن بی بیوں کے لیے انطور خاص چوہے شوہر کی عدم توجہ کا شکار ہیں

”ہیلو..... پروڈیوسر صاحب! پلیر“ میری مدد کریں میں بیٹا جانتی ہوں خوش رہنا جانتی ہوں مگر وہ مجھے خوش رہتے نہیں دیتے۔“ دوسری طرف بی بی سی ایل کال رہیو ہوئے ہی میں نے پروڈیوسر ارشد سے مدد کی درخواست کی تھی اور اس کے ساتھ

ہی مجھے بے ساختہ روٹا بھی آ گیا تھا۔
”دیکھ پلیر! آپ وصلہ کریں اور یہ بتائیں آپ کون ہیں؟ کیا جانتی ہیں؟“ دوسری طرف سے پروڈیوسر صاحب نے مجھے دلا روٹے کی کوشش کی تھی۔
”میرا نام عاصمہ ہے۔ مجھے آپ کا فون نمبر



دکھ بولتا ہے

ہوا کی سرسراہٹ میں

بارش کی دم جمم میں

جھلجھل کر آئے آج میں

دکھ بولتا ہے

نگہت اکرم لاہور

”اس ضمن میں آپ کے سرال والوں کا رویہ

آپ کے ساتھ کیا ہے؟“

”وہ لوگ تو شروع سے ہی مجھے خار کھاتے

تھے مگر اسد مجھ پر میرا سادھ دیتے تھے وہ بھی ان کی

سجیدہ طبیعت کی وجہ سے ان کا اپنے گھر والوں پر

بہت دھب ہے مگر کہ کا قہر یا ماما راجہ بھی اسدی

اٹھاتے ہیں کیونکہ وہ اپنے سب بھائیوں میں سب

سے زیادہ خوش حال ہیں اس لیے سب ہم سے دبے

رہتے تھے مگر میری سلیقہ مندی اور خوبصورتی کی وجہ

سے مجھے خاندان کے ہر ممبر کی خاص ہی پڑائی ملتی تھی

جس پر میری بیگناہیاں مجھ سے دل ہی دل میں جلتی

تھیں مگر اسد کے ذمہ سے منہ سے کچھ بول میں باقی

تھیں لیکن اسدی نظریں بدلتے ہی سب کے رویوں

میں فرق آنے لگا ان کو جیسے ہی احساس ہوا میں

اپنے شوہر کے دل سے انزلی ہوں انہوں نے بھی

مجھے آسمان سے زمین پر گرا دیا۔ میرے سانس سر

کے لیے ہر پہر کی گھانا پکانے کی ذمہ داری میری

جیساں کے سر کی ٹیکہ میرے سر اپنی منتھن کا سارا

روپیہ ان ہی کے ہاتھ میں تھا دیتے تھے وہ بھی

زبردستی میرے سر منڈھ دی گئی کہ ”تم نے بہت

سالاں والدین کی خدمت کی ہے اب انی آنے والی

گھر کے ان کی خدمت پتا کرتی موبائل اینڈ نہیں

کرتے تو ذرئی کر انہیں کچھ ہونے گیا وہ بار بار نہیں

لیا وہ چڑ بھی جاتے اور ڈانٹتے گتے کہ مینگ

لہا ہوتی ہے اور میری کالز انہیں پورے وقت

تک کھانے پکانی غرض ان کی خوشی کے لیے ایک

گھر پر پانچویں رہتی جبکہ وہ پیش اور واکت اس کی حریف

موسیویں میں پڑھ رہی ہے جبکہ کلاما مذاکلاں کو

طالب علم ہے۔ میں ایک چوائس ٹیلی سرال ہوتی

رہتی ہوں جہاں بھوک ٹوٹی پرسل لائف میں ہوتی

اگر آپ جینا چاہیں تو آپ کو بیٹھ نہیں دیجے اور مہر

چاہیں تو مرنے بھی نہیں دیجے۔ ہماری شادی نوکر

ارنج مہر بھی مگر شادی کی پہلی رات جب میں نے

اپنے شوہر کو دکھا تو میں ان کو دیکھتی رہ گئی اس نے

قل میں نے ان کی تصویر دیکھی تھی مگر وہ اپنی قصہ

سے بڑھ کر خود کو لکھ اور مجھے ایک الگ کہ پہلے دن

میں ان کی شدید قسم کی محبت میں مبتلا ہو گئی ہوں لیکن

اگر آپ اس کو مبالغہ آرائی نہ سمجھیں تو میں بھی

خوبصورتی میں کسی سے کم نہیں ہوں کمزوروں میں

سب سے کمزوروں میں ایک ہوں۔ ہماری شادی کے روز

دن سب نے ہماری جڑی کو جانور سوچ کی جگہ

قرار دیا تھا۔ میرے اسد کے دل کی خبر تو میں کیونکہ

خاصے کم کو واضح ہوئے ہیں مگر میری پہلی رات کی

محبت جلدی عشق میں تبدیل ہو گئی اور پھر وقت

کے ساتھ وہ میرے لیے ایسے دیوتا کا روپ اختیار

کر گئے جن کے قدموں میں میں اپنی زندگی دلا

کے لیے ہر گھڑی تیار رہتی۔ وقت کے ساتھ ساتھ

میرے عشق نے دیوانگی کی شکل اختیار کر لی۔ میں ان

سے کسی نہیں لڑتی ان باتوں پر بھی غصہ نہیں دکھا

جن پر عموں یاں غصہ دکھائی ہیں۔ اگر انہیں

دفتر سے گھر آنے میں دیر ہو جائے تب دس بار بار

”ہونہ۔۔۔“ آپ بتائیے میں سن رہا ہوں

پروفیسر ارشد کی اس بات کے جواب میں میں۔

اپنی کہانی شروع کی گئی۔

”میرا نام عاصم خان ہے۔ میں اپنے شوہر

اسد خان کو ٹوٹ کر چاہتی ہوں۔ پہلے وہ بھی مجھ

جان دیتے تھے مگر اب وہ مجھ سے پہلے کی طرح محبت

نہیں کرتے ہمارے دو بچے ہیں لڑی روشنی

موسیویں میں پڑھ رہی ہے جبکہ کلاما مذاکلاں کو

طالب علم ہے۔ میں ایک چوائس ٹیلی سرال ہوتی

رہتی ہوں جہاں بھوک ٹوٹی پرسل لائف میں ہوتی

اگر آپ جینا چاہیں تو آپ کو بیٹھ نہیں دیجے اور مہر

چاہیں تو مرنے بھی نہیں دیجے۔ ہماری شادی نوکر

ارنج مہر بھی مگر شادی کی پہلی رات جب میں نے

اپنے شوہر کو دکھا تو میں ان کو دیکھتی رہ گئی اس نے

قل میں نے ان کی تصویر دیکھی تھی مگر وہ اپنی قصہ

سے بڑھ کر خود کو لکھ اور مجھے ایک الگ کہ پہلے دن

میں ان کی شدید قسم کی محبت میں مبتلا ہو گئی ہوں لیکن

اگر آپ اس کو مبالغہ آرائی نہ سمجھیں تو میں بھی

خوبصورتی میں کسی سے کم نہیں ہوں کمزوروں میں

سب سے کمزوروں میں ایک ہوں۔ ہماری شادی کے روز

دن سب نے ہماری جڑی کو جانور سوچ کی جگہ

قرار دیا تھا۔ میرے اسد کے دل کی خبر تو میں کیونکہ

خاصے کم کو واضح ہوئے ہیں مگر میری پہلی رات کی

محبت جلدی عشق میں تبدیل ہو گئی اور پھر وقت

کے ساتھ وہ میرے لیے ایسے دیوتا کا روپ اختیار

کر گئے جن کے قدموں میں میں اپنی زندگی دلا

کے لیے ہر گھڑی تیار رہتی۔ وقت کے ساتھ ساتھ

میرے عشق نے دیوانگی کی شکل اختیار کر لی۔ میں ان

سے کسی نہیں لڑتی ان باتوں پر بھی غصہ نہیں دکھا

جن پر عموں یاں غصہ دکھائی ہیں۔ اگر انہیں

میرے چچا زاد بھائی انظر بیگ نے دیا ہے جو آپ

کے پرانے دوستوں میں سے ہیں۔ انہوں نے

میرے سامنے اکثر آپ کی ملازمتوں کی بہت

تعریف کی ہے۔ اُن کا کہنا ہے کہ آپ سے بڑا

ستاروں کا علم رکھنے والا اس پورے ملک میں نہیں

ہے اس لیے میں آپ سے اپنے بارے میں بات

کرنا چاہ رہی تھی شاید آپ کے پاس میرے مسئلہ کا

کوئی حل ہو یا کم از کم مجھے یہی پتا چل جائے کہ میں

تقدیر کی گردن سے کب نکلوں گی؟“ میں نے

پروفیسر صاحب کو اپنا مسئلہ بتا دیا۔

”دیکھیے محترمہ بات یہ ہے کہ۔۔۔“ ابھی

پروفیسر صاحب اتنا ہی کہہ پائے تھے کہ میں نے ان

کی بات کاٹ کر اپنی بات کہنا شروع کر دی تھی۔

”ہاں ہاں انظر بھائی تیار ہے مجھے کہ آپ نے آج

کل اپنی کل غم پر کتاب لکھنے کی وجہ سے گھر میں

انتقار کر رہی ہے جس میں آپ اپنے تجربات کے

نیچوڑ کا حوالہ دیں گے۔ مجھے خاص باتوں پر روشنی

دلائیں گے جو آپ کے شاگردوں کے کام آئیں گی“

اس لیے آپ آج کل کی کلاسٹیشن میں رہے ہیں

دیکھ آپ کی بات کے ٹائپنگر کہہ رہے ہیں لیکن

یاد رکھیے گا کہ آپ نے اگر میری بات نہیں سنی اور

میرے مستقبل کے حوالے سے مجھے کچھ نہیں بتایا تو

میں آپ کے فون کاغذے ہی اپنے ساتھ کچھ برادر

بنیوں کی۔ ”میری آواز میں ایک ایسا عزم تھا کہ

میں جو کہہ رہی ہوں کر کے دکھا دوں گی۔

پروفیسر ارشد ڈرگے تھے انہوں نے میرا مسئلہ

سننے کی غمازی کی اور اپنے نرم لہجے میں مجھے پانی پی کر

آئے تو کہا تھا۔

”کیا آپ کے پاس ہائم ہے؟ اس کے لیے

مجھے آپ کو اپنی زندگی کی کہانی سنانی پڑے گی؟“ میں

بھی تو کچھ کرے۔“ ان کا کھانا کا مشکل نہیں تھا مگر کھانے کی میز پر بیٹھ کر وہ دھڑپاں بٹختی تھیں کرتے تھے اسے سہاہرت مشکل تھا۔ وہ ایسے سانس سر نہیں جنہیں دنیا میں کبھی نہیں بھاتا، سب ان کے دُکھ، سودیں ان کی پھوپھو اور بیٹے نالائقی..... بس یہاں ہی ان کے لیے سب کچھ تھا پھر چاہے میری نذریں ہی ایک فون ٹھہر کر اسے والدین کی خبر نہ تھی پھر چھین بس پورے دن فونوں کو سنایا تاکہ ہماری باتوں میں کوئی سعادت نہ نکلیں۔ یہاں ان کی خدمت میں یہ بھی کھینچ جان ہی نکل جائے ان کی نظر میں یہ بوری ہے پرانی عورت ہے، چاہے اسی عورت کے دم پر ان کا ٹھہرا راجل رہا ہو اور ماں لایا کہ بیٹھے نہ تھے۔ کھانے کو رپا لے، ایسے لوگوں کے ساتھ گزارہ کرنے کے، پھر کا کبکل چاہے۔ چھوٹی میرے خلاف ہوتے تھے۔ اچھوٹی چھوٹی باتوں کو لے کر گھر میں عازر آئی شروع دیتے جاتی میرے جیٹو توکل کر اپنی بیویوں کا ساتھ دیتے مگر میرے یہاں سارا تماشا شروع ہوتے ہی بے زاری سے کھرے باہر نکل جاتا جس پر ان لوگوں کو اور کل کر کھینچنا کا سوچ لگ جاتا۔ دو دن پہلے کی بات ہے مجھے اپنی چھٹی کوسو نے قتل دودھ پلانا تھا مگر اتفاق سے دن کے وقت میں نے شین لگائی اور دودھ جو لے پر رکھ کر بھول گئی۔ آدے سے زیادہ دودھ جل گیا جو بجھا دیا جانے کے لیے استعمال ہو گیا۔ میں بازار سے منگوا کر بھول گئی۔ ہم جو بھی دودھ منگواتے ہیں اسے پورا کھاتے کے لیے استعمال کرتا ہے۔ ہمارا کھانا تو آواگ تھا مگر میں نے ساری کوسو پر اسدی خرید کر لائے تھے سب اپنی اپنی لٹ لاکر انہیں تمنا دیتے تھے جس پر کب میری جان بھی جل جاتی تھی۔ میری بیٹھائیاں اپنے بچوں کو دودھ پلانے کے لیے الگ سے میز ایک

منگوئی ہیں اس دن بیٹی کو دودھ کی فرمائش پر
نے اپنی بڑی بیٹھائی سے یک دم سے ایک گلاس
دودھ نکال لیا تو انہوں نے جھٹکھڑکھا کر کہا کہ ان
کے بچوں کا دودھ کیوں استعمال کر رہی ہوں؟ حشر
کی بات یہ ہے کہ ان کی ہر غلط بات پر میرے سامہ
سسران ہی کا ساتھ دیتے ہیں کیونکہ وہ ان کی
برادری سے شادی ہو کر آئی ہیں جبکہ میں غیر دار
سے بیاہ کر آئی ہوں۔ میرے سسرال والوں کی ان
مثالوں سے کہ گرامن ان لوگوں کی خوشنودی کے
لیے اپنی گردن بھی کاٹ ڈالوں تو وہ یہ نہیں سمجھتے
مزدہ نہیں آئے، بڑھتوڑا اوپر سے کاٹی۔ ہر حال میں
اس دن بہت روٹی ک ہم تو سارے گھر کا خرچ
اٹھائیں مگر وہ لوگ میری بچی کو ایک گلاس دودھ نہیں
دے سکے۔ آج سو اسد کے گھر میں داخل ہوئے۔
ہی ان کے بڑے بھائی انہیں دے کرے نہیں گئے۔
گئے آدھے گھنٹے میں میری خوب جھگڑائیں لگائی
سارے سر پہلے ہی مایہ بھرنے کو وہاں تیار بیٹھے
تھے۔ جب اسد وہاں سے واپس آئے تو میری ایک
بات سننے کو تیار نہیں تھے عالم میں یہ ہی بول
رہے تھے کہ میری بہت کیسے ہوئی کہ ان کے
والوں سے گھر میں پیسے خرچ کرنے کی بات
کی؟ انہیں اصل بات نہیں بتائی گی تم ہی انہیں
نے میری کوئی بات نہ سنی۔ اب حالت یہ ہے کہ انہیں
نے مجھ سے اپنا ستر الگ کر لیا ہے اور دروازے کو خاموشی
سے بچوں کے کمرے میں چلے جاتے ہیں اور
اندھیرے واپس آ جاتے ہیں۔ میری کسی سوال
بتائی کا ان کو جواب نہیں ہوتا۔ اب میرے آلم
ہی ان کے لیے بے مومل ہیں بن گئے ہیں۔
نے ان کے پاؤں تک پکڑے مگر وہ میرا ہاتھ
کر کمرے سے باہر چلے گئے۔ اب میری حال
ایسی ہی ہے جیسے بغیر محل کے چھل ہوں گے میرے

دل میں ان کی محبت اتنی گہری ہے کہ ان کے بغیر جیسے
کاسوچ رکھ ہی میرا دل بند ہونے لگا ہے۔ اب
تائیں میں کیا کروں؟ اس کے ساتھ ہی میں ایک
بار پھر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی تھی۔

پروفیسر ارشد نے پہلے تو مجھے خوب دلا سے اور
تکلیاں دے کر خاموش کر لیا تھا مگر اب راجہ جی ہانے
کے لیے نام 'تاج' پرنس جانچاں اور دوسری باتیں پوچھی
تھیں اور دور دور بعد انہوں نے کہنے کو کہا تھا اور جب میں
نے دور دور بعد انہیں خون کی آفتاب تو انہوں نے مجھے کچھ
مشورے اور ہدایات دی تھیں۔

جو پوئیسر ارشد نے میرا زائچہ بنا کر مجھے
دہائیات کی گھنٹیں اس پمپل کرتے ہوئے میں پہلے روز
اسد کے بچوں کے کمرے میں سونے کے لیے جاتے
تھے، فلن ہی اپنے بیداروں سے نکل گئی اور بچوں کے
کمرے میں جا کر گانے کے ساتھ سو گئی۔ صبح اٹھ کر
بچوں کو اسکول بھیجا اور پھر ان کے لیے ناشہ بنانے
کے بجائے دوبارہ سو گئی۔ وہ ناشہ کے لیے میرے
ہیڈ کے پاس آکر ملا تھا، مگر کمر میں آنکھ بند کر
پڑی رہی تھی اور پھر جب ایک مہر پورینڈے کے رائی
تو اپنے آپ کو خامسا فریش محسوس کیا۔ بہت دنوں
بعد میں نے بار بار کا پیکر لگایا، امپیر اسٹائل جینز
کرایا، ایک اچھا سا فیشل ایلمنٹری شاپنگ مال میں
جا کر اپنے لیے جدید اسٹائل میں نسلے ہوئے چند
سوٹ خریدے۔ شام کو میں نے اسد کے آنے سے
قبل بلیک فائن کٹھن اسٹ کا غار زور دلا سوٹ زیب
تن کیا، لائننگ چمک چمک اسٹک لگائی، فریوڈم اسپرے
کیا اور پھر میں نے جب اپنے آپ کو دیکھا تو
دیکھا تو خود ہی شرمائی ہو گیا، کتنی اور ہی شخصیت نکلی
میرا غور غور ہو گیا، کتنی نکلتی تھیں۔ ہوائے اچھی
جاتے بنا کر مال میں نکل آئی اور کین کی کرسی پر بیٹھ
کمرے سے بیٹے کی۔ یہ بھی وہیں کھیل رہے

تھے۔ یہ میری شادی شدہ زندگی کا پہلا موقع تھا کہ
میں اس کے بغیر شام کی جائے بیروی تھی ورنہ اس
وقت تو میں ان کے پڑنے نکال کر کھانے کی چیزیں
بناتے ہوئے چائے دم دے کر ان کا انتظار کر رہی
ہوتی تھی یوں مجھے شام کی جائے کے لوازمات
بنانے میں ہی اتنا وقت لگ جاتا تھا کہ کپڑے بدلنے
کا ہوش ہی نہیں رہتا تھا کیونکہ میں اُن کے لیے دو
تین چیزیں بناتی تھی کہ ایک پسند نہ آئے تو انہیں
شاید دوسری کی بجایا جائے پھر بھی اُن کا منہ سیدھا
نہیں ہوتا تھا۔ اس دن ان کے لیے میں نے چائے

کے ساتھ بازاری سوسے رکھے تھے۔ وہ جب کمرہ میں داخل ہونے تو عجب بات ہوئی اسد مجھے پشت سے پچالے نہیں اور بچوں کو واڈے کر مایا اور پچنے لگا اور پھر جب میں نے مڑ کر دیکھا تو حیرت زدہ رہ گئے میں نے دل ہی دل میں پوچھنا شروع کیا کہ کیا ہوا؟ میں نے دیکھا کہ ایک عورت نے ایک بچہ کو اپنے پیچھے لٹکایا ہے اور وہ بچہ ایک کمرہ میں جا رہا ہے۔ میں نے اس عورت کو روک دیا اور اس سے کہا کہ وہ بچہ کو اپنے پیچھے نہ لٹکائے۔ میں نے اس سے کہا کہ وہ بچہ کو اپنے پیچھے نہ لٹکائے۔ میں نے اس سے کہا کہ وہ بچہ کو اپنے پیچھے نہ لٹکائے۔

اسد نے اپنے آفس سے ہفتے بھر کی چٹھی لی ہوئی تھی پہلے جب وہ چٹھی لیا کرتے تھے تو میں صبح سے کچن میں کھس جاتی تھی۔ ان کے لیے نت نئے

کھانے لگائی اور باقی کا وقت ان کے گرد پروانوں کی طرح گزرنے میں صرف کرتی تھی لیکن اس بار میں نے اپنی روایت تو ڈائی پیلے دن بچوں کے ذریعے ان پر زور ڈالا اور میری سب باہر کھانا کھانے گئے یہاں بھی میں نے اپنی توجہ اسد کے علاوہ ہر دور کی چیز پر رکھی تھی۔ میں نے فیروز کی لکڑی والا گدو اور بیلا چوڑی دار پا جاسہ پہنا ہوا تھا کالوں میں سونے کے وہ جھکے تھے جو اسد نے مجھ سے منڈو دکھائی میں دینے تھے بالوں کو کھلا چھوڑ دیا تھا خون رنگ کی لب اسٹک بھی لگائی تھی۔ اس کی نظریں مجھ پر سے ہٹ کر میری تھیں ان سے کوئی پیار بھری بات کہے ہوئے مجھے ایک مہینہ ہو گیا تھا۔ مجھے لگ رہا تھا کہ آج اسد میرے آگے مزاحمت نہیں کر پائیں گے مگر میں بھی ان کے دل سے اپنی محبت کا دریا بہانا چاہتی تھی اسی لیے وہاں پر بچوں کے ساتھ اپنے سیکے انڑکی۔ بچوں کا اور میرا سامان ایک بیگ میں رکھ کر میں نے اپنے بیگلے ہی گاڑی کی پچھلی سیٹ پر رکھ دیا تھا۔ اسد مجھے اور بچوں کو چھوڑ کر اکیلے واپس جاتے ہوئے بہت اداس دکھائی دے رہے تھے۔ انہوں نے بچوں کو واپس گھر چلنے کے لیے چپکے چپکے لاج بھی دیا تھا مگر میں جانے کتنے مہینوں بعد بچوں کے ساتھ سیکے رہنے آئی تھی۔ ان کا تو خوشی سے برا حال تھا اس لیے انہوں نے اپنے بابا کی ہر پریشانی آفریں کر دی تھی۔

ایسی گھر پر دل تو میرا بھی نہیں لگا رہا تھا مگر میں چاہتی تھی کہ اسد اپنے دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر مجھے لینے آئیں۔ میرا اعزاز تھا کہ میرے اسی کے گھر کتنے سے دوہار کی ضرورت محسوس کریں گے۔ دو دن انھیں اپنے میں گزر گئے مگر نہ آئے نہ ان کا کوئی دن آئی۔ مجبور ہو کر میں نے اپنے بھائی سے کہا کہ وہ مجھے گھر چھوڑ دے۔ اس نے کہا کہ میں اپنی گاڑی میں بیٹھوں گا۔ تم آ جاؤ پھر آپ کو گھر چھوڑ دوں گا۔ میں تیار

ہو کر بھائی کا انتظار کرنے لگی۔ ایک مہرے سے درست رہنے کی عادت جو بڑھ چکی تھی۔ بچے لان میں گھر واپسی کے لیے جاتا پھرتا ہوا تو کے کان کا مہرے تھے۔ میں نے سوچ کر اداس بھیجی تھی کہ اسد بھی جی نہیں بدلیں گے میرا دل دور پا تھا کہ میں نے کس سنگدل سے دل لگایا ہے۔ اسے میں بچوں نے آواز دینا شروع کر دی تھیں۔ ”ماما..... چلیں نا“ دور ہو رہی ہے۔ ”میں نے کان سے پر یک ڈالا تھا اور آسو پوچھتی ہوئی بھائی کی گاڑی میں بیٹھنے کے لیے باہر نکلی آئی تھی۔

مگر یہ کیا؟ یہاں تو ہماری گاڑی کھڑی تھی۔ او بانی کا ڈھن سے خوش ہو کر رات کو ایک گیسٹ کی طرف دیکھا تو اسد اپنی دو جاہتوں کے ساتھ بیٹھے سگرا رہے تھے۔ میری تو حید ہو گئی۔ جلدی سے گاڑی میں بیٹھ گئی۔ بچے بھی خوش تھے۔ راستے میں اسد نے بتایا کہ وہ مجھے سر پر انڈیا چھوڑا رہے تھے اسی لیے فون کر کے نہیں آئے مگر ہمارے بچے انچھوڑے گھر والے اس پیاری سی سازش میں شامل تھے۔ آس دن مجھے ایسا لگا کہ میں اپنے سیکے سے پہلی بار رخصت ہو کر اس کی زندگی میں آئی ہوں۔ انہوں نے مجھ سے اپنی غلطیوں کی معافی مانگ لی تھی اور مجھے کھانے پاکستان ٹور پر لے گئے تھے۔

پاکستان ٹور سے واپسی کے فوراً بعد میں نے پروفیسر ارشد سے فون پر رابطہ کیا تھا اور خوش خوش ساری صورت حال بتائی تھی۔

”اس دوران آپ کے سسرال والوں کا رویہ آپ کے ساتھ کیسا تھا؟“ پروفیسر ارشد نے پوچھا۔

”بہت حوصلہ کیا میرے کام سے ہاتھ اٹھا لینے پر انہوں نے بڑے طعنے دیئے میرے میک اور پر انہوں نے میرا مذاق اڑایا مگر میں بہت حساس نہ ہوں۔ انہوں نے اسد کے کان بھی مجھے مگر مکیں کہ اسد کے من کو خود بھی میرے اصرار والی تبدیلیاں

بمباری تھیں اس لیے ایک دن انہوں نے سب کے سامنے واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ کوئی مجھے کسی کام کے کرنے پر مجبور نہیں کرے گا ورنہ وہ اپنی جگہ کے ساتھ نہیں اور شرف ہو جائیں گے۔ سونے کا ٹاڈہ دیئے والی مرفی کو کون ہاتھ سے جانے دیتا ہے دوسرے دن سے سب سدرہ گئے۔ میرے لیے وہ جی احترام گھر والوں کے لہجے میں در آ پا جو شادی کے شروع دنوں میں ہوتا تھا۔ ”میں نے چپکے ہوئے یوں بتایا تھا کہ پروفیسر ارشد بھی جس دینے تھے پھر میں نے بہت بہت شکر کیا اور کہنے کے بعد فون رکھ دیا تھا۔

یہ اس بات کے ایک نمونے بعد کی بات ہے کہ میرے پچازاد بھائی انظر بھی مجھ سے ملنے آئے تھے اور میں ابھی پروفیسر ارشد کے حوالے سے ان کا شکر یہ ادا کرنے ہی والی تھی کہ وہ بول پڑے تھے۔

”ماسا.....! میں بہت شرمندہ ہوں میں نے تمہیں پروفیسر ارشد کا جو مہر دیا تھا وہ اب ان کے زیر استعمال نہیں۔ دراصل انہوں نے اپنا پرانا کمرے کا گھر چھوڑ دیا ہے۔ اب وہ اپنے کھن اقبال میں واقع اپنے نئے گھر میں شفٹ ہو گئے ہیں۔ میری بڑے دنوں بعد کل جب ان سے ملاقات ہوئی تو انہوں نے مجھے یہ بات بتائی اور اپنا پیار بھی دیا ہے۔ تم ان چار بچے کے قریب آؤ ان کوں کر لینا۔“ اس کے بعد انہوں نے ایک جٹ مجھے دیکھی تھی جس پر کالے پین سے پروفیسر ارشد کا کوئی اور نمونہ لکھا ہوا تھا۔

”تو پھر وہ کون تھے جن سے میں پروفیسر ارشد سمجھ کر اپنا حال دل بہتی رہی تھی؟“ یہ سوال مجھے بہت زیادہ پریشان کر رہا تھا۔ میں نے اپنے پچازاد بھائی کے جاگے میں فوراً پروفیسر ارشد کا ہی پرانا نمبر ملا دیا تھا۔ بہت دیر تک بتل رہی تھی کہ مگر میں نے فون نہیں اٹھایا تھا۔ میں نے کئی بار زانی کیا تھا۔ آخر ایک کھٹے بعد کی عورت نے فون اٹھایا تھا۔

محبت کچھ نہیں ہوتی.....

محبت کچھ نہیں ہوتی

محبت کچھ نہیں ہوتی

تمہیں کس لیے سمجھاؤں؟

یقین کر لو

کیسی جگ ہے

محبت اک نظر نہ آنے والے سامنے بیٹھی ہے

ہمیشہ ساتھ چلی ہے

محبت ایک دھواں سا ہے

جو بس تحلیل ہوتا ہے

ہماری زم ناموں میں

ہماری گرم ناموں میں

محبت نم سا ہے اک لہس

جو دل کو بٹلا رکھتا ہے

محبت چاند کے بھیسی

جو اکثر اٹھا نہ رہی مٹی میں نہیں آتی

محبت رات کا جگنو

جو کھلے اور چھپنے ہی میں ابھارے رکھتا ہے

محبت نہ مٹی کی ہے کہ

محبت کچھ نہیں ہوتی

محبت کچھ نہیں ہوتی.....

شازلی سعید مغل، کراچی

ر ر ر ر ر ر ر ر ر ر



عزیزاتِ دل

جواب ماس کا خیال

آنکھوں میں لگے ہوئے ہیں اک عمر کے سداے

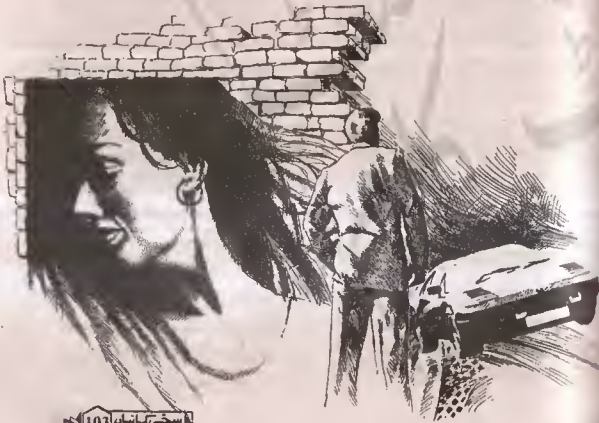
ہاتھوں کی ٹکڑوں میں لکھا کچھ نہیں ہوتا

اکٹی حوصلوں سے گندمی ایک صنفِ نازک کا قصہ درودِ اہل

”شرین!..... آج کل تو تم اسکول سے
چھٹیوں پر ہو میری ایک واقف کار ضرورت مند
خاتون کو free میں انگریزی پڑھا دو۔“

”میرے پاس ٹائم تو نہیں ہے۔ خیر میں
دیکھوں گی۔ فی الحال تو میں چلتی ہوں میرے
Dear hubby دفتر سے آچکے ہوں نے روتی ڈاٹنی

میری طبیعت ساری رات ٹھیک ٹھیک رہی تھی۔
جیسے کسی بے جتنی محسوس ہوتی رہی تھی۔ میں دوسرے
ان اپنی بہت ہی اچھی اپنی ہم نام دوست ڈاکٹر
شرین افضل کے کلینک جا چکی تھی بلڈ پریشر وغیرہ
چیک کرنے کے بعد انہوں نے کچھ دوائیاں دی تھیں
اور چند مشوروں کے بعد کہا تھا۔



”بس بی بی میں ایک نفسیاتی ڈاکٹر ہوں اسی
لیے آپ کے شوہر کی نفسیات کو سمجھتے ہوئے رپورٹیں
سرایا کوچی کی اصطلاح کے مطابق آپ کو کچھ
مشورے اور ہدایات دی تھیں۔ اسل میں مردوں کو
مزاج ہوتا ہے وہ زندگی میں تبدیلیوں کا خواہاں ہوتا
ہے آپ کے شوہر اسمدی ریشم لائف سے اس
لگے تھے آپ نے اُن کے معدے کا تو خیال رکھا
مگر ان کے دل کا خیال رکھنا چھوڑ دیا تھا وہ بیوی کو
بیوی کے رول کے پکڑنا چاہتے تھے خاصہ کے
روپ میں نہیں۔ میرے مشوروں پر عمل کر کے آپ
نے اسکی تمام چیزوں کو ان کی زندگی سے نکال پھینکا
جو انہیں آپ سے دور کر رہی تھیں اور ان باتوں کو ان
کی زندگی میں داخل کرنے کی کوشش کی جس سے وہ
زندگی میں بدلاؤ محسوس کریں کیونکہ ہر وقت بیٹھا
کھانا مزہ سچت ہے اسی لیے آپ نے اپنی سچی
محبت میں تنگنا بین ڈال دیا تھا۔ آپ کے شوہر اسمدی
آپ سے بس یہی مسئلہ تھا جو میں نے دور کر دیا اور
ہاں وہ رازِ غمیرہ وہ تو میں نے صرف آپ کی تسلی کے
لیے بنایا تھا کیونکہ آپ مجھے ستاروں کا علم رکھنے والا
پروفیسر سمجھ رہی تھیں ورنہ مجھے ستاروں کے بارے
میں کوئی علم اور معلومات نہیں ہیں۔“

میری زندگی اب اپنے شوہر اور بچوں کے ساتھ
بڑی بھرپور گزر رہی ہے اور ہاں ڈاکٹر حسن عابدی کا
شمار ہمارے نہایت ہی قریبی فیملی فرینڈز میں ہوتا
ہے۔ وہ مجھے زندگی کو بہترین انداز میں گزارنے اور
سنوارنے کے لیے بے شمار مشورے دے چکے ہیں۔
اُن میں سے ایک مشورہ میں آپ قارئین کو بھی بتا
دیتی ہوں آپ کے لیے بہت کارآمد ہو سکتا ہے۔
”کسی کی نظروں میں اپنے آپ کو سونامی کے
لیے پہلے خود سے اپنے آپ کو سونامی ضروری ہوتا ہے۔“

”مجھے پروفیسر صاحب سے بات کرنی ہے؟“
”اوہ..... آپ کا مطلب شاید ڈاکٹر صاحب
سے ہے اوکے ڈیٹ۔“ وہ نہیں بگڑیں گے ہو
کر آواز دینے لگیں۔ ”عابدی!..... بامعاذی!.....
ارے مجھی آپ کا فون ہے۔ اب آپ کے
مریض مگر بھی فون کرنے لگے ہیں۔ اس محبت
کے سچے میں شرارت تھی۔ تھوڑی دیر بعد میں وہ
مہربان آواز میرے کانوں سے گزری کہ جس کی وجہ
سے میری زندگی کو سکون حاصل ہوا تھا۔
”وہ..... وہ..... آپ کون ہیں؟“ میری سمجھ
میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کہیں؟ ”اچھا آپ کو پتا
چل گیا کہ میں پروفیسر ارشد نہیں ہوں؟“ انہوں نے
جہنم سے ہوئے کہا تھا۔
”پلیز..... آپ اس سپینس کو رُخ دیں۔“
میرے جس اور لکھ میں غلطی تو انہوں نے بھی
مزید وقت بر پا کرنا ضروری نہیں سمجھا تھا۔
”میں ڈاکٹر حسن عابدی ہوں میں نے پروفیسر
ارشد کی جگہ پر کھڑے کر لیے ہیں اس طرح اُن کا پرانا
فون میں اپنا نمبر بن گیا ہے کیونکہ یہ فون ان کے کان
لگوا دیا ہے تو میرے دار کچھ زیر استعمال رہتا ہے۔ اُس
دن آپ نے شاید بلاوی کی انتہائی پرکھی اس خبر کو
پروفیسر ارشد کا نمبر سمجھتے ہوئے فون کیا تھا اور جب میں
نے آپ کو بتایا چاہا تھا کہ میں پروفیسر ارشد نہیں ہوں تو
آپ نے سنی کی زحمت نہیں کی بلکہ کھڑکھڑانے کی
دیکھ دی تھی اس لیے مجھ سے انہوں نے آپ کی پوری کہانی
سن کر اپنی تعلیم اور تجربے کے حساب سے آپ کا کیس
حل کر دیا تھا میں اتنی ہی بات تھی۔“ ڈاکٹر حسن عابدی
نے شکستہ انداز میں مارا مارا کہہ دیا تھا۔
”اوہ..... اچھا تو یہ بات بھی مگر آپ نے ابھی
میں میرے سوال کا جواب نہیں دیا کہ آپ.....“
میں نے جلدی سے پوچھا تھا۔



”ہے۔“ سو وہ کل تمہارے گھر آ رہی ہے۔“ شمرین نے تو جیسے فیصلہ کر ڈالا تھا۔

دوسرے دن میں گھر کے کاموں میں مصروف تھی کہ دروازے پر دستک ہوئی تھی۔ ”اسامہ! اچھا! مٹاں! دروازے پر کوئی ہے؟“ وہ دیکھو کون ہے؟“ میں نے اپنے بچوں کو دروازے سے دیکھ لی تھی۔

”جی! کوئی آئی آپ کو بلا رہی ہیں۔“ مٹاں یہ تیار کر بھاگ گیا تھا۔

”کون آ گیا؟“ میں بڑبڑاتے ہوئے دروازے تک نکل گئی تھی۔ وہاں ایک خاتون موجود تھیں۔

”آپ شمرین اور ایلس ہیں؟“ آنے والی خاتون نے تعجب سے پوچھا۔

”جی! میں شمرین اور ایلس ہوں۔ اور آپ؟“

”میرا نام علیہ ہے۔ مجھے ڈاکٹر شمرین افضل نے آپ کے پاس بھیجا ہے۔“

”علیہ صاحبہ! آپ نے اپنے تعارف کے ساتھ ہی آپ کی وجہ بتائی تھی۔ میں نے انہیں گھر کے بعد بلا کر بٹھانے کے بعد کہا تھا۔“

”علیہ صاحبہ!..... اور میں! میں home tuition نہیں کرتی۔ میں آرام کے علاوہ بچوں کے ساتھ time spend کرنے کے لیے چھٹیوں پر ہوں۔“

آپ کو برا تو لگا ہوگا مگر میں straight forward ہوں۔ خیر اب آپ یہ بتائیں چاہئے میں کیا یا کولڈ ڈرنک؟“ میں نے بہت غلطی سے پوچھا تھا۔

”دیکھیں..... میں بایں ہوں وہی ہوں.....“ یہ کہہ کر انہوں نے رونما شروع کر دیا تھا اور اس قدر روئی تھیں کہ میں میرے لیے ان کو چپ کرنا مشکل ہو گیا تھا ساتھ ہی دل میں یہ محسوس ہوئی پیدا ہوا تھا کہ اس سے پوچھوں آخرا کیا

معاہدہ ہے؟ وہ اتنی پریشان کیوں ہیں؟“ اور پھر میں نے اُن سے یہ بات پوچھ لی تھی۔

پانی وغیرہ پینے کے بعد جب اُن کی طبیعت کچھ بحال ہوئی تھی تو انہوں نے کہنا شروع کیا تھا۔

”میں کراچی میں ناظم آباد کے علاقے میں پیدا ہوئی۔ میری ایک بہن اور بھائی مجھے سے بڑے ہیں۔ اٹھارہ سال کی عمر میں میری شادی انوار احمد نام کے ایک صاحب سے کر دی گئی۔ وہ اس وقت اڑیس سال کے تھے اور پچیس کے اعتبار سے بزرگ

میں تھے۔ ہماری شادی بہت دھوم دھام سے ہوئی۔ مجھے کہنے کا بہت شوق تھا۔ میں دکن میں خلیفہ مریدی میں اپنے شریک زندگی کا بہت دیر تک

تعلق رکھتی رہی تھی اور پھر وہ آخر آ کر آگے گئے تھے۔ میں بہت شرم اور گھبراہٹ میں تھی کہ وہ میرا گھونگٹ

اٹھا کر کچھ نہیں گھر گئے تھے۔ میری آرزو اور امید کے برعکس بس یہ فرمایا تھا۔ ”میں لائٹ بند کر رہا ہوں تم بھی کپڑے تبدیل کر کے سو جاؤ۔“ میں بہت تنگ کیا ہوں۔ لی حال میں آرام کرنا چاہتا ہوں۔“

میں جبران پریشان وادش روم چلی گئی اور کپڑے تبدیل کر کے بڑی دھڑلے سے سونے کے لیے لیٹ گئی تھی مگر صبح سویرے اچانک انہوں نے مجھے جھنجھوڑ کر بگاڑ دیا تھا۔ میں نے آنکھ کھولی تو وہ اپنی مراد مانگ کر اٹھنا کر رہے تھے۔ میرے لیے یہ سب کچھ بڑا عجیب تھا اور پھر انہوں نے بس اپنی ضرورت پوری کر لی تھی اور دوبارہ سو گئے تھے۔ یہ سب محسوس نہ

کیا تھا کہ میں روم میں ہوں میں روتے ہوئے یہ سوچ رہی تھی۔ لیکن ہوتی ہے سہاگ رات؟“

میری شادی شدہ زندگی کا آغاز بہت تکلیف دہ اور اذیت ناک تھا۔ انوار میری ہر بات پر چیز میں برائی تلاش کرتے تھے میرا بولنا آئیں بولنا ایک لکھا تھا۔

میں نے انہیں کہا تھا۔ میں باتوں ہی مگر جب سے یہاں آئی تھی کم بات کرتی تھی۔ انہیں میرے کمانے میں ہمیشہ تنگ کیا زیادہ لگتا میری عمر کم

”بات ہوئی ان کے لیے مسئلہ تھی۔ اکثر کہتے ”تم بچوں جیسی حرکتیں کر رہی ہو۔“ میری ہر پسند نہیں

پاسند تھی۔ کپڑوں میں میرا پسند یہ رنگ لگانی تھا وہ کہتے۔ ”لگانی رنگ میں تم بند رہا لگتی ہو۔“ میں فی

ملی پر جو بھی پچھل لگاتی تھی غصے میں آ کر پوچھتے۔ ”یہ کون سا پچھل دیکھ رہی ہو؟“ غصہ بھی ایسا تھا کہ جو

پچھل ہاتھ میں ہوتی دسے مارے۔ ”بہی قسمت ہی تھی کہ میں زیادہ تر اپنے آپ کو بچا لیتی تھی۔ میری عقل و

صورت میں ہمیشہ نقص نکالنے والا تھا کہ میں کافی خوبصورت تھی۔ میں اکثر سوچتی۔ ”کیوں یہ نفسانی

کریں تو نہیں؟“ اُن کے ساتھ میرا دل تو کسی نہ کسی صورت ٹوٹ جاتا تھا لیکن شب تو بہت ہی اذیت

ناک ہوتی تھی۔ رات ہوئی تو وہ وحشی روندہ بن کر میرے اوپر ٹوٹ پڑتے تھے لگتا ہی نہیں تھا کہ وہ

انسان ہیں۔ میں روئی اور شکایت کرتی تو جواب ملتا۔ ”یہ تو میرا حق ہے تم میری بیوی ہو میں چاہے

گھبراے ساتھ جو بھی سلوک کروں۔“

ان کے انجی رویوں اور حاکم کی وجہ سے رفتہ رفتہ میرے دل سے ان کا احترام بالکل ختم ہو گیا تھا۔ خیر زندگی کا سفر ایسا ہی چلتا رہا کہ ایک روز ان کے سامنے اچانک ہی مجھے لٹائیاں شروع ہو گئیں۔

”یہ تمہیں کیا ہو رہا ہے علیہ؟“ انوار احمد نے وادش روم کے دروازے پر کھڑے ہو کر مجھ سے پوچھا تھا۔

”میں pregnant ہو گئی ہوں شاید برسوں اماں کے یہاں بھی لٹائیاں ہوری تھیں۔ انہوں نے تنبیہا

سنو.....!

سنو.....! میرے قریب تو آؤ

بہت اداس ہوں میں

بس آج نوٹ کے چاہو

بہت اداس ہوں میں

اندھیری رات ہے کچھ بھی نظر نہیں آتا

ستارے تو کھلے لڑا بہت اداس ہوں میں

زور ہیبا ماہی۔ ملائیشیا

”کیسے ہو سکا ہے؟“ انوار احمد نے غصے میں میری بات کاٹنے ہوئے مجھے ٹھٹھڑا رہا تھا۔ ”تو خود

ابھی پچی سے پچھو کیا پالے گی؟ اور کیسے؟ تو مجھے یہ بات آج بتا رہی ہے۔ مجھے یہ پچھنیں چاہئے۔ کل

جلدی سے تیار ہو جاؤ میں تجھے ڈاکٹر کے پاس لے جا کر یہ قصہ ہی تم کو رواں دوں۔“

”میں..... میں اس بچے کو abort نہیں کرواؤں گی یہ میرے لیے اندھیرے میں جا لانے کی

آخری کرن ہے۔“ میں یہ فیصلہ کر کے بیڑ روم میں آئی تھی اور اپنے کپڑوں کے چند جوڑے اور ضرورت کا کچھ سامان بیک میں ڈالا تھا۔ انوار احمد

اُس وقت وادش روم میں تھا۔ میں ابھی اُس گھر سے نکلتا ہی چارہ میٹھی کرنا اور وادش روم سے باہر آیا تھا اور میرا وہاں جان کر اُس نے مجھے بالوں سے پکڑ کر کھینچا تھا۔

”کیسے؟“ تو اس حرامی کو پیدا کرنے کے لیے میرے گھر سے بھاگ رہی ہے مجھے میں چاہوں تو تیری کوکھ میں ہی رادوں۔“ یہ کہہ کر مجھے اس نے اتنا مارا تھا کہ میں گھر کے بے ہوش ہو گئی تھی۔ بے

ہوں ہوتے ہوئے مجھے ایسا لگا تھا جیسے پڑوس کے کچھ لوگوں کی آواز کے ساتھ کہ کاروازہ زور زور سے بجایا جا رہا ہو۔

میری آنکھ کی جی تو ایسا میرے سر ہانے موجود تھے۔ ”اب کسی ہو گیا؟“ ابانے میرے پر شفقت سے ہاتھ پھیرا تھا۔ میں اب اسے لپٹ گئی اور روتے روتے faint ہو گئی تھی اور پھر پانی کے قطرے منہ پر پڑے تو ہوش آیا تھا۔

”ابا!۔۔۔ یہ بچہ میری زندگی کے مجھے نہیں مارتا اس کو۔۔۔“ میں نے روتے اور پلٹتے ہوئے کہا تھا۔

”تم کمرمت کرو میری جان۔۔۔۔۔ اب تم جیسا چاہو گی ویسا ہی ہوگا۔ اس انوار کی تو ایسی کی جیسی تم بس اور کام کرو۔“ یہ کہہ کر ابا چلے گئے تھے۔

”ای۔۔۔۔۔ اودھ میرے بچے تکلیف دیتا تھا۔ میں ہر رات کانٹوں پر سوئی تھی۔“ میں نے اسی کا ہاتھ چوم لیا تھا۔

میرے سخت اور کڑے وقت میں پڑی بہت کام آئے تھے۔ انہوں نے جی اس خاں عالم انوار سے مجھے بچایا اور میرے ہاں باپ کو لایا تھا اور پھر بڑی مشکلوں سے اس نے مجھے شمع دی تھی۔ شمع کے ساتھ ہی اللہ نے مجھے ایک چاند سا بیٹا دیا تھا۔ اس کا نام ہم نے مہربان رکھا تھا۔

.....

وقت کا سفر چا دی رہا تھا۔ مہربان عمر کے زینے پر قدم رکھتا چلا گیا تھا۔ باد جود اس کے کنارہ اسی مجھے سپورٹ کرتے تھے۔ میں نے گئی کے اسکول میں نوکری کی تھی اور اپنی اولاد کی پرورش کے لیے خود بھی رزق حلال کمانے لگی تھی۔ اس دوران میں انوار احمد کے بارے میں خبریں ملتی رہیں تھیں کہ اس نے دوسری شادی کر لی تھی اور اولاد فرید کی خواہش میں

لگا تا رہا بیچ بیچوں کا باپ بن گیا تھا۔

اُس روز میں اسکول سے جیسے ہی نکلی تھی ایک سفید بھڑکیا میرے سامنے آ کر رکی تھی۔ کار کا دروازہ کھلا تھا اور انوار احمد نے ہارے ہی مہربان کو گتے لگایا تھا اور نہایت جذباتی انداز میں بولا تھا۔

”یہ میرا بیٹا ہے نا؟“ میرے دل کا ٹکڑا ابھول گیا۔ یہ میرا بیٹا ہے نا؟“

میں نے خوب سوچ سمجھ کر جواب دیا تھا۔ ”ہاں انوار احمد! یہ تمہارا بیٹا ہے وہ بیٹا جس کی دنیا میں آنے سے پہلے ہی تم جی ان کے دشمن تھے تو پھر آج یہ سب کیا؟“

”دیکھو پلیز مجھے معاف کر دو مجھے اپنی اولاد سے ملے دو۔“ وہ جیسے میرے آگے گڑ گڑانے لگا تھا۔

ہمارے چاروں طرف اب لوگ جمع ہونے لگے تھے۔ میں نے انوار احمد کی توجہ اس طرف دلائی تھی اور مہربان کا ہاتھ پکڑے ہوئے اپنے کمر کی راہ لی تھی۔ انوار احمد بھی میرے پیچھے پیچھے میرے کمر کے دروازے پر اور پھر میرے کمر کے اندر بھی آ گیا تھا اور اسے بہت دیر تک نہ جانے کیا بات کی تھی۔

انوار احمد کے جانے کے بعد ابانے آواز دی تھی۔ ”بیٹی علیہ! ادھر آؤ۔“

”جی ابا!۔۔۔“ میں جواب دیتے ہوئے ابا کے پاس بیٹھ گئی تھی۔

”بیٹی! انوار احمد اپنی اولاد سے ملنا چاہتا ہے اور یہ تو قانون بھی جائز ہے وہ اپنے بچے کے لیے خود کو خرچ دینا بھی دیتا چاہتا ہے۔ آج تمہارا بیٹا مہربان آٹھ سال کا ہے مجھے ابا کہتا ہے کہ جب کل بڑا ہوگا اور باپ کا پوچھے گا تو کیا جواب دو گی؟ اب فیصلہ تمہارا ہے؟“ ابا نے کہنے کے بعد اٹھ کر چلے گئے تھے اور میں اپنے کمرے میں آ گئی تھی۔

سارا دن اور ساری رات سوچتے ہوئے ہی گزرتی تھی۔ زندگی کی ظلم کی طرح آنکھوں کے سامنے کھونٹے کی گچی اور پھر جگ آذان کی آواز پر غناز سے پہلے ہی فیصلہ کر چکی تھی۔

صبح اسکول جاتے ہوئے میں نے ابا سے کہا تھا۔ ”ابا! اب آپ کی دیکل سے مل کر مہربان کا اپنے باپ سے ملاقات کا قانونی طور پر کوئی طریقہ طے کر لیں یہ فیصلہ میں صرف اور صرف اپنے بیٹے کی بھلائی کی خاطر کر رہی ہوں۔“

ابانے میری بات سن کر مسکراتے ہوئے کہا تھا۔ ”دوسرے بیٹا! مجھے تو وہ انوار ابا کی اب بہت بدلا لگتا ہے۔“ ابا کی یہ بات سن کر میں بس ایک ٹھٹھری ساٹھ ہی بھر کر رہ گئی تھی۔

اُس دوپہر اسکول سے واپس آنے کے بعد کھانے وغیرہ سے فارغ ہو کر میں نے اپنے بیٹے کو آواز دی تھی۔

”مہربان! کہاں ہو تم؟“

”میں یہاں ہوں گی! تمہاری آنکھیں نے مجھے ڈرتے ڈرتے تھیل کے نیچے سے جواب دیا تھا۔

”تھیل کے نیچے کیا کر رہے ہو؟ باہر آؤ۔“ میں نے ڈانٹتے ہوئے کہا تھا۔

”بھی ادا نکھل کون تھے میرے سر پیچا؟“ مہربان نے اپنی بڑی پرانی غلائی آنکھوں میں حیرت بھر کے پوچھا تھا۔

”وہ آپ کے پیچا ہیں اور ابا! میرے ابا ہیں۔“ ٹھیک ہے وہ آپ سے ملنے آئیں گے تو آپ کے لیے Toys آپ سے لے کر آئیں گے۔“ میں نے اپنے پیار سے اسے سمجھایا تھا کہ ابا کے کمرے سے سو بائیں کی اسکرین پر کوئی انجمن نمبر کدوار ہوا تھا۔ کون ہو سکتا ہے؟“ یہ سوچتے ہوئے میں نے کال ریسیو کر لی تھی۔

دوسری طرف انوار احمد تھا۔ وہ کہہ رہا تھا۔ ”دیکھو علیہ! میری موجودہ بیوی ابھی نہیں ہے بہت سخت اور بدمعاش ہے۔ تم واقعی بہت اچھی تھیں۔ پلیز“

میری زندگی میں لوٹ ڈال مجھے ابا نے مہربان اپنے کیے پر بہت شرمندہ ہوں۔ وہ تمام حُرمتیں جو میں نے کس گناہ کا جک ہو گئی تھیں۔“

میں نے حوصلے سے جواب دیا تھا۔ ”انوار احمد! میں تمہارے بچے سے تمہیں ضرور ملے دوں گی اور رہی بات تمہاری اور میری تو ایسا ممکن نہیں ہے اور ہاں تم نے کہا کہ تم اپنی بیوی سے خوش نہیں ہو تو تمہاری پانچ عدد اولادوں سے انکار ہو گیا۔ تم مردوں کا بھی جواب نہیں بیوی پھند نہیں مگر اولاد کی اس بی بیوی سے خوب پیدا کرتے ہو۔ میں اب آٹھ نو سال اکیلے رہا ہوں اب مجھے کسی مرد کے سہارے کی ضرورت نہیں! تم نے مجھے اس قدر جہانمی اذیت دی اور abuse کیا کہ مردوں کی ذات سے میرا اعتبار ہی ختم کر دیا۔ یہ تو سب کچھ تمہارا تھا اگر تم مجھے پکار کر تو میں تم پر اپنا جسم و جان سب قربان کر دیتی۔ تم پر اب اعتبار کیسے کروں؟ ہر حال تمہارا بیٹا مہربان قانوناً باشرعاً اب نو سال کا ہونے والا ہے وہ تم سے مل سکتا ہے اور ہاں انوار احمد! اللہ نے تم کو پانچ بیٹیاں امتحان کے طور پر دی ہیں۔ اللہ سے اپنے گناہوں کی معافی مانگو۔“ یہ کہہ کر میں نے فون بند کر دیا تھا۔

.....

انوار احمد اعلیٰ حکم کے تحت اپنے بیٹے مہربان سے سینے میں دوا ہلنے لگا۔ مجھے سینے سے ہی چا چلا تھا کہ اس نے داڑھی رکھ لی ہے اور پچھ لوگوں سے یہ بھی سننے میں آیا کہ وہ بدل گیا ہے۔ ایک دن ملاقات کے بعد وہ بیٹے کو پھوٹنے آیا تو کیٹ میں

.....

.....

.....

.....

.....

حقیقی جاگتی تحریریں ☆ زندگی کی ہفت رنگ تصویریں

حیف عمر

گرگوش رنگ چمن

رسالہ چٹائی کا خیال
صرف مانع حقی جیابند قلم کے
پھر تو وہ جان حیا ایسا کھلا ایسا کھلا

اس عورت کا حقیقی روپ سامنے لائی کہانی جسے زائد طوائف کہتا ہے دوسرا حصہ



نے ہی گھولا۔ اس نے سلام کیا۔ واقعی وہ کچھ کچھ تو بدل گیا تھا۔ کہنے لگا۔ ”کیا تم مجھ سے دوبارہ نکاح کر سکتی ہو؟ میں حلال کا سارا انکشاف کر دوں گا۔ میں اب اپنی غلطیوں کا کفارہ ادا کرنا چاہتا ہوں اور میں.....“
”انوار احمد! تم بالکل بھی نہیں بدلے۔“ میں نے اُس کی بات کاٹی مٹی۔ ”تم آج بھی آئے ہو تو حلالہ کی بات لے کر کر میں تو تم کو اپنی زندگی سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے نکال چکی ہوں۔“ میری یہ بات سن کر وہ ہر جھکے ہوئے چلا گیا تھا۔

وقت کے دھارے پر میری زندگی کا سفر جاری رہا۔ اسی اور اباضعیف ہو گئے تو بھائی شادی شدہ۔ مہربان نے چوٹی سے رشتہ جوڑا تو میرے بالوں میں چاندنی چٹکنے لگی ہے۔ انوار احمد! اُس دن کے بعد خود کی میرے پاس نہیں آیا، کبھی بھار اُس کا کوئی خط آتا ہے شرمندگی سے پھر ہوا وہ اپنے بیٹے مہربان کا بہت خیال رکھتا ہے۔ کبھی بھار اُسے اپنے گھر بھی لے جاتا ہے۔ مہربان ویسا ہی بنا ہے جیسا میں نے چاہا۔ میں اب ایک اسکول میں Maths کی استاد ہوں مگر آج کل انگریزی کا دور دورہ ہے لہذا میں آپ سے انگریزی پڑھنا چاہتی ہوں۔ میرے بیٹے نے بیرونی ملک اسٹوڈنٹ ویز کے لیے اپلائی کیا ہے۔ وہ دہاں جا کر مجھے دیڑھے لگا۔ مجھے انگریزی نہیں آتی اور زندگی میں کچھ پانے کے لیے محنت کرنی پڑتی ہے۔ میں اب چالیس سال کی ہوئے والی ہوں مہربان تقریباً پائیس برس کا ہو رہا ہے۔ وہ پڑھائی کے ساتھ job بھی کرتا ہے، بس یہی ہے میری کہانی لوگ اپنی بیٹیوں کے لیے بڑے گھر بہت پیسوں والے کی خواہش کرتے ہیں کروڑ نہیں جانتے کہ دور کے ڈھول سہانے ہوتے ہیں۔ میرے گھر والوں نے بھی میرا بھلا ہی چاہا تھا

گر.....“ وہ پھر رونے لگی تھیں۔
میں انہیں غور سے دیکھ رہی تھی۔ لہذا پڑی بڑی آنکھیں گورا رنگ کتابی چہرہ چالیں کے بجائے دہم کی لگ رہی تھیں سر پر دو پشاورا حاتھا اس میں سے رنگی بال جھانک رہے تھے۔ میرے دل میں آیا تھا ان سے کہوں۔

”Why don't you get married again?”

شاید وہ میرے دل کی بات سمجھ گئی تھیں۔ میں اب شادی نہیں کر سکتی۔ ہمارا معاشرہ اس کی عورت کی شادی مشکل سے قبول کرتا ہے جو جوان بننے کی ماں ہو۔ اب یہ لگ بات ہے کہ بیٹا اپنی شادی کے بعد ماں کو بیوی کے کہنے پر گھر سے نکال دیں کیوں نہ دے۔

میں نے انہیں صرف پڑھانے کی حاکم ہی نہیں بھری تھی زندگی کے ہر سو پر ان کے کام آئے گا بھی سوچ لیا تھا۔

محترم قارئین..... میری اکثر کہانیوں میں عورت کی زندگی دھوئیں سے بھری نظر آتی ہے جبکہ یہ حقیقت ہے کہ عورت بہادری کا نام ہے۔ اللہ نے عورت کو فوٹو اس سے زیادہ مستحویا گلاب کی عکسوں سے زیادہ نرم سمندر سے زیادہ گہرا اور جھٹوں کا اصول خزانہ بنایا ہے۔ ہمیں عورت کے ہر روپ کو اہمیت دینی چاہیے اور یہ سوچنا چاہیے کہ اللہ کو جب اپنے بندوں کو پیارا کیا تو اس نے عورت کو تخلیق کیا ایک بہت بڑا احسان کیا۔ اللہ کے بعد اگر کوئی نہیں سب سے زیادہ پیارا کرتا ہے تو وہ ہے ہماری پیاری ماں..... تو آج سے اپنی ماں کی قدر کریں اور گھروں میں عورتیں آپ کی ماں بہنیں اور بیویاں ہیں ان کو انسان سمجھیں اور ان کا خیال کریں۔ عورت صرف محبت کی عکس ہوتی ہے۔

”غربت.....“ ایک سرد آواز مالتا تھا کھینچی اور اس کی آنکھوں میں کچھ اس طرح کے احساسات کے عکس بن کر بکڑنے کے جیسے وہ ماضی کے ہیولوں کے جیسے دوڑ رہی ہے۔ کس منظر میں رکے اور کسے چھوڑ دے فیصلہ نہیں کر پا رہی۔

”عالم! آپ احتیاط سے کام لے رہی ہیں؟ منظروں کے چٹاؤ کے فیصلوں میں ابھی ہوئی ہیں؟“ سائرس نے تادیر خاموشی کو محسوس کرنے کے بعد کہا۔

”شاید آپ صحیح کہتے ہیں، ایک کیسے والے کی نظر اتنی ہی گہری ہوئی چاہیے۔“ وہ ہلکی سی مسکراہٹ کے بعد کہہ ہوئی۔

”دنیا سے طوائفوں کو بھی ڈر لگتا ہے؟“

”ڈر..... عورت کا سب سے بڑا دشمن ہے کیونکہ وہ محکم میں یا کسی عمارت کی زندگی تیسروں اور زور سے لوٹ پوٹیں بناتی رہی۔ ہزاروں طرح کی زنجیریں پہنائی گئیں اور وہ جتنی توڑی جاتی ہے اتنی ہی پھر بھادی جاتی ہیں اس حد تک کہ جب وہ پوری طرح آزاد ہو جائے گی تب بھی اس احساس سے بچنا نہ پڑا اس کے کیڑ زنجیریں اس کی تنہی گہری ریتیں اور سما کی دہی ہیں بس کچھ وقت گزرنے کے بعد مہرما ہوا رہتا ہے تو یوں کچھ طوائف کے پاس شریف اور بارگاہ لیکچر جیسی عزت اور اس کے ٹھکانے جانے کے ڈر بیلے ہی نہ ہو براں ڈر کا احساس عورت کے وجود میں ہمیشہ لکڑی مارے بیٹھا رہتا ہے۔ کیا طوائف کو عورت نہ سمجھنے سے دعوت نہیں دیتی؟“

”ہاں! تو اتنی گہری باتیں انکس سے کیجیے گی؟ میں نے تو تجھے ہمیشہ منہ بجا دھمکی کا لیا اور قہر کا رو باری گشتگو کرتے ہی دیکھا ہے؟“ نفرت نے قدر سے سنجیدگی سے کہا۔

”تیرا دوست قلعہ ہے“ لکھتا ہے اور حکیم کے گھر

کے چوبے بھی سیانے ہوتے ہیں۔ اتنی دیر اس بڑے کیسے آدمی کی محبت میں بیٹھنے سے کچھ غلطی ہو گئی..... کہ تو لگتا ہے دیوار کے ساتھ لگا پتھر ہے جو دیوار کی ٹیٹیں بن سکدیں پتھر کا پتھر ہی رہے گا۔“

”آپ دونوں آپسی گفتگو چھوڑیں اور آپ باہر لٹا اپنی کہانی کو دہیں سے شروع کر میں جہاں سے چھوڑی تھی۔“ سائرس کو لگا دونوں پتھر بکھارنے نہ لگیں کہیں۔

”کہاں سے چھوڑی تھی؟“ وہ کچھ عجیب سی مسکراہٹ سے بولی۔

”آپ فیصل کے گھر نہیں آئے وہ پھر اکیلا تھا۔“ سائرس نے اس فضا کو دانستہ اپنے لہجے کی تعمیر بنا کر مزید لہر بنانا لگا۔

”ایک دفعہ تو قلعہ تھی مگر مجھے لگا کہ بار بار بچ نہ پاؤں گی یہ وقت مجھ پر آتا ہی رہے گا اور کسی نہ کسی وقت شکاری میرے پر بوجھ ہی ڈالے گا بس یہ سوچ تھی جس نے مجھے آغا خان طوائف بنایا اور بچ پوچھو سائرس۔ طوائف بھی عورت ہے اسے صرف سوچ کی برکتی نے ہی طوائف بنایا ہے۔“ سائرس چپ رہا۔ وہ مالتا کہ بولنے کا زیادہ موقع دینا چاہتا تھا۔

”پھر میں گھر میں داخل ہوئی سوچوں کی پینٹلی نے ایک ایسی جست میں مضبوط عورت کا روپ دھار کر کر لیا کہ میں نے اس ملاقات کو خود طے کیا اور کہاں سے شروع ہو کر کہاں تک لے جاسکتی ہوں بس پھر فیصل کو کچھ سے قلعوں کی طرح زور دے زانی کر کے میری عزت کو سننے کی ضرورت نہیں رہی۔ میں اسے ایسا ماحول اور اتنی گرم جوشی دینی کہ منزل تک پہنچنے سے پہلے ہی ڈیر کر دیتی تھی۔ یہی تھی میرے طوائف بننے کی ابتدا..... یہ حد دلا دینا تلیاں اور خوشامامیوں کی دنیا میں لے جانی کہ میں بہت

جلد اس کی سب خواہشیں پوری کر دوں گی مگر یہ آدمی اپنی عزت و عصمت بھی بڑے طوفانوں سے زور دیتی تھی۔ بڑے غدا ہتے جن سے میں نے ثواب کمانے بہت سے روپے مجھے فیصل سے مل جاتے تھے بس یوں کچھ کو جتنی قیمت لے رہی تھی اتنے ہی مزے لے جاتی تھی۔“

سائرس کا دل چاہا کہ وہ مالتا سے پوچھے کہ اس وقت بھی اس طرح طوائفوں کی طرح سوچتی تھی اور پھر اسے لگا کہ مالتا نے اس کی سوچ معاذ پر دہلی ہے۔

”تم سوچے ہو گے کہ ایک روز نیرودہ میرے جس کا وجود خواہوں اور پھر میں سے لبالب بھرا ہونا چاہیے وہ سنیں جتنی لوگ اپنی بازاری باتیں بھی سوچ سکتے تھے تو تم غلط نہیں سوچتے۔ میں اس کا بائیں اس وقت نہیں سوچتی تھی۔ اس وقت میں بائیں اس وقت اس بات پر ناکل کرتی تھی کہ وہ میرے جسم کو لوٹنے کے بجائے میرے من کے مندر میں دیوتا بن کے بیٹھ جائے۔ میں ساری عمر اس کی پوجا کرنا چاہتی تھی۔ کہتے ہیں محبت خورد پرورے کی طرح آپ ہی آپ جنم لیتی ہے اور خورد ہی دل کی زمین میں چپ چاپ آگئی ہے۔ بندہ نہ چاہے بھی پوری زبردستی اور زور مٹائی سے تار و درخت جتنی چلی جاتی ہے جیسے وہ غالب نے کہا ہے تاکہ

”عشق پر زور نہیں ہے یہ وہ آتش غالب جو لگنے نہ لگے اور بھجائے نہ سے“

”ہائیں! ایسی بحثیں کس خوش نصیب لیکچر کا مقدر بنتی ہیں؟ میں تو اپنی ضرورت کی چٹلی میں زور زبردستی سے محبت کو بند کرنے کی ادھیڑ میں تھی اور دل سے چاہتی تھی کہ فیصل مجھ کو مال مجھ کے ڈلوے بلکہ عزت سے اپنے دل میں اور کمر میں جگہ دے اس سوچ کو دن رات اپنا ہویا پاتی اور فیصل کی

ہر طرح کی خستہ سوں کے یاد جو اسے محبت کے رستے پر چلنے کی ترغیبیں دیتا۔ ہر روز جب وہ ملتا لبالب اس سے ایسے سوالات کرتی کہ وہ مجھے اکیلے میں یاد کرتا ہے؟ میں اس کے خواہوں میں آتی ہوں یا نہیں اور میرے بارے میں اس کی سوچیں کیا ہیں؟ اس کی راتوں کی تینداڑی کہ نہیں؟ ایک مہم کی امید پر جانے کتنی ہی بار میں نے فیصل سے ایسے سوالات کیے مگر ہر بار اس کی ہوسنا کی اور بڑھتی ہوئی دست دازنی ہی میرا نصیب بنتی۔ وہ بس مجھے جلد سے جلد واقف کرانے اور پھر سستی کر رکھنے جانتا ہے۔

یہ مضر نظر آتا۔ میں جتنا اسے پا کیزہ اور آرزوؤں اور باتوں بھری محبت کی داستان میں اور حکایتیں سناتی۔ وہ اتنا ہی مجھے دیوبچ لینے کو چھتا۔ میری سب طرح کی باتیں اس کو بھی بس یہی کہتا کہ.....

”وہ تو سب ٹھیک ہے“ محبت تو میں تھم سے ہی کرتا ہوں مگر اب تو محبت میں اتنا بھی نہیں کر سکتی کہ تم کے ایک دفعہ ہی میری بات ان لے۔“

”سب شادی کے بعد اچھا لگتا ہے شادی سے پہلے ہی غلط بات ہے۔“ میں بڑی تیزی سے اس کے چہرے کو کچھو کر کہتی۔ ”مگر آج سوچتی ہوں ٹھیک ہی لگتا ہے کہ میرے آگ لگائے سے لگ نہیں جاتی اور لگ جائے تو اس کا بچھا نا مشکل ہے اس پر میری باتوں کا کوئی اثر نہ ہوتا۔“

”شادی تو میں تھم سے کر ہی لوں گا مگر اس میں ابھی دیر ہے۔ مجھ سے بڑا ایک بھائی اور ایک بہن بیٹھے ہیں، پہلے ان کی ہونگی پھر کہیں جا کے میری باری آئے گی۔ دیکھ! اتنے عرصے تک مجھ سے انتظار نہیں ہوگا۔ میں تجھے چھوٹا ہوں تو تیرے جانے کے بعد بھی ہم انکا سے کی طرح دیکھتا رہتا ہے جیسے سندر میں ہمارے بھی سوکھا کے سوکھا..... دیکھ! ان باتیں تو

کسی دن زبردستی وہ سب کروں گا جس کے لیے اسے پیار ہے تجھے بھار ہوں۔ میں غصہ ہو جائی اسے مار کوٹنے لگا اور وہ..... نا اہل تار کی۔

سائرس نے گہری خاموشی نظروں سے اس کی طرف دیکھا اور اس اطمینان کے بعد پھر بہت کوشش ہو گیا کہ وہ اب بھی اسی منظر میں بسی ہوئی تھی۔ وہ اور سرکش ہو جاتا تو بڑی گہری اور ڈرا دینے والی سرگوشی مانتی۔

”جو کچھ ہو گیا تو؟“
”کچھ نہیں ہوگا میرا وعدہ ہے۔“ کچھ دیر کی خاموشی کے بعد وہ جواب دیتا۔

”تو کیا نہیں یقین دلاتا ہے میں خوب جانتی ہوں تجھے اور تیرے وعدوں کو۔“
”تو تو نہیں مانے گی؟“
”نہیں.....“

”بس یہی ہے تیری محبت..... اتنی ہی قربانی تو دے نہیں سکتی تو کیا محبت کرے گی حرافہ؟“ وہ اپنی اوقات پر آ جاتا۔

”اور تو تیری محبت کیا ہے؟ بس مجھے برباد کر دینے سے کام ہے تجھے۔ جو ڈرا بھی غلطی ہو تو میں کسی کو سزا دھانے لائن نہیں رہوں گی۔“
”تو پھر ٹھیک میں وہ کروں گا جو تجھے ٹھیک لگتا ہے۔“

”زبردستی کرے گا تو میں جنوں کی جلاؤں گی.....“

”اول تو میں تجھے چیخنے چلانے دوں گا نہیں جو تو پھر بھی نہ مانی تو سمجھ لے اس میں نقصان تو سراسر تیرا ہی ہے۔ منہ والے تجھے ہی برا بھلا کہیں گے۔“ وہ خفا سے بولا۔

”اور تو صاف جی جائے گا؟“
”اور نہیں تو کیا؟ کہہ دوں گا؟ بچے کو اکیلا دیکھ کر

خود ہی سر ہو رہی تھی۔“

”ایسے بولے گا بے شرم؟ اور تو بچہ ہے؟“ ہنسنا چاہتی تھی پر ہنس نہ کی۔

”اس سے بھی زیادہ کہ تو کب سے مجھ سے پیسے اٹھ رہی ہے اور آج پیسے نہیں دے تو لگی کر کرتے؟“ میں عجیب بے بسی سے اسے دیکھتی رہتی اور مجھے لگتا کہ اس شیطان نے اس سے بھی زیادہ کی توقع کر لی ہے۔

”اب ہم دونوں میں یہ کشمکش کئی دنوں تک چلی۔ اس نکلے میں ایسی عورت دو چار ہی نہیں جن کے خاندان کروں سے باہر کارنے گئے تھے اور انہیں گبنے لئے بنائے اور خریداری کرنے کے علاوہ کوئی دود کا کام ہی نہیں تھا۔“ بیس باجی کے علاوہ باجی کی عورتیں شہر میں درزیوں سے سلوائی تھیں یا ان کی کپڑے سینے والیاں موجود تھیں جو پیسہ دیکھ بھال اور سوچ سمجھ کے خرچ کرتی تھیں وہ سال میں تین چار بار ہی کپڑے بناتی تھیں۔ دونوں عیدوں پر یا پھر کسی کے شادی یاہ راسباب یوں چار پانچ مہینوں سے تو ہمارا کر چل نہیں تھا۔ اس طرح بیس باجی خود میری سب سے بڑی ضرورت بن چکی تھی۔

اسے چھوڑنا میرے لیے بھی جیسے کسی نے نہ رہا تھا۔ کسی بھی جب رات کو مجھے ایسی گھبراہٹ دہائی سوچوں کی وجہ سے نیند نہیں آتی تھی تو میں بڑے دل سے دعا کرتی تھی کہ اللہ کرے فیصل کا ایک کنڈٹ ہو جائے اور وہ مر جائے۔ یا اسے بھی میرے ابا کی طرح پولیس والے اٹھالے جائیں اور مار مار کے جان سے مار دیں کیونکہ میرے اور کھر کے بیچ جو پیٹ لگا تھا اس کے رستے کی سب سے بڑی رکاوٹ یہ مڑی فیصل ہی تھا حالانکہ جتنی بار وہ مجھے چھوچکا تھا ان کوں اور ان منظر کو یاد کرنے کے بعد میرے دل میں ہمیشہ بھی ایسی ایک خیال آتا تھا کہ اب میں

کسی اور کے لائق نہیں رہی۔ جب بھی بڑ میری شادی ہی حرام خور سے ہو مگر ہر طرح کے بہت کر کے میں بھی ناکام تھی اور مجھے کوئی راستہ بھائی نہ دیتا تھا کہ آخر کھر کی ضربت جو دو زخ بن کے ہر وقت دھکا کرتی تھی اسے کسے بھجائوں؟ اس طرح کی سوچوں میں جانے کو ٹوٹی ہوئی چار پائی پر نیند آ جاتی اور پھر جب اس کا مطالعہ بعد سے پڑھتا تو میں نے باجی بیس کے کھر جانا چھوڑ دیا۔ ہفت روزہ تو ماں کو باجی رہی کہ اب باجی بیس کے پاس کام نہیں ہے پھر ایک ہفتے بعد ماں بعد ہوئی کہ میں کم سے کم چکر لگا کر پوچھ رہی آؤں۔ ماں کے اسرار پر کھر سے لگی راستے میں بھر جی سوچی رہی کہ چاؤں کی بیس اور ماں کے چھوٹ بول دون کی کہ کام نہیں لاکر جب کچھ دیر یونہی خوری کر کے کھر میں لگی تو ماں کے سوال نے بھناہٹ میرا جھوٹ کھول دیا۔

”ارے..... تو؟ تو خالی ہاتھ آئی؟ وہ لڑکا بیس کا بھائی تجھے پوچھتا ہوا آیا تھا کہ باجی چار رہی ہے اور تو بہت دنوں سے ان کے کھر چھائی بھی نہیں۔“ تب میں چپ رہی۔ ”ارہی؟ بونٹی کیوں نہیں؟“ تو نے کیا چوری کر لی جو یوں ڈری ہوئی گہری کی طرح چپ چاپ کھڑی ہوئی ہے؟ ”ماں کو غصہ آنے ہی والا تھا۔“

”کیا بیسوں ماں.....؟ کپڑوں کی مزدوری پر اس کا بھائی میری عزت کی قیمت مانگتا ہے۔ بتا پھر کیسے چاؤں؟ تجھے کیا تاؤں؟“ بڑی ہمت کر کے میں نے کہہ دیا۔ ماں کے جیسے کھڑے کھڑے جسم سے جان ہی نکل گئی ایک دم سکے میں آ گئی۔ مجھے بھی کچھ نہیں آیا اور کھر میں سنا رہے لگا۔

رات کو ماں دونوں چھوٹے بھائیوں کو بھانے لگی کلاب کچھ بھی کروائی کسی نہایت مزدوری کر کے تم دونوں کو بھی کھر چلانا ہے۔ ظاہر ہے وہ ابھی

چھوٹے تھے اور پندرہ سال کا تھا۔ اس پر خیر کا تھا۔ لوری سمجھو جس کی رہی ہوگی اور سب سے آخری آفرین پانچ سال کی ہوئے کو آئی تھی۔ ان علاقوں اور گلوں میں ہلدر پر پیرے پیدا ہوتے ہیں۔ ماں کے تو پھر بھی پانچ تھے اور پانچوں میں ہفتہ کی مناسب ہی تھا۔ کاش..... میں کسی طرح چار پانچ سال تک چلیا چلیا تو اور ضرور کھر سنبھال لیتا مگر چلاتی کیسے غریب اور مفلس لڑکی کی عزت چور ہے پر کھر وہ گلاس ہے جو باجی ہو جائے تب بھی آس پاس سے گزرنے والا ہر شخص ایک نظر اس پر ڈالنا ضرور ہے۔ اور اور اس پر منبرج سے شام تک جانے کہاں جاتے اور شام کو کچھ نہ کچھ پیسے لے کر لوٹ آتے جس سے کسی نہ کسی طرح کم سے کم شام کا کھانا مل جاتا تھا۔ بہت بھوسہ مجھے پڑ چلا اور ایک ہوئی پر میرا کیری کا کام کرنے لگا تھا۔ آدھے بجے ٹھیکے دار لے لیتا اور آدھے بجے وہ کھر لے آتا۔ کھر ٹر بھی چپ چپ کے پینے کا تھا جبکہ اس پر کھر صرف ایک دکان میں کام کرنے پر دوپہر کا کھانا ملتا تھا۔ بقول اس پر اس کی وہ اس کا امتحان لے رہا ہے۔ ایسا عمارت بہت ہوئی تو کچھ نہ کچھ مزدوری میں ضرور ملنے لگی۔

کھر میں مفلسی کم نہ ہوئی اور سب سے دونوں بھائی جن لوگوں میں اٹھتے بیٹھتے تھے ان سے خراب عارض میں بھی دیکھ رہے تھے اس دوران میں فیصل ایک مڑ پھر آیا تھا کھر ماں نے اسے اوپر سے نیچے تک دیکھنے کے بعد کافی برا بھلا کہہ کر بھگا دیا یوں سمجھو ماں نے میرے طوائف بننے کی نیکو دھڑالی۔ مجھے پوری کی پوری حاصل نہ کرنے کا دکھ ایک قسم کا انتقام بن کر فیصل کے رگ دے میں تیرنے لگا وہ سنے سنے منصوبے بنانے لگا کہ کسے مجھے تو چھوڑ ڈالے؟ اس کی انا کو بڑی زبردست محسوس ہوتی تھی کہ

میں اتنے دن تک اس کے سامنے رہی اور وہ اپنی مردانگی بھجے ثابت نہ کر سکا۔

ایک روز رات کے دو بجے ہوں گے کہ ایک نہیں ایک سو برس کا نوجوان لڑکا ہمارے گھر آیا اور بولا کہ ”لو رکو پولیس پکڑ کر لے گئی ہے اس پر چوری کا الزام ہے۔“ اماں کے اور میرے بیروں تلے زمین نکل گئی۔ جولا جاتا نہ آیا تھا وہ ہماری بیڑی ہوئی حالت کا قماشہ دیکھنے کو بدستور کھڑا رہا۔ میں نے اماں سے کہا۔ ”میں تھانے جاؤں؟ کہیں۔۔۔“ ہم دونوں ماں بیٹیوں کے ذہنوں میں ادا دلی بات وہ واقعہ تیرکان ہو گیا۔ ہم خوف سے لرز نہ گئے کہ کہیں پولیس والے انور کو بھی تشدد کر کے ماری نہ ڈالیں۔ اماں نے کہا۔ ”تم گھر میں رہو میں جاتی ہوں۔“

یہ کہہ کر پکڑ لیا ہے کہ چور کا بھائی بھی چوری ہوگا۔ جب اماں شش کھاسے گری اور بے ہوش ہو گئی۔ تھوڑی دیر بعد ہوش آئی اور جیسے اس پر غیب عورت کے پاس ہے یہی اندر بھوری سے گئے بیچنے کے علاوہ کوئی چارہ نہ تھا۔ آخر کار کرم کے ساتھ میں چلی گئی۔ وہ مجھے مختلف گلیوں اور گھروں سے گزرتا ہوا ایک ایسے علاقے میں لے آیا جہاں کچھ شیر آبادے مکانات بھی تھے اور بہت تھوڑے سے گھروں میں شاید لوگ آباد تھے۔ رات کے گھپ اندھیرے میں پوری طرح تو کچھ پتا نہ چلتا تھا اور یوں بے کہ نہیں تھیں کچھ روشنی بعض گھروں میں نظر آتی تھی۔ کرم ایک گھر کے سامنے رک کر بلا کہ یہاں اس کے چچا رہتے ہیں انہیں بھی ساتھ لے لیتے ہیں۔ وہ اندر گیا۔ میں اس دیرانے میں اکیلی کھڑی رہ گئی۔

گھروں کی ان خاتونوں کے سامنے حق و وق خانی دشمن پڑی تھی تو جوان کیلئے کوئی نہ کوئی استعمال کرتے ہوں گے۔ بہت دور ایک کھیت کی لائن میں کچھ وہندلا سا نظر آ رہا تھا۔ میں انجانہ خوف اور دوسوں سے اندر ہی اندر لرز رہی تھی۔ اس لیے کسی لفظوں میں کون بیان کر سکتا ہے کہ میں کہیں نہیں دور اپنے دل کے اندر اس خوف سے کبھی لرز رہی تھی جو ایک لڑکی کو ہوش سنبھالنے ہی فطرت کی طرف سے عطا ہو جاتا ہے۔ سب کچھ تھم کر میری بے جا رنجش ایسی تھی کہ میں اس کے سوا اور کچھ نہ سوچ سکتی تھی کہ میرے دونوں بھائیوں کو پولیس نے چوری کے الزام میں پکڑ لیا تھا اور صرف یہی نہیں بلکہ ان دونوں کو مار مار کے چان سے مار دیا جائے گا بلکہ یہی خوف بھی بھینچ رہی تھی کہ میری سرسراہٹا کھڑا کھڑا اور اندر آئے تو ہم دونوں عورتیں اور دو چھوٹی بچیوں کی زندگی کے ساتھ کیا ہونے والا ہے اس سے زیادہ میں کچھ سوچ نہ سکتی تھی۔ تھوڑی دیر بعد کرم آیا اور بولا۔

”چچا اندر بلا رہے ہیں۔ وہ کہتے ہیں میں تیار ہو کے چلوں گا۔ تھوڑا سا دقت لگے گا۔“ چچا میں گھر میں داخل ہو گئی۔ ایک تنگ سی راہداری کے داہنے ہاتھ پر ایک کمرہ بنا ہوا تھا اس کا دروازہ کھلا۔ میں نے ابھی تدم ہی رکھا تھا اندر کمرہ ایک ہاتھ پکڑ کے اس کے پیچھے کھینچا گیا بلکہ گھٹک کے پست پر پھینکا گیا کہ میرے اور اس خطا ہو گئے۔ میرے سامنے فیصل اپنی پوری شیطانیت کے ساتھ کھڑا تھا اور اس لڑکے کرم کے علاوہ وہاں دوست بھی تھے غشی میں جاوڑ نہ دھت لیروں کے چنگل میں پھنس چکی تھی۔ فیصل کے چہرے پر شیطانی مسکراہٹ کھیل رہی تھی اس کے مونہے مونے ہونٹ اور بڑی بڑی آنکھوں میں ایک ایسی فاختانہ چمک دھکی کہ وہ کچھ بھی حاصل کرنے سے پہلے سب کچھ جیت چکا تھا۔ چند لمبے تو مجھے ڈر اور خوف نے اپنی لپیٹ میں لیے رکھا اور اس کے بعد جیسے وہی تیزی سے میرے اوامان بجالا ہو گئے۔ میں ایک بات اچھی طرح سمجھ گئی تھی کہ اب کوئی بھی کوڑھش میری عزت و عصمت کی مخالفت نہیں کر سکتی تھی لہذا مجھے ہر طرح سے ہوش سے کام لیتا ہوا۔

”اچھا تو یہ سب دراستہ راکھا ہوا ہے؟“ میں نے کسی قدر اپنے اوامان اور حواس متبجح کرتے ہوئے کہا۔ اس کے ساتھ کھیل کھیل کے کچھ نہ کچھ سمجھ تو مجھ میں آئی چلی گئی۔

”اچھا ہوتا اگر تو مجھ اکیلے کی بات مان جاتی۔ اب روئے جا چار۔۔۔“ وہ فرما۔

”اب کیسے فیصلہ کرے گی کہ کچھ کہہ باتو وہ کس کا ہوگا؟“ اس نے دوسری بار گہری اور ہنکارانی گروش میں کہا۔ یہ سنتے ہی میں پورے وجود سے لرز گئی کہ کسی بھی طرح اس قسم کی چوہن میں کوئی بھی لڑکی اس طرح کے حالات میں پیدا ہونے والے

بچے کا سوچ کر کتنی بھی دلیر کیوں نہ ہو کمزور پر کتنی ہے اور جی پھوٹو میرے پاس اس سوال کا کوئی جواب تھا نہیں۔

”فرمایا۔۔۔ ایک کا ہو یا چار کا۔ اس سے کچھ فرق نہیں پڑتا تو اس وقت بھی حرام کاری کرنا چاہتا تھا اور اب بھی تیرا یہی ارادہ ہے اور اپنی کھیا چالوں سے تو نے میرے کسی کر دیا ہے یہ مجھے اب مان لینے میں کوئی حرج نہیں۔ صرف اتنا بتا دے میرے بدلوں ہماری کہاں ہیں؟“

”وہ برابر کے کمرے میں بند پڑے ہیں تیرا کام ہو جائے پھر چھوڑ دے اس آغوش بھی۔“ فیصل مکاری اور بے کسی سے بولا۔ شیطان کیا ہوتا ہے اس رات پہلی ماں میں نے دیکھا۔

”انہیں چھوڑ دے میری ماں بہت پریشان ہے۔“ میں نے جیسے اپنے اندر کی ٹوٹ پھوٹ کو سنبھالتے ہوئے کہا۔

”چھوڑ دیں گے۔۔۔ چھوڑ دیں گے۔۔۔“

مگر کی تو بات ہے۔۔۔ وہ بولا۔

آخری حلا تھا یہ کہ آخری راستہ۔ وہ چاروں ایک ساتھ جھٹے ہوئے ہاتھوں پر ہاتھ مارنے لگے۔

”ہم تو چار ہیں اور وہاں پورا تھانہ تیرا وہ حشر کرے گا جو تیرے سوچا بھی نہ ہوگا۔“ فیصل ہی اب تک میری باتوں کا جواب دے رہا تھا۔

”تم میں سے پہلے کون کرے گا؟“ یہ کہتے ہوئے میں جواب تک سڑک سٹ کے بیٹھی ہوئی تھی بہتر پریم دراز ہو گئی تو چاروں نے حیرت سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔

”میں ہی کروں گا پہلے یہ منصوبہ بھی میرا ہے اور تو مال بھی میرا ہے۔“ فیصل کچھ بکھرے بولا۔

”تو؟ تو کرم ہے اور تم دونوں کے نام کیا

ہیں؟" میں نے ان اجنبی لڑکوں کی طرف دیکھا۔
"ہام پوچھ کے کیا کرے گی؟ کام سے مطلب رکھیں پوئیس والوں کو بتانا چاہتی ہے سالی؟"
فیصل نے ہوشیاری دکھائی۔

"دو کے نام تو معلوم ہیں جو پوئیس والوں کو بتانا ہوا تو تم دونوں کے نام بھی کافی ہیں۔ میں تو اس لیے پوچھتی ہوں کہ....." میں جان بوجھ کر دیا وہ

"جس کو لگا۔" فیصل کو لگا کہ میں ہوشیاری کر رہی ہوں۔
"اس لیے پوچھتی ہوں کہ میں بعد میں بھی تم میں سے کسی ایک سے رابطہ رکھنا چاہوں گی۔"

"بڑی بے شرم ہے مجھی..... میں تو سمجھا تھا تو تو روئے گی کہ گزرائے گی اور ہمیں زبردستی تیرے....."

"زبردستی میں وہ مرا کہاں جو راضی مندی میں ہے....." میں پوری بے شرمی سے بولی مگر کچھ ایسا تھا کہ مجھے اپنی آواز بھی اچھی لگی۔

"میں نواز ہوں۔" اس نام سے ایک بولا جو کرم صورت اور کسی کی شکل والا تھا۔

"اور تو؟" "جو ایک بچا تھا میں نے اس کی طرف دیکھا۔ سب سے خوبصورت وہی تھا خاموش طبع اور شکل سے کچھ معصوم بھی لگتا تھا۔" میں فرماؤں۔

"میں وہ اتنا ہی بولا۔"
"فرماؤ اگر تو پہل کرے تو مجھے ہوا اچھا لگے گا" باقی بعد میں آجائیں۔ "ایک جہاں کہ تھا جو ان چاروں کے سچ ہوا۔ سب سے زیادہ فیصل کو اس بات سے تکلف ہوئی۔

"نہیں..... نہیں..... نہیں ہو سکتا۔ تجھ پر سب سے پہلا تو میرا ہے۔" فیصل نے میری طرف دیکھ کر اور باقی جملہ ان تینوں کی طرف دیکھ کر ادا کیا۔
"دیکھو دوستو..... سچ ہے؟"

"یازدہ فرماؤں کے ساتھ پہلے جانا چاہتی ہے تو اس میں حرج ہی کیا ہے ہم بعد میں..... مجھی بھی دوسرا نمبر تیرا ہی ہو گا۔ مگر اتنا کیوں ہے؟ کیوں فرماؤ؟" "کرم نے کہا۔

"اس سے پہلے کہ فیصل کچھ بولے" فرماؤ بولا۔
"کرم غصہ کیا کرتا ہے۔"

"مگر یہ اصول کی خلاف ورزی ہے جس کا مال ہو پہلا تو مجھی اس کا ہوتا ہے۔" فیصل غصہ لگایا۔
"میں تیرے باپ کا مال ہوں جو تیرا پہلا تو ہو گا؟" میں نے جلتی پر تیل ڈالا۔ "سب برابر ہیں۔"

"فرماؤ..... جو تو نے پہل نہ کی تو میں تجھے نارود سمجھوں گی....."

اب چاروں میں تو ٹکار ہونے لگی، اکرم اور فرماؤ ایک طرف ہو گئے اور نواز اور فیصل ایک طرف، کافی دیر تک چاروں اپنے اپنے طریقے سے کواں کرتے رہے اور میں اپنی عزت کی حفاظت کی ذمہ داری اٹھاتی رہی۔

"اس..... کتنا نے بڑی ہوشیاری سے ہم چاروں میں جھگڑا کر دیا ہے اور اب یہ ہم چاروں کا تماشہ دیکھ رہی ہے۔" فیصل نے کہا۔ میں سمجھ رہی تھی کہ فیصل ایسی صورت حال میں اس سارے قصے کو ہی ختم کر دے گا چاروں کر سے بے باج پر تلے گئے مگر میں جانتی تھی مجھے ہماگ ننگے کا مونچ چھری نہیں لے گا اس لیے ان لوگوں کے کسی فیصلے تک پہنچنے تک میں دیکھتی رہی۔ کچھ دیر بعد صرف فرماؤ اکرام میرے والے کمرے میں داخل ہوا مگر بولا کچھ نہیں صرف میری طرف غور سے دیکھنے لگا۔ میں اپنے ہاتھوں کو بکھیرتے داپس لے جانا چاہتی تھی مگر یاد میں صورت میں ممکن تھا جب میں کچھ بھی کروں کہ کوئی ایسی حرکت نہ کروں جس سے چاروں میں ہر

ایک ہو جائے۔

"تو نے میں لڑانے کے لیے یہ حرکت کی ہے؟" کچھ دیر بعد وہ میرے سے بولا۔
"نہیں..... مجھے تو اتنا اچھا لگا ہے۔"

"مگر فیصل نہیں مانتا۔" زرد بولا۔
اور پھر لمبے کے ہزاروں جیسے میں شاید میں نے وہ فیصل کا جو فرماؤ سوج نہیں سکا تھا۔ میں ایک عورت ہوں اور عورت ایسی مخلوق ہے جو آخری سانس تک اپنی خواہشوں کی جنگ لڑتی ہے۔ میں فیصل کی اس کینی اور شیطانی حرکت کی اسے سزا دینا چاہتی تھی اور اس وقت میری سب سے بڑی اور آخری خواہش یہ تھی کہ فیصل جیت کے مجھی ہار جائے۔ اس سارے منصوبے کو میں مٹی ہو کر بھی خاک میں ملا دوں۔ میرا سب کچھ نلنے سے بچ نہیں سکا تھا۔ میں ہر طرح سے ہار رہی تھی مگر اپنی اس ہار سے مجھی میں فیصل کو جیتنے سے روکنا چاہتی تھی۔ میں جانتی تھی کہ ساری زندگی وہ اس کی اور شکست میں ملکا رہے کہ میری عصمت کو سب سے پہلے اس کی مراد کا فیصل دے سکے۔ فرماؤ نے مجھے نہایت ہوتی نہ ہی وہ اس قابل تھا کہ میں یوں مٹی کی نظر میں اس پر اپنی عزت ملاتا ہوں..... کسی وہ ان چاروں میں بہتر تھا اور میں اس وقت ڈوبے ہوئے تھی اپنی مرئی سے اپنے ڈوبنے والے کا چٹا کر دیتی تھی یہ بالکل ایسا ہی تھا جسے کوئی خود کی کرنا چاہتا تھا مگر کرنے کے لیے کسی بھی اختیار کا انتخاب اس کی اس وقت تک کی اپنی مرضی کی جب تک کہ وہ زندہ ہو..... میں فرماؤ پر اس کی اس سوچ سے مجھی پہلے چھٹی تھی..... "اچھا کہہ رہا تھا یہی طرح ہائے گی اور سانسز کو لگا کر وہ کم سے کم اس لیے میں طوائف نہیں ہوں۔"

"مگر کیا ہوا؟" "جیسے فہرت سانسز روکے یہ سب سن رہا تھا اور اب اس کی سانسیں دفعتاً بحال ہو گئیں۔"

ہو گئیں۔

"فرماؤ جیسے یہ خود ہو گیا اور مجھے تو بے خودی اور وارنٹی کی ایکٹنگ بھی کرنا چاہی کہ ایک فیصل اور اکرم دھماتے ہوئے آئے اور انہوں نے جو یہ منظر دیکھا تو مجھ کو فیصل کا خون ہی کھول اٹھا۔" میں نے آؤ دیکھا تھا ڈاکٹر اور ایک دور کا لہجہ فرماؤ کے منہ پر بڑھ دیا۔ فرماؤ کہ یہ برداشت کرنے والا تھا وہ بھی ہمارے ہی اثر آ یا۔ ویسے بھی فرماؤ زیادہ جیسیم اور طاقتور دکتا تھا۔ اوپر سے اکرم بھی سچ بجاؤ کرانے میں اس ہوشیاری سے کام لے رہا تھا کہ وہ فیصل کو پکڑا رہا تھا اور فرماؤ کو کھلا چھوڑ دیتا تھا۔ کچھ لمحوں میں نواز آ گیا جو فیصل سے زیادہ کریم تھا مگر اس اثنا میں فیصل کی اچھی خاصی دھمائی ہو چکی تھی اور اب وہ ہائپنا کا ٹیسٹ سے مستحضر رہا تھا۔ کم سے کم میں نے اس سے کچھ بدلہ تو چکا دیا تھا اور اس وقت تو میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب لڑائی کا یہ نام یہ ہوا کہ فرماؤ نے صاف صاف کہہ دیا کہ اب فیصل زلیخا (ماہا) کو ہاتھ بھی نہیں لگا سکتا۔ جس جگہ میں شیطانی چنگل میں پھنسی ہوئی تھی وہ جگہ بھی چھو کر فرماؤ اور اکرم کی کوششوں سے حاصل کی گئی تھی لہذا فیصل کو وہاں سے ذبح چاہئے کتے کی طرح خوار اور نامراد واپس لوٹنا پڑا۔ قدرت کے بھیڑیالے..... ہونا کیا ہوا کیا۔

تھوڑی دیر بعد فرماؤ نے بڑی احتیاط اور ہوشیاری سے انور اور امین کو رہا کر دیا۔ میرے دونوں بھائیوں کو یہ معلوم نہ ہوا کہ میں وہاں موجود ہوں۔ اس شرط پر فرماؤ نے انہیں رہا کیا تھا۔ صرف اکرم اور فرماؤ تھے اور کالی سیاہ رات۔ دانت کھوے اگلاں کی باری ایک لڑکی کو کوس لینے پر آ رہے تھی۔"

ماہا تھا ایک مگر پھر ہانپ گئی اور اس نے



یہ آرزو تھی، بنانا میں گھر محبت میں
ملا جو ہوتا کوئی ہم سفر محبت میں

غریب شہر کے پاس اب کچھ نہیں باقی
نثار کر دیئے دل و جان محبت میں

ہمیشہ دور رہے جو در محبت سے
دکھائی دیجئے ہیں وہ معتر محبت میں

وہ مجھ سے دور ہے، ہے صلا محبت کا
اُسے میں نے چاہا کیا محبت میں

وہ جو کہ گڑی دوران میں ہو گھر ازاد
اُسے نصیب سے ملتا ہے گھر محبت میں

زابت علی جے پوری

کشادہ کرے بھی دیکھنے میں آئے ہیں تاہم تربیت
دو تین سب ہی کی ایک جیسی ہے۔ فرش پر حسب
استطاعت قارئین اور دریاں خانے پرانے ہو چکے
ہیں۔ اگر بہت قریب سے محسوس کیا جائے تو ان میں
سے بے یوکی اٹھ اٹھ کر سانسوں میں اترتی ہوئی بھی
محسوس ہوتی ہیں۔ دیوار کے برابر برابر گونجنے لگے
ہوتے ہیں۔ ان کیوں کی حالت بھی کہیں جلی جلی
اور بد رنگی ہے اور کہیں نئے نئے خلاف چڑھا کر نہیں
قابل برداشت بنادیا گیا ہے۔ صحت سے سنا خوردہ
پتھکے لگتے ہوئے ہیں اور بعض کمرہ میں ملحقہ ہاتھ
روان بھی ہیں۔ قارئین اور دور یوں پر دان و انکا اکل
دان اور ایش ٹرے بھی دھرے ہیں تقریباً تمام ہی
طوائفیں پان اور سرگت کا شوق کرتی ہیں، بعض
شراب بھی پیتی ہیں جو کہیں جیتیں وہ اس کا خرچ
برداشت نہیں کر سکتیں، بالکل ایسے ہی جیسے کوئی
شریف آدمی اس لیے شریف نہیں کہ وہ خدا خونی اور
عاقبت کی فکر میں مبتلا ہے بلکہ اس کی شرافت کی واحد
وجہ یہ ہے کہ اسے گناہ کرنے سے سواغ اور وساوس
مہیا نہیں ہیں ایسے میں شرافت خود بخود آدے آدمی کی
چادر میں جاتی ہے۔ کمال کی بات یہ ہے کہ طوائفوں
میں زیادہ تر اسکی ہیں جنہیں اپنے لئے سے قابو پر چکا
ہے بلکہ وہ بچنے کے بعد بھی پوری پوری مٹنے سے
گفت و شنید کرنے پر قادر ہیں۔ یہاں موجود
طوائفوں کے بیوسات فیصد والی طوائفوں کے برابر
ہوتے نہیں ہوتے، ہو بھی نہیں سکتے۔ اس ذرا سوچئے
باجوری نے دیو داس میں جو طوائف والے کردار
میں بیوسات فیصد یہاں کی طوائف خواب میں بھی
نہیں پاس سکتی بلکہ یہ کہا جاوے کہ جتنے پیسے باجوری
نے ان بیوسات کو سنبھلنے کے لئے آئے تھے تو.....
بعض ناچنے والیاں اس روٹین ورک سے کسی
قدر اکتی ہوئی بھی لگتی ہیں کہ وہ غناؤ سنگھار کو زیادہ

افسان کو جیتے چلے جانے پر مجبور کیا ہے دور نہ ہزاروں
سال سے زندگی ایک جیسے منظر کی اسکی داستان
بن کر رہ گئی ہے جس سے اب شدید پوریت ہوئے
لگتی ہے۔

اب دو دنوں ماہ لقا کے پاس سے نکل کر پھر کسی
منظر کا حصہ بننا چاہتے تھے۔ ایک کمرے میں ایک
مونی تازی پھینکا رہتی شکل والی عورت بیٹھی تھی۔
نہرت جھک کے سلام کرتا ہوا چھپاک سے اس
کمرے میں جا گھسا۔ عورت جو کچھ اسراحت کے
سے انداز سے بھی ذرا بھی ٹس سے کس نہ ہوئی جیسے
وہ نہرت کی اوقات پہلے سے جانتی تھی مگر جیسے ہی
اس نے سانس کو دیکھا تو کچھ مل جل ہوئی اس کے
بے تکلمہ وجود میں۔

”اوسے“ ڈو“ ڈو“ نہرت میاں.....“ اسکی پھر
سانس کو دیکھتے ہوئے بولی۔ ”یہ خوب دھندہ شروع
کیا۔ چلا اچھا ہے۔ کھنکھو بندہ کی کام کا نہیں ہوتا، کچھ
ٹھکانے سے نہ تھی۔“ اسکی۔ او..... تھیں..... لے
تیری پارٹی تو آئی۔“

سانس اور نہرت دونوں بری طرح چوٹے
پہلے دھندے والی بات پر پھر یقین پر نہرت
غریب کو اس لیے پناہ بھاری وزن والی عورت نے
سنبھالنے کا موقع دیا نہ ہی اپنی صفائی میں کچھ بھی کہنے کی
مہلت دی۔ سانس کو لگا کر کہیں تو وہ بھی کیا ہے
کہیں جس غلط فہمی بلکہ خوش فہمی میں یہ پہاڑی خاتون
بتلا چکی تھیں کہ وہ کوئی پارٹی ہے یا کسی کوئی پارٹی نہیں
تھی، جس یوسیدہ دردی اور پرانی دھرائی جانے ہی کیے
سے ٹپک لگاتے ہیں پرانے دھڑکن کی ماہ لقا بھی کچھ
پڑی تھی اس کے پیچھے رہینگ سے ایک وزیر اس
گھر سے نکلے لوگوں والا چپا ہوا پردہ پڑھا تھا اور اس
کے پیچھے سے یقیناً نکل کر آئے والی۔
یہ گھر زیادہ کشادہ نہ تھا مگر بعض عمارتوں میں

خٹاغت پوری پٹل پانی کی خالی کر دی۔ میں اور
نہرت اس کے پھر سے کہانی شروع کرنے کی امید
لگائے بہتر گوش تھے کہ وہ ادھر ادھر دیکھ کر ایک دم
چوکی۔

”واہ..... میرے رہا.....! کتنا کون وقت ہو
گیا؟ دھندے کا تاہم سر پر آن کھڑا ہوا اور ہم لوگوں
کی باتوں میں جیسے پانی نہ چلا۔ چلو جاگو یہاں
سے.....“

”مگر ماہ لقا.....! ابھی تو یہ پانی نہ چلا کہ تم
طوائف کیسے نہیں؟ کہانی ادھوری ہی نہیں بلکہ پوری
طرح نقشہ ہے۔ اس طرح ذرا بھی بات نہ بنے
گی۔“ سانس نے سخت یابی سے کہا۔

”نہر رائے بابا میں تمہارے لیے اپنا دھندہ وہ
خراب نہیں کر سکتی؟“ نہرت بے جھگٹ بولا۔

”واہ..... کس آسانی سے کہہ دیا، چھٹی کرلو؟“
پورے دو ہزار کا نقصان ہوگا۔ پہلے سے جھگٹ ہے
کاٹی ہوئی لے کہ وہ نقصان اگ ہوگا۔ نہ پانا نہ ٹھکان

نہیں ہے۔ ”وہ ایک دم سے ہی صرف چیخ پٹی نہیں
ہوئی بلکہ فی الفور طوائف اور دھندہ کرنے والی
خوش عورت بن گئی حالانکہ وہ جانتی تھی کہ اس سے
ہزار تو کیا ایک ہزار بھی نہیں دے سکتے تھے۔

”اچھا تو پھر کس آنا دے؟ میرے مزے کیسے کیجئے
میں بہت تھیں۔“ وہ کسمپانی ایک کاٹلی سے ہماری
منہ کھول کے اس نے اٹھائی لی اور اٹھ کھڑی
ہوئی۔

”ٹھیک ہے، ہم کل آئیں گے۔“ سانس نے
مجھوس کیا کہ اس کے علاوہ اور کوئی چادر بھی نہیں
ساتھ ہی سانس نے یہ بھی محسوس کیا کہ طوائفوں کی
پاس گھر یوہو تو کچھ چھوڑ آئے والے لوگ ان
کی ایسی ہی اداؤں پر جان دیتے ہیں۔ یہ محسوس ہی

عمو نیم

گورائیں آسان برا

امروزہ زخايل

جن کو بھراہن تو قمر و شرف بچتا ہے
وہ برہنہ ہیں انہیں غلبہ رسوائی دے

نورانی لباوے میں ملیوس شیطان کے کارندوں کا شرم ناک ماجرا

تنگی اور بدیٰ خیر اور شران دونوں ہی کا وجود
روئے ازل سے ہے اور روئے اب تک جاری رہے
گا۔ اس دنیا میں ایسے لوگ بھی ہیں جو نیکی پھیلانے
لے جہنم کے دیکھے والا و کو حیرت بھرائے میں کوئی کسر
اظہا نہیں رکھتے۔
ایسے ہی ایک بدقماش اور بدکردار انسان کی کہانی
میں آپ کو سنا رہا ہوں جو کہ میرے ایک ایسے دوست

کچھ بیچ کر بیٹھے ہیں۔ یہ دکان کوئی ہی اس لیے گلی
ہے۔ اس کے لیے میں کوئی جذبات نہ دیتا ہوں وہ
نیکوکل طوائف بن چکی تھی یا اسل ریڈی تھی
غریب.....

”نصرت..... تم نے سمجھا یا نہیں یا پہلی بار آ
ہے تمہارا گاہک؟ مگر یہ کون سے سوال ہیں پوچھنے
والے؟“ موٹی نے قدرے برداشت کا مظاہرہ
کیا۔

”اے بیگم لٹاؤ یہ اس طرح کا گاہک نہیں
ہے۔ یہ تو رائٹر ہے۔ طوائفوں کی زندگی پر کتاب لکھ رہا
ہے۔ جانا چاہتا ہے کہ کوئی بھی عورت طوائف کیسے
بنتی ہے؟“

”چل گھوڑے..... خدائی خوار..... نکھو لے
پنیدی کے..... کم بخت..... میں بھی آج تو بھی کوئی
گاہک پکڑ لایا۔ پتہ تو سودا کا مفت خور ہے۔
سات گڑی کی آئے تھے پر..... کم بخت نے منہ کا
ڈانٹ ہی کیسلا کر دیا۔ چل پتیس..... کرے میں
جا..... خواہ مخواہ تجھے بھی تکلیف دی۔ آدی پچھانے
کی ملاحیت بھی دم بخت ہو جانی ہے جولا کا پردہ
آٹھوں پر آن کرے۔“ موٹی بے تکان اور نام
استاپ بولے چلی گئی۔ بیٹیس اٹھ کے جانے لگی۔

سائرس اور نصرت بھی اسی اٹھ لے کر کافی قریب ہو چکی
تھی یہ منظر کچھ یوں تھا کہ بیٹیس پردہ سکا کے
غزا پ ہونے والی تھیں اور سائرس جبکہ کر جوتے
پہن رہا تھا۔ نصرت گل ساموئی بے عروت کو دیکھنے
میں بڑی تھا۔ اسی حالت میں سائرس نے کہا۔
”آپ فیصل کو چاہتی ہیں؟“ بیٹیس ایک غیر معمولی
حیرت لیے داپسی کے لیے مڑی اور سائرس نے
اسے جس کے دیکھا۔ وقت کی طمانیہ دامن ہلنے
لگیں۔

(جاری ہے)

وقت نہیں دیتی۔ جس وقت آپ پہلی منزل پر پہنچتے
ہیں تو وہاں ہاں اسی طرح شے کے شوکیوں میں
ٹوٹوں کی گندہ بھی ہوئی اور کچی ہوئی میس کی پیسے
پوٹن مارکیٹ کراچی میں پرائز پاؤ کا کرتے تھے
شاید اب بھی بکتے ہوں۔ ٹوٹوں کا بکنا کتنا عجیب ہے
یہ تصور کہ ہرگز ٹوٹوں سے خریدی جا سکتی ہے مگر
یہاں تو ٹوٹ بھی بکتے ہیں۔ اس بازار کی ہر چیز ہی
بکاوے ٹوٹوں کے بکتے سے یہ مطلب ہے کہ جو
قراش میں ہزار اور پانچ سو کے ٹوٹ لاتے ہیں وہ
ظاہر ہے ہزار اور پانچ سو کے ٹوٹ ان عام سی
طوائفوں پر ہزار تو نہیں سکتے اور بھرے کی تو ریت
بیک ہے کہ جس تک ٹوٹ نہ لائے جائیں۔ بھرا بھرا
نہیں لگا نہ لگاؤش میں ہزار اور پانچ سو والے ٹوٹوں
سے 10 اور 20 والے ٹوٹوں کی گندہاں بیک میں
خریدتے ہیں اور اس وقت تک لاتے رہتے ہیں
جب تک بھرا بھرا قاعدہ ختم نہیں ہو جاتا یا پھر قراش میں
کے ٹوٹ اختصار پر نہیں ہو چکے۔ اگر قراش میں
ٹوٹ لائے میں بھری سے کام لیتے ہیں تو پوری
فوسٹائی ہے بچنے والی انہیں طعنہ دیتی ہے جس سے
ان کی مردانگی اور فیاضی دونوں گھٹتی ہے اور وہ
زیادہ تیزی سے برباد ہونے لگتے ہیں۔ عموماً قراش
میں ایک ہزار یا پانچ سو روپے سے زیادہ لائے کی
سکت نہیں رکھتے.....

اس لیے پردہ سکا اور ہرے کپڑوں میں ملیوس
ایک پختہ چہرے والی عورت نمودار ہوئی اس نے
جانی والا د پندرہ برس لکھا تھا تھا خوب کشادہ تھا
ناگ توڑ کی سی تھی ہوئی تھی۔ وہ تسلیمات کرنی ان
کے سامنے آتی تھی۔

”وقت ہوگا آپ کے پاس؟“ سائرس

نے پوچھا۔

”بڑا عجیب سوال ہے وقت تو کیا ہو تم سب ہی

نے سناٹی جواب اس دنیا میں موجود نہیں ہیں۔

میں ڈینس سوسائٹی میں ایک بڑی بیکری چلا رہا تھا۔ میرے گاؤں میں بڑے بڑے صنعت کاروں کا رو بار بار حضرات سے ملے کر ان کے گھر یا ادنیٰ ملازمین تک بھی شامل تھے۔ صبح 10 بجے کے بعد صبح 10 بجے تک چونکہ گاؤں کی آمد رفت کی چنانچہ اس دوران میرے پاس فرمت کے لمحات بہت ہوتے تھے۔ اس وقت میں میرے پرانے دوست احباب اور وقت کار اکثر ویشتر کپ شپ کے لیے آ جاتے تھے۔ اس طرح فرصت کے یہ لمحات بہت اچھی طرح گزر جاتے تھے اور بہت سی رنگ رنگ اور دلچسپ کہانیاں بھی مجھے سننے کو مل جاتی تھیں۔ ان کہانیوں کے راوی زیادہ تر وہ گھریلو ملازمین ہوتے تھے جو اپنے مالکان کے لیے بیکری کا سامان لینے میری دکان پر آیا کرتے تھے اور مجھے فارغ کر دیکھ کر اپنے دکان سے شائع ہوتے اور بعض اوقات دل بیلے انداز میں اپنے صاحب و بیگم صاحبہ کے قصے اور ان کے عجیبہ و غریب حالات کے لذت انگیز واقعات بھی ٹھک مریج لگا کر بیان کرنے سے نہیں چھوڑتے تھے جن میں بے زیادہ تر ان کے احساسات و محرومی اور کینہوں سے بھی جذبات کے کچھک ہوتے تھے۔ میں اُن کی باتیں توجہ سے نہایت متاثر ہو کر ان لوگوں کو اپنی باتیں نہیں کیا تھا بلکہ ہمیشہ ان کی حوصلہ افزائی ہی کی تھی کہ اس میں میرا ہر افادہ تھا کیا تو یہ کہ کہ ایسے ملازمین نہیں اور جاننے کے بجائے خریداری کے لیے میری ہی دکان کا رخ کیا کرتے تھے دوسرے فرصت کے اوقات بہت اچھی طرح گزر جاتے تھے۔ میری دکان پر اکثر آنے والوں میں سے ایک صاحب کیپٹن منصور اعجاز بھی تھے جو قریبی ایک دلا میں رہائش پذیر تھے۔ وہ مرحنت

نیوی سے تعلق رکھتے تھے اور اُن دنوں ایک غیر ملکی بحری جہاز پر بحیثیت کیپٹن خدمات انجام دے رہے تھے۔ اُن سے میرا تعلق صرف دکاندار اور خریدار کا سا نہیں تھا بلکہ وہ میرے دوست کی حیثیت بھی اختیار کر گئے تھے۔ ویلے تو مرحنت نیوی کے ملازمین کے پاس وقت ہوتا ہی نہیں کیونکہ وہ طویل بحری سفر میں مصروف رہتے ہیں اور اس طرح وطن اور گھر سے دور ہی دور رہتے ہیں لیکن جب وہ صاحب اپنے ڈیوٹی (اداری) اختتامات کے لیے sign off کرتے ہیں تو بہت طویل رخصت پر آتے ہیں۔ ٹھہرے پہلے تو آپ کو بتا دوں کہ مرحنت نیوی ہوتی کیا ہے اور کیا کبھی پاکستان میں بھی اس نام کا ادارہ ہوا کرتا تھا؟ مرحنت نیوی ایک ایسے ادارے کو کہتے ہیں جو نہ صرف ملکی تجارت بحری جہازوں کے ذریعے کر کے ملک کی خدمت کرتا ہے بلکہ نقل و حمل کے ساتھ ساتھ اپنے خوبصورت جہازوں کے ذریعے مسافروں کو ایک ملک سے دوسرے ملک تک لانے کے لیے جاتی ہے۔ یہ بحری سفر لوگوں کے لیے سستے ہوتے ہیں جو علاوہ بنیادی اور دلچسپ تجربات سے بھی مہر پرور ہوتے ہیں۔ ایک زمانہ تھا کہ ہماری مرحنت نیوی لوگوں کو ملک کے دو حصوں مشرقی اور مغربی پاکستان لانے کے لیے جانی کی خدمت دن رات انجام دیتی تھی۔ اس کے علاوہ حج کے زمانے میں مرحنت نیوی کے بحری جہاز حجاج کو کراچیاں گام اور کراچی کی بندرگاہوں سے حجاز مقدس تک پہنچانے میں بھی سرگرم رہتے تھے یوں شپنگ کی دنیا میں ہمارے وطن کا بھی ایک بڑا نام تھا۔

اوہ..... میں بھی کہاں سے کہاں پہنچ گیا۔ بتانا یہ مقصود تھا کہ ہمارے یہ منصور اعجاز صاحب مرحنت

نیوی میں اُن دنوں چیف آفسر تھے کہ بنگلہ دیش کے نام کے دنوں میں ہندوستان کی طرف سے ہماری تمام کام کی بندرگاہ پر ہم باری کے سبب اُن کا جہاز تباہ ہو گیا اور وہ کئی باقی والوں کے پیچھے چڑھ گئے اور ہندوستان کے قبضے کے بعد کئی قیدی بن کر ہندوستان کے مختلف جیلوں میں رہنے کے بعد زمین مال کا مرمر گزار کر وطن واپس آئے تھے۔ حکومت کی جانب سے انہیں دو سال کی جیلیاں دی گئیں کہ وہ ان کی یادوں کو کھلا سکیں۔ اُن دنوں وہ زیادہ تر وقت میرے ساتھ گزارتے اور جنگ اور قید کے دوران جیل میں آنے والے دلچسپ اور صبرناک واقعات سنایا کرتے۔ اچھا بہت میرے اُن سے تعلقات دوستی میں بدل گئے جن میں بے غلطی کا عنصر بھی نہ رہا۔ اُن ہی کے ایک قریبی دوست عادل بیچانی تھے جو اُن کے ساتھ ہی چیف انجینئر کے فرائض انجام دیتے تھے۔ وہ منصور اعجاز کے ذریعے مجھ سے متعارف ہوئے تھے۔ اُن دنوں وہ کبھی کبھی میں تمام ہاتھ تھے اور اکثر کچ کے اوقات میں میری بیکری میں آ جاتے اور مجھ سے میرے ساتھ گزارتے تھے۔ مگر یہ صاحب مجھے ایک آنکھ نہ بچاتے تھے بلکہ ان کی تنگدستی صرف ان دنوں اور عین واقعات کے گرد ہی گھومتی تھی جو انہیں پریشان کر رہے تھے اور ان کے دلچسپ واقعات سے قلمی کوئی دھیمی نہ تھی لیکن چونکہ وہ ہمارے ایک مخلص دوست کے دوست تھے تحریک دکاندار کی حیثیت سے بھی میں انہیں یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ آپ دکان پر نہ آیا کریں سو قدر دوں میں ہرجانہ روٹیوں کے مصداق انہیں برداشت کرتا تھا لیکن ایک روز میری برداشت کی حد کوئی اور میں بھٹ ہی پڑا۔ دراصل اُن دنوں وہ روزانہ اپنی ایک نئی

سوال

وہ شام سے بادل کی آکھ میں پھیلتا کاٹل تم کیوں روتے ہو بادل.....؟ کیا!! مجھے روتے دیکھ کر یا!..... تم بھی میرے تنگی سنا سکتی ہو؟

اجالا عادل

واردات سنانے لگے تھے جن کا کلب لہاب بے ہوتا تھا کہ کراچی میں سے راہ روئی اس حد تک بڑھ چکی ہے کہ وہ ہر روز جب گھر سے باہر نکلتے ہیں تو کوئی طرح دار حسیہ ان سے آتی ہے اور ان کی عیاشیوں کی داستانوں میں ایک نیا اضافہ ہو جاتا ہے اور وہ ان کا دن بے حد خوبصورت کرتا ہے۔ میں آپ کو بتا چلوں کہ اکثر مرحنت نیوی کے افراد چاہے وہ ایک سال تک کا وقت سمندر میں اپنے گھر پر سے دور گزارنے پر مجبور ہوتے ہیں۔ چاروں اطراف سمندر اور کئی کئی تک انہیں زمین اور انسانوں کی (ماسوائے جہاز پر اپنے ساتھیوں کے) فصل تک دیکھنے کو نہیں ملتی۔ چنانچہ ان کی انفیسٹ میں پھینکی پیدا ہو جاتی ہے اور وہ جیسے ہی کی بندرگاہ پر نظر انداز ہوتے ہیں اپنی نفسانی خواہشات کی تکمیل کے لیے نکل پڑتے ہیں۔ یہ بات مجھے کیپٹن منصور اعجاز کی باتا چکے تھے۔ بہر حال میں متواتر تین دنوں سے اُن کی یہ وارداتیں سن کر میں کہنے لگا کہ کیا تین دنوں روز انہوں نے حد ہی کر دی جب انہوں نے کہا کہ کل وہ

کمرے میں عجیب و غریب اسرار بھرا سا ماحول تھا۔ چاروں جانب دیواروں پر سبز رنگ کی گولہ کاری کی چلی چادریں لٹک رہی تھیں جن پر کھلے طیب اور بختین پاک کے نام اور دیگر ایست قرائی تحریر تھیں۔ ایک جانب کسی برتن میں عود و جڑیں سلگ رہے تھے جن کی خوشبو نے کمرے کی فضا کو ادھیر کر دیا۔ بوسل بنا رکھا تھا۔ شاہ صاحب کی نشست کے برابر تیلی پر انسانی ٹوکڑی اور دو بڑی بڑی ہڈیاں جو یقیناً انسانی تھیں، رکھی ہوئی تھیں جو اس ماحول کو اور بھی ہیبت ناک بنا رہی تھیں۔

پشت پر موجود کھڑکی ایک باہر پھر کھلی جس سے بوسل کی جن گھنٹی غلغلہ مچا رہی تھی۔ اس بار اس کے ہاتھوں نے ایک بڑی ٹرسے سنہالی ہوئی تھی۔ شاہ صاحب نے بڑھ کر ٹرسے سنہالی۔

”ڈیڑا کچھ ہیٹ پوچا ہو جائے۔ بہت ہی چھلکن ہوئی ہے آج تو۔“

ٹرسے میں گرم گرم سوئے، پیڑ، جڈیں، گلاب جان اور نہ جانے کیا کیا لوازمات بھرے ہوئے تھے۔

”بھئی کچھ لڑکیوں کی طرح شرا رہے ہو..... اور بھی یہ رنگھٹا ختم کر دو۔ تم ہمارے یار کے یار ہو۔ تمہاری خدمت تو ہمارا فرض ہے اور اب تک بتایا نہیں تم لوگوں نے کہ کیا خدمت کی جائے؟“

ہم لوگ مجب و شش و پنج کا شکار تھے کہ ہم تو کیا سمجھ کر آئے تھے لیکن یہاں تو معاملہ دوسرا نکلا۔ خاتہ دگا دار اور بادشاہ صاحب..... یا لہذا کیا کریں؟

”لو مئی، دست خود دہان خود۔“ شاہ صاحب نے ایک ایک پلیٹ ہماری جانب سرکا کر اپنی پلیٹ بھرنی شروع کر دی۔ ہم جواب تک دم نہ خود بیٹھے تھے۔

گرم کم سے مشکل لڑنے یا ہاتھوں چائے کا کپ اٹھا سکے۔

”ہاں یار! اب بتاؤ، بھئی کیا خدمت کریں تمہاری؟ کیا منہ میں لکھنیاں ڈالے بیٹھے ہو؟ کیا کہے گا ہمارا کارکہ بکلی بارے یہ دوست شاہ صاحب کے پاس بیٹھے اور خانی خولی ٹھانڈا شاہ صاحب نے؟“ چائے کے بعد شاہ صاحب نے انتہائی بے تکلفی سے وہی موضوع پھینچ دیا۔ ہم دونوں ہی انتہائی فردس ہو رہے تھے۔ ہم تو عادل بچوانی کو کھرک بچانے کے خیال سے یہاں آئے تھے اور یہاں اس کے رنگ ڈھنگ میں خرابی تھی۔ انتہائی مقدس کی نگاہ نظر آنے والی خاتہ ہم میں بھی کیسے نہیں کہ ہمیں بچوانی نے کسی مقصد سے یہاں بھیجا ہے؟ پھر ایسے تقدس بھرے مقام پر اس قسم کی گفتگو؟ ہمارے تو دم و گنہ میں بھی نہ تھی۔ بدحواسی ہمارے چہروں سے عیاں تھی اور گھبراہٹ میں دل کی دھڑکنیں تیز ہوئی جاری تھیں۔ میرے ساتھ تو ایسی صورت حال چلی کہ میرے پیش آ رہی تھی۔ شاید کچھ لمحے نہیں کہ اس پر کیا بات رہی تھی؟ ہوسکتا ہے وہ اس میدان کا کھلاڑی رہا ہو لیکن میرے سامنے اس نے جس سے پہلے اس قسم کی گفتگو نہیں کی تھی جو مجھے علم ہوتا۔

”ارے یار! سمجھ گیا؟“ نے ہوا دھڑکا رہا ہے۔ ہوا چلتا، کسی لڑکی پسند کرو گے؟ میرے پاس 17 سال سے لے کر 35 سال تک کی ہر رنگ و فصل کی خوبصورت چیزیں موجود ہیں بتاؤ، کسی عمر کی اور کون کی زبان بولنے والی دیکھا ہے؟“

”وہ..... وہ..... شاہ جی..... ہم شریف.....“

”تو یہاں کون بد معاش بیٹھا ہے بارہ؟“ شاہ صاحب نے جو اپنی شرافت کا چولہہ پہلے ہی اتار بیٹھے تھے، ایک کمرہ سے قہقہے کے ساتھ شاہدیا بات کاٹ دی جو اس نے بہت تذبذب کے ساتھ شروع کی تھی۔

تھی۔

”یہ بتاؤ، کس عمر اور کس طرح کی لڑکی اپیل کرے گی اور کہاں لے جائے گا؟“

”وہ..... وہ..... شاہ نے پھر بھڑکاتے ہوئے کچھ کہا تھا۔“

”اجھا! آؤ میرے ساتھ۔“ یہ کہہ کر ہمارے جہاز کا انتظار کیے بغیر ہی کمرے کا بیرونی دروازہ کھولا۔ ہم کسی معمول کی طرح اس کے پیچھے اٹھ کر چلے۔ وہ لان کے گوشے میں بنے زینے سے اوپر چڑھنے لگے۔ چند منٹ یہاں اوپر چڑھنے کے بعد انہوں نے ایک دروازہ کھولا۔ ”آؤ.....“ اندر داخل ہوتے ہوئے انہوں نے ہمیں اندر آنے کی دعوت دی۔

یہ ایک دس بائی ارفٹ کا مختصر سا کمرہ تھا لیکن نہایت نفاس سے سجا ہوا تھا۔ کھڑکیوں پر خوبصورت دیوار پردے پڑے ہوئے تھے، ایک کونے میں خوبصورت ڈبل بند موجود تھا جس پر خوبصورت رنگ کی پھولدار چادر بچھی ہوئی تھی ساتھ ہی ایک چھوٹا سا روم فرنیچ بھی موجود تھا۔ دیواریں خوبصورت پینٹ کی ہوئی تھیں اور ساتھ ہی میز کے بائیں روم بھی تھا۔ ایک چھوٹی سی خوبصورت پیڑ کے ساتھ دو رام دھنک کرسیاں بھی رکھی تھیں۔ فرشیہ وہ چھوٹا سا کمرہ کسی فانیہ اسٹار ہوٹل کی سی تمام سہولیات سے مزین تھا۔

”ہاں جی! دیکھو ہم اپنے دوستوں کے آرام کا کتنا خیال رکھتے ہیں۔ اگر آپ لوگوں کے پاس اپنی کوئی کپڑا نہیں تو چار کھٹوں کے لیے یہ کپڑا استعمال کر سکتے ہیں لیکن اس سے زیادہ وقت کے لیے دل بہلانا مقصود ہو تو پھر آپ کلڑکی کو ساتھ لے جانا ہوگا۔“ وہ اطمینان سے ہمیں ٹھکانہ دیکھا رہے تھے اور ہمارا حال یہ کہ کاٹو تو کپڑے نہیں..... کہ اس تقدس کے زیر سایہ بد خرافات؟ ہم بھی اس کا تصور نہیں کر سکتے تھے۔

”آئیے چلیں اور آپ کو یہاں کے قواعد و ضوابط بتا دیں۔“

ہم واپس اسی خاتہ آ کر کمرے میں واپس پہنچے لیکن اب ہمیں یہ سب کچھ دیکھ اور سن کر انتہائی کراہیت محسوس ہو رہی تھی۔

”کھلیے۔“ آپ آ کر اپنا کمرہ بے جب دل چاہے شغل میلہ کو تو شریف لے آئیے۔ جس قسم کی لڑکی درکار ہو وہ بتا دیجیے۔ اگلے روز 5 بجے آئیے۔ ہمیں کراہی کا ڈیسی میں بیٹھ جائے گا ڈیڑا دروازہ کھلا رکھے اور کبھی باہر کے کمرے میں روڈ پر پہنچ جانے سے پہلے لڑکی سے نہ کوئی سوال کیجیے اور نہ ہی اس کا چہرہ دیکھنے کی کوشش کیجیے۔ ویسے اس کی آپ کو ضرورت بھی نہیں کہ آپ کی فرمائش کے مطابق ہی لڑکی آپ کے حوالے کی جاتی ہے اور ہاں ایک درخواست یہ بھی کی جاتی ہے کہ آپ کو کبھی دیر کے لیے لڑکی درکار ہو وہ پہلے ہی بتا دیجیے اور کوشش کیجیے کہ پہلے سے شہرہ وقت پر لڑکی کو فارغ کر دیجیے۔ اگر آپ کو اس کے ساتھ شہر سے باہر جانا ہو تو بھی آپ کو ہنگام کے وقت بتانا ہوگا۔ اگر کیا نہ کیا جائے تو لڑکی کا حکم رہا ہے۔ یہ بھی انکار کر سکتے ہیں اور آپ کو اس انکار پر چراغ پا ہونے کی کوئی ضرورت نہیں کہ یہ شرفا کا کھانہ ہے اور ہمارے پاس کوئی بازاری لڑکیاں نہیں آتیں۔ معزز اور شریف گھرانے کی تعلیم یافتہ لڑکیاں ہی ہوتی ہیں اور یہ سب کچھ اس لیے کہ لڑکیاں اپنے کمروں سے باقاعدہ اجازت لے کر نکلتی ہیں۔“

”شاہ جی..... ہم شریف لوگ ہیں، کوئی ایسی دیکھنا بات۔“

”بھائی میرے..... ہم نے کہا نا کہ یہاں کوئی بد معاش نہیں اور آپ لوگ دیکھ ہی رہے ہیں میرے آستانے کا مقام۔“ ہے کی میں بہت کہ کوئی لگتی بھی

تاج محل

لوگ کہتے ہیں میرا تاج محل رشی ہے
جوڑ کر لاج محبت کی یہاں رکھی ہے

شاہ جہاں کتنی محبت تھے ممتاز سے حتی
تخت و تاج اپنا دے وہ گل ناز سے حتی

ایسی الفت کہیں دنیا میں نظر آتی نہیں
آئے بھی کر کہیں ایسی تو وفا کیا نہیں

وقت اس یاد محبت کو لرزتا پائے
اس مینار محبت کو ٹکرتا پائے

وہ جو مغرور محبت ہے یہاں آتی نہیں
اس کی گرتی ہوئی حالت ہے ترس کھاتی نہیں

عشق کی دنیا میں ایسا کوئی معیار نہیں
یاد الفت کو بچا لے وہ پرستار نہیں

وقت تاج محل کے دیتا ہے اک تاج محل
عشق کی دنیا میں اس کا نہیں اب تک تو کی بدل

بھارت سرکار کا زہ ہے حفاظت اس کی
ذوال دھن سے لٹائے گا چاہت اس کی

سیلہ تبسم زہرہ رضوی

ذول سکا تھا۔

میں اسے لے کر ہی دو کے ایک ریٹورنٹ میں
چلا گیا۔ پہلے آکس کریم اور پھر کولڈ کافین منگوائی۔ ادھر
اُٹھ کر باتوں میں جب کافی دیر گزر گئی تو زور مینے
پوچھا۔ ”بس بائیں ہی کرنے کے لیے طلب کی گئی تھی
میں؟“ یہ کہتے ہوئے ایک دلربا سی مسکراہٹ
ہوٹوں پر دکھائی دی۔ میں بھڑک سا ہوا گیا۔

”ہاں“ زور مینے۔ ”آج تو بس تمہیں جاننے کا
پرگرام ہے۔ تہا رہی دریافت ایک ملاقات میں ہی۔“
اس ملاقات میں یہ راز کھلا کر شاہ صاحب کے
ہاتھ بہت لیے ہیں۔ زور مینے جیسی شیوں گفتے اور
توفیر لڑکیاں اس کے اٹھاؤں پر ناجی ہیں۔ گرچہ
کچھ کہی کسی ہیں جن جو اپنا پانی پیٹ پالنے کے لیے
بخوش یہاں آتی ہیں لیکن زور مینے ”تو جوان لڑکیاں وہ
ہیں جو اپنے عشق و محبت کے سلسلے میں اپنے محبوب کو
قدوس میں دیکھنے کی خواہش لیے شاہ صاحب کے
دور بارش حاضر ہوتی ہیں اور پھر محبوب قدوس میں
گرے یا نہ کرے وہ خود شاہ صاحب کے حضور
جاتی ہیں اور پھر یہ سلسلہ چل پڑتا ہے۔ زیادہ تر
لڑکیاں معزز گھرانوں کی اور ان کی تعلیم یافتہ ہوتی ہیں
کالج اور یونیورسٹی کی آزاد خیال اور آزاد معاشرے
کی پروردہ۔“

تاکرین کرام..... آپ خود بتائیے کہ معصومی
لڑکیوں کو زور مینے بتانے کا ذمہ دار کون ہے؟ یہ بے بارہ
رو معاشرہ؟ یہ مادر پدر آزادی کے دلدلہ بچے؟ یہ
اعوام و حند دولت کے پیچھے بھاگنے والے ماں باپ
جو اس حصول زر کی دوڑ میں مصروف ہو کر اپنے
اورد گرد سے بے نیاز ہو جاتے ہیں یا پھر یہ نام نہاد شاہ
صاحبان؟ جواب دیجئے کہ آپ بھی اس معاشرے
کے فرد ہیں اور یہ آپ کی بھی ذمہ داری ہے؟

اپنے آج کے اپنا کھٹ بھانے کے ارادے سے آئی
تھیں یا اپنے مسائل کے حل کے لیے شاہ صاحب
سے فعلی باب ہوئے؟ بہر حال جلد و چال و ڈھال
سے کسی معزز اور باوقار گھرانے کی دکھائی دیتی تھیں۔
اس کے بعد کی کہانی ہمارے لیے تو بہت مختصر
اور سنگین ہے لیکن شاہ کے لیے زمین ہے، ہوا کی
زبانی سنئے۔

اگلے روز میں مقررہ وقت پر گاڑی شاہ صاحب
کے مقدس آستانے سے ٹھوڑی دور پارک کر کے
ڈوئریل بجاکر لڑکی گاڑی میں آ بیٹھا۔ دو منٹ کے
بعد ایک طرح دار لڑکی باہر آئی اور اسے اعتماد سے
گاڑی کا گاڑ دوازہ کھول کر میرے برآمدگی سیٹ پر آ
بیٹھی جیسے کہ وہ میری کوئی عزیز ہو۔

”مہلے.....“ اس نے اسی اعتماد سے کہا۔ اسے
میرے ساتھ بیٹھے دیکھ کر کوئی بھی یہ نہیں کہہ سکا تھا
کہ وہ کوئی کال کرلے۔ دیکھنے والا بھی سمجھتا کہ کوئی
باپوہ دیوار لڑکی اپنا کوئی مسئلے کے خفاخہ آئی تھی
اور اب واپس جارہی ہے۔

”کیا میں آپ کا نام پوچھ سکتا ہوں؟“
”ابھی نہیں میں روڈ پر پہنچنے کے بعد۔“
”سوری“ میں نے کہا۔

اور پھر میں روڈ پر آتے ہی اس نے کہا۔ ”میرا
نام زور مینہ ہے۔“ اور ساتھ ہی اس نے اپنے وجود کو
چھپائے سیاہ چادر بھی اتار کر پھینک دی۔ پھر ہینک
دی۔ اب اسے کوئی دیکھنا تو ناممکن کہہ سکتا تھا کہ وہ
کیا دیوار لڑکی نہیں بلکہ کال گرل ہے۔ نہایت حسین
سراپا دراز سیاہ گالے ہاتھ بڑی بڑی سیاہ پرکشش
آنکھیں سرخ و سپید رنگ دروازہ قضاوت شراؤں پر
شاگنگ بیک شٹ میں وہ ابھرا دکھائی دیتی تھی۔
اس کا حسن اور گلاز جسم دیکھ کر کبھی پارسا کا ایمان

اٹھا سکے یہاں آنے جانے والے پر؟ یہاں 25
سالوں سے یہ کام چلا رہا ہوں عزت ہے ایک مقام
ہے آپ کے شاہی کا..... کوئی غلط بات کہنے والے کی
پہلو تو خط دراز ہی بیک ہوئی کر ڈالیں گے پھر ہمارے کرم
پر کسی کوئی ننگو تکی نہیں ہیں علاقے کا قحطانہ دار
ایس لی اور اس کے اوپر کے بڑے بھی ہمارے معزز
گاہک ہیں ان کی بھی ہم تبخشا خدمت کرتے
رہتے ہیں ان ہی کے ذریعہ سب کچھ چل رہا ہے
لیکن ان کی عزت کا بھی سوال ہے آخر..... اور اب آپ
اپنی فرمائش بتائیں کہ بہت وقت ہو گیا ہے اور باہر کچھ
اور تر نا ہوا ہوا ہے۔

”مختصر یہ ہم لوگوں نے جان چھڑانے ہی میں
عافیت جانی۔ شاہ نے ہمت کر کے اپنی فرمائش ٹوٹ
کراتے ہوئے کہا۔ ”شاہ جی، لڑکی دروازہ قضاوت
یافتہ گوری اور اردو اینٹلنگ ہو چکے روز تو صرف
چند گھنٹوں کے لیے نہیں باہر گھمانے پھرانے لے
جائیں گا۔ اگر وہ معیار پر پوری آتی تو پھر آئندہ روز
کی فرمائش اس میں کوئی تگ و دو نہ ہو۔“

”جی آپ کو مطمئن کرنا ہمارا فرض ہے پھر آپ تو یار
کے یار ہیں۔“ شاہ صاحب نے پھر اپنا نیک کام دہرایا۔
میں آپ کو یہ بتانا بھول گیا کہ جب شاہ
صاحب ہمیں اوپر بے عزت کردہ کی سیر کر رہے
تھے تو ڈوئریل بھی کھلی اور بوسن کی جن دھڑانے پھر نکل
کر کسی کوشاہ صاحب کی مصروفیت کی اطلاع دی گئی۔
ہم شاہ صاحب سے ہاتھ ٹاکر اٹھ کھڑے
ہوئے اور شاہ صاحب نے جلدی جلدی اپنا عامہ
زیبتن کر کے اپنی مسند تنہا لی اور ہم کرگشت کی
طرز رنگ بدلے شاہ صاحب کو دیکھنے کے تھے۔
باہر نکلے تو دو جوان رعنا لڑکیاں جو کھینے میں
بے حد اسارت تھیں ہمارے پیچھے اس مقدس خفاخہ
میں داخل ہوئیں۔ اب یہ نہیں جانتے تھے کہ وہ

موہاں کراچی والی ایسی جان سوز کائناتیں جنہوں نے اس ایجاد جدید کے ذریعے جنم لیا

متنازعہ

میری میراں محبت

مری آم کا خیال

روشنی مجھ سے ہم کلام ہوئی
دل کی گھول میں بھر نہ شام ہوئی

موہاں سے جڑی ایک عجیب محبت کی کہانی، اسے دل کی آنکھ سے پڑھیے



جلائے لڑکیاں مجھے پند ہی گی کی نگاہ سے دیکھتے مگر کسی نے بھی پیار کا اظہار نہ کیا۔ شادی کے بعد میں نے فیصلہ کیا کہ چلو آئی ہوئی سے عشق کروں گا اور اپنی اس خواہش کی تکمیل کروں گا مگر بد قسمتی سے مجھے جو بیوی ملی وہ ہر لحاظ سے پھر پرچی۔۔۔

صرف پانچ جماعتیں پاس عمر میں مجھ سے پانچ سال بڑی واہجی بی بی تھیں جس میں ذرا عجیب کشش تھی جیکہ اس کی شخصیت میں رومانس نام کی ذرا سی بھی رقی نہ تھی عشق و محبت کے جذبے سے جاری تھی حدود درجہ کی دیکھا تو ہم پرست بھی تھی۔ اسے کھر کے کام کاج سے بھی کوئی خاص دلچسپی نہ تھی نہ بی بی کی دیکھنے کا حق نہ ظلم کا نہ بڑے لکھنے کا اور نہ ہی کسی شوشل انیکوینٹیڈ کا نہ ہی بے سونے کا کوئی شوق تھا۔ وہ ایک بد پرستی عشق کے جذبے کو فضول سمجھتی تھی مزید یہ کہ سر دہراور شرمیلی آدمی کے ایک بیٹے پر میرے ساتھ سونے سے اس کو شرم آتی تھی جہاں ہمارے ازدواجی تعلقات میں کوئی کرم جوش نہ تھی اسی لیے مجھے اپنی بیوی سے عشق تو دور کی بات ذرا سی بھی کچی نہ رہی۔ گھر میں میرا دل بالکل نہ لگتا تھا میں نے تھما تھما کر سگریٹ پینے لگا تھا گو والے پان کھانا اور زیادہ روزانہ وقت گھر سے باہر دوستوں میں تاش کھیلنے میں گزارا کرتا سی ڈکر پر زندگی گزارتے ہوئے ہمارے دو بچے ہو گئے۔ مجھ پر ہر وقت مایوسی اور فخر کی طاری رہتی تھی اور میں وقت سے پہلے ہی یوز حائل نظر آنے لگا۔

ایک دن میں اسے آفس میں تھما تھما تھا اور اپنی سوچوں میں تھا کہ میرا سوسائٹی بچ اٹھا کی تانی خاںبر تھا۔ میں نے کال اینڈیڈ کی تو ایک لڑکی نے بڑے شائستہ اور مہذب انداز میں سلام کرتے ہوئے کہا۔ ”میری صاحبہ سے بات کر دو اس۔“ ”سوری۔۔۔ یہ صاحبہ کا نمبر نہیں ہے۔“ میں

موہاں فون سے جڑی آپ نے بہت سی ایسی کہانیاں پڑھی ہوں گی جن میں کسی مرد نے کسی عورت کی عزت پر ہانسی کی عورت نے کسی مرد سے دھوکہ کھایا کسی کی زندگی برباد ہوئی کسی کا گھر اجڑا اور کوئی اپنی جان سے کیا مگر میرے ساتھ حیرت انگیز نا قابل یقین اور ناقابل فراموش حالات پیش آئے اور موہاں فون دوسری سے دوسری میری زندگی کا رخ تبدیل ہو گیا بلکہ میری زندگی سنوڑ گئی۔

میرا نام مندر ہے۔ گھر بچاؤ میں کے بعد مجھے ایک سرکاری محکمے میں ملازمت مل گئی۔ میں ایک ڈیپارٹمنٹ میں ملازمہ رہا مگر وہاں پرست نہیں۔ میرا گورنگ اور لباس بد ہے۔ میں فطرتاً ہی پندہر محبت کا حامل ہوں شادی ایسے میری زندگی بڑا خوش اور سنار رہی کہ میں کسی لڑکی سے پیار کروں اور کوئی لڑکی مجھے ٹوٹ کر چاہے مجھ سے محبت کرے مگر میں اپنی خواہش کو کسی عملی جامہ نہیں پہناتا کہ مجھ میں شرافت کے ساتھ جھگ بہت زیادہ تھی۔

خاندان اور محلے میں بہت سی لڑکیاں تھیں اور ان میں کچھ اچھی بھی لگتی تھیں مگر میں جب بھی کسی لڑکی سے بات کرنے کی کوشش کرتا تو میرے ہاتھ پاؤں پھول جاتے زبان انک جانی اور الفاظ جیسے پلٹن میں پھنس کر رہ جاتے۔ میرے ساتھ ایک اور مسئلہ بھی تھا کہ بچپن سے میری آواز بہت بھاری بھوری اور گھٹ سے گھٹا اس وجہ سے بھی کسی لڑکی سے اظہار عشق نہ کر سکا۔ یوں میری زندگی کی کتاب کا عشق و محبت والا صفحہ ہمیشہ خالی رہا اور میری اس تنہائی تکمیل نہ ہو سکی۔ جوں ہی مجھے سرکاری فوٹری ملی، گھر والوں نے فوراً ہی مجھے شادی کے بندھن میں باغیچہ کی تیاریاں شروع کر دیں اور ایک بدستور دیکھ کر شادی کی تاریخ مقرر کر دی۔ مجھے اس بات کا شدید ملال تھا کہ کاش۔۔۔ میری شادی کو میرج ہوئی

نے کہا پھر اس نے مجھ سے پوچھا کہ میں کون بول رہا ہوں تو جواب میں میں نے اپنا نام بتایا۔
”مگر حاجہ نے تو یہی نہرہا تھا؟“ اس نے

جہرا کر کہا۔
”میں تو کسی حاجہ کو نہیں جانتا؟“

”گلتا ہے کہ غلطی سے رانگ نہرل گیا ہے۔“
اور وہ معذرت کر کے فون بند کر دیا۔

”چیز ایک منٹ..... آپ مجھ سے ہی بات کر لیں۔“ میں نے جلدی سے کہا۔

”جب یہ حاجہ کا کمر نہیں ہے تو آپ مجھ سے کیا بات کرنا چاہتے ہیں؟“ اس نے پوچھا۔

”بات دراصل یہ ہے کہ کوئی لڑکی میری دوست نہیں میرا بہت دل چاہتا ہے کہ میری کسی لڑکی سے دوستی ہو آپ کی آزاد بہت خوبصورت ہے لہذا میری

انتظار سے کہ مجھ سے دوستی کر لیں۔“
”میں آپ کو جانتی نہیں کہ آپ کون ہیں اور کس قسم کے انسان ہیں پھر میں کیسے آپ سے دوستی کر سکتی ہوں؟“

”میں شریف پڑھا لکھا اور سرکاری ملازم ہوں۔“ میں نے اپنا منکر اور صدمہ بھی بتایا۔

”ٹھیک ہے میں سوچوں گی کئی وقت تو مجھے اپنی شیلی حاجہ سے بات کرنی ہے۔ اگر دل مانا تو آپ کو کس کال دوں گی۔“ اور پھر اس نے فون بند کر دیا۔ اس کی آواز اور بات کرنے کا انداز اتنا دلکش تھا کہ وہ فوراً ساعت کے راستے میرے دل میں اتر گئی تھی۔

میں رو دینے والے انداز میں ڈاعا میں کرنے لگا کہ کاش..... لڑکی میری دوست بن جائے۔ اس کے ساتھ ہونے والی گفتگو پر میں خود حیران تھا کہ

میں نے اتنی باتیں کرنے کا حوصلہ کس طرح رکھ لیا؟
خیر میں اس کی کس کال کا بڑی شدت سے انتظار کرنے لگا کوئی آدھے گھنٹے بعد اس نے مجھے کس کال دی تو میں نے فوراً اسے ونگ بیک کر دیا۔

سلام کے بعد وہ کہنے لگی۔ ”آپ مجھے اپنے بارے میں تفصیل سے سچ سچ بتائیں کہ کہاں رہتے ہیں؟ کون ہیں؟ وغیرہ وغیرہ۔“ جو اب میں نے اس کے اپنے بارے میں سب کچھ سچ سچ بتا دیا اور یہ بھی بتایا کہ میں شادی شدہ ہوں اور دو بچے بھی ہیں۔

”یہ بات سن کر میرا دل خوشی سے بھر گیا۔“
وہ بہت خوبصورت باتیں کرتی تھی۔ اس کی گفتگو اتنی دلکش اور مزے دار ہوتی کہ دل چاہتا کہ وہ ساری

اندلی بولتی رہے اور میں اس کی مزاح کلاموں میں جس کو دل چاہتا تھا اسے آواز سناتا رہوں۔ جب وہ کسی بات پر مکالمہ کرتی تو لگتا جیسے ہلکے بنگ لگائے ہوں۔

وہ روزانہ باقاعدگی سے مجھے کس کال کرتی اور ہم زندگی کے ہر موضوع پر خوب باتیں کرتے۔ اس کے پاس بہت علم تھا وہ مذہب سیاست مکمل کی دینی علم معاشرتی معاملات معاشی حالات اور سرکری

معاملات پر بے تکان بولتی اور میں بڑی دلچسپی سے اس کی خوبصورت باتیں سنتا۔ میں روزانہ اس کے فون کا شدت سے انتظار کرتا تھا۔ اگر کسی اسے فون کرنے میں دیر ہو جاتی تو مجھے بہت بے چینی اور

انجمن ہونے لگتی۔ وہ میری زندگی میں جو اب اسے مجھ کی طرح داخل ہوئی تھی اور میری زندگی میں کی زندگی کو گھرا بنا دیا تھا۔ دن اس کی طرح گزرتے رہے اور ایک روز مجھ پر انکشاف ہوا کہ میں اس کی

محبت میں مبتلا ہو چکا ہوں۔ اس دن اس کا فون آیا تو میں نے ڈرتے ڈرتے اس سے کہا تھا۔

”جھپک جھپک تم سے عشق کرنے لگا ہوں اور تمہیں لوٹ کر چاہتا ہوں.....“

”مجھے بھی پیار ہو گیا ہے اور میں بھی تم سے شریعت محبت کرتی ہوں جب تک تم سے بات نہ کروں

مجھے سکون نہیں ملتا۔“ اس کی زبانی یہ سب سن کر میں ہواؤں میں اڑنے لگا تھا۔ یہ خیال ہی خوش کن تھا کہ کوئی مجھے جتنی محبت کر چاہتی ہے۔

”لیکن صفر ہماری محبت ایک انداز کی ہے تم

مجھ سے کبھی بھی شادی کا نہیں کہو گے کیونکہ ہمارا ملاپ نامکن ہے۔“ ان ہم مرتے دم تک ایک دوسرے سے بچی اور پاکیزہ محبت کرتے رہیں گے کیونکہ صرف حاصل کر لینے کا نام ہی محبت نہیں ہے۔ اس کی اس بات پر مجھے بھرپور بھی تھا کیونکہ پھر میں نے غور کیا تو اندازہ ہوا وہ درست کہہ رہی تھی۔

ایک روز مجھ نے مجھ سے میرے معاملات اور عادت کے بارے میں تفصیل سے پوچھا۔

میں نے اس کو سب کچھ سچ سچ بتا دیا کہ میں سگریٹ پیتا ہوں تمباکو والے پان کھاتا ہوں اور تاش کھیتا ہوں۔ نماز بھی نہیں پڑھتا۔ یہ سب جاننے کے بعد

اس نے مجھ سے وعدہ لیا کہ میں آجندہ باقاعدگی سے پانچ وقت کی نماز باجماعت پڑھوں گا جس پر میں نے اسی دن سے نماز پڑھنی شروع کر دی کی پھر اس نے میرے پان کھانے بند کر دیے اور تاش کھینے پر

بھی پابندی لگا دی۔ مجھ میں ایک اور بری عادت بھی تھی وہ یہ کہ کٹر پان میں کرتے ہوئے میرے منہ سے گالیاں نکال بھی چلیا کرتی تھی۔ اس نے مجھے اپنی قسمیں کسب میں بھی کوا لٹی نہیں دوں گا پھر اس نے مجھے تاکید کی کہ صبح فجر اور مغرب کی نماز کے بعد

قرآن پاک کی تلاوت کروں۔

ایک روز اس نے اپنی محبت کا واسطہ رکھا تھا۔ ”اگر میں اس سے بچی محبت کرتا تو سگریٹ

پینا چھوڑ دوں۔“ اور میں نے اسی وقت سے سگریٹ چھوڑ دیئے۔ اس کی باتوں میں جانے لگا جاوہا کہ وہ مجھ سے جو کچھ میں پانچ دن وچرا اس کی ہر بات

مان لیتا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ میری شخصیت دن بدن گھرنی چلی گئی پھر اس کے کہنے پر میں نے روزانہ واک بھی شروع کر دی۔ واک کے دوران اکثر اس کی کال آ جاتی اور ہم ڈیڑھ دو گھنٹے باتیں کرتے۔

میں پانچ نمازیں پڑھ گیا تھا۔ تاش پان اور

سکرٹ چھوڑ دیئے تھے جس سے میرے اندر بہت سی خوشگوار تبدیلیاں آتی گئیں۔

ہماری محبت خداوتی کو کئی ماہ گزر گئے تھے اور میرے دل میں اس سے ملنے اور اسے دیکھنے کی خواہش شدت سے اٹھائیاں لینے لگی تھی۔ صواب میرا اس سے ملاقات کا اسرارِ بدن بڑھنے لگا۔ وہ مجھ سے ملاقات کا وعدہ کرتی رہتی مگر بقول اس کے دو وقت نہیں نکال رہی تھی۔

ایک دن میں نے ننگے آکر اس سے کہا کہ گزرتے
واقعی مجھ سے کچھ محبت کرنی ہو تو اسی جتنے مجھ سے ملو
روشنی بھجول گا کرتے مجھ سے محبت کا ناک کر رہی
ہو۔ تب اس نے دو دن بعد ملنے کا وعدہ کر لیا تھا۔ دو
دن میں نے کس سے بڑھ کر اسی میں گزارے تھے یہیں
اسی جاتا ہوں۔ جب ملاقات کا دن آیا تو سرت سے
میرے دل کی دھڑکنیں بڑھتی رہتی تھیں۔ میں
کسی روز اپنے آپ کو آکھنے سے پہلے ہی اس کی اور
خوب تیار کر لی تھی اس کا اندازہ بارے ملاقات کی کاوت
تھے۔ طے ہماری ملاقات ایک شہر میں ہوئی اور
میں اور پھر شہر کے بارے میں وہ ماہوں میں ہوئی۔

میں نے اسے دیکھا تو دھچکا دی رہ گیا 'اس کی آواز جتنی خوبصورت اور سحر منی 'اس سے بڑھ کر وہ خود سن کا شاہکار تھی۔ لگتا جیسے کوئی حسین مائل ہو۔ میں اس کے گلوئی سن میں محو رہ گیا۔ ہم اس جزل اسٹور سے قریبی یہ ٹوٹ کے چلی گئیں۔ جاکر بیٹھ گئے۔ میری نظر سن بہک کے خوبصورت چہرے اور حسین سراپے سے جتنی ہی نہیں تھیں۔ وہ میرے لیے بہت خوبصورت اور جیوت گفٹ لے کر آئی تھی۔ اب تم کھنٹے وہاں بیٹھ رہے کھانا وغیرہ کھایا۔ کبھی باہم سن میں اس کے کپڑوں سے بہت رنر بہت خوبصورت رہی تھی۔ میں نے راتیک سے اور کہا اس سے پوچھا کہ وہ سن علائے میں راتیک سے اور کہا

کرتی ہے مگر اس نے محض اتنا بتایا کہ وہ اس شہر میں
 رہتی ہے ہائی اس نے مزید کچھ بتانے سے معذرت
 کر لی۔ میرا وہاں کل کبیرے والا تھا میں نے اس کی
 بہت ساری تصویریں بنائی تھیں اس کی خوبصورت
 داڑھی اور بکڑی گھنی اور اس کی سودی بھی بنائی تھی۔
 جتنی بھی رقم پیٹھے رہے وہ تمام وقت دلغریب انداز
 میں تھی کسرا تھی یہی اس کبیرے دل میں شرت
 سے یہ خواہش جاگتی تھی وقت ختم جائے اور وہ ساری
 زندگی کبیرے سامنے اسی طرح بیٹھی رہے ہاں
 کرتی رہے ہفتی رہے اور میں اسے جو حیت سے
 دیکھتا رہوں مگر نفوس..... ایسا اندیشہ ہوسکتا تھا۔ وقت
 کا کام کرنا ہے اور اس کی عادت کا وقت بھی گزر
 گا۔ کبیرے کو کبوترا جانے کی عادت چاہی۔
 میں بھی اس کو بہت اچھا تھا کہ اس نے کبیرا اور وہ دو بار
 بہت جلد ملے کا وعدہ کر کے چلی گئی۔ سوچ تو یہ ہے کہ
 اس کے جاتے ہی میں ادا اس ہو گیا تھا۔

بہر حال ہماری روزانہ فون پر ڈیڑھ دو بجے ہوتی تھی۔ میرے بازو دستاب مجھے کھوکھو کرتے کہ میں نے فون کو مٹا دیا تھا اور نہ ہی تاش کیلکٹا ہوں۔ جس پر میں صرف کرتی کہ ہمارا باکرہ اُن سے جان چڑھا رہا تھا۔ میں سوچتا تھا کہ اگر میں نے تاش کیلکٹا کر بیٹہ وغیرہ دینے کی کوشش کی تو یہ بیگ کی مہمت کی تو تین ہوگی۔ دو میرے لیے ایک دیوٹی کی طرح تھی جس کا حکم بھلا تا میرے لیے کسی عبادت سے کم نہ تھا۔

تقریباً دو ماہ بعد پھر ہماری ملاقات ہوئی۔ میں اس کو بڑی حسرت سے دیکھ رہا تھا۔
 ”اے کھڑکھڑا رہے ہو؟“ اس نے پوچھا۔
 ”مہک۔۔۔۔۔ کاش۔۔۔۔۔ تم میری بیوی ہو سکتے یا میری بیوی تھی جس نے۔۔۔۔۔“
 ”تمہاری بیوی تمنا تو ناممکن ہے البتہ میں تمہاری بیوی کو بہتر بنا سکتی ہوں۔“

”اچھا وہ کیسے؟“ میں نے حیرت سے پوچھا۔
 ”اپنی بیوی کا موبائل نمبر مجھے دو۔“ اس نے کہا۔
 اس کے پاس موبائل نہیں ہے۔“

”ٹھیک ہے تم اسے موبائل خرید کر دو۔“
اس کے کہنے پر میں نے اپنی بیوی کو نیا موبائل
قسم لے کر دی اور اس کو کال کرنے اور سننے کا
ہقہ بتایا۔ میری بیوی کا کہنا تھا کہ اس کو تو نہ
فل کی ضرورت ہے اور نہ ہی شوق..... خیر بڑی
دل سے اسے موبائل فون رکھنے پر آمادہ کیا۔

میری بیوی نے کمری سفائی شروع کر دی اور پھر دو گھنٹے کے لیے ایک ماہی گھر ہوئی گی اور وہ خود اداں بیڈ پر لیٹی رہی گا کا ماغیرہ پکا لیتی جس کے ہونٹوں پر ہنس رہی تھی۔ سلیف کو اس سے کہیں تعاقب دوڑھانے کی وجہ سے بھڑکی ہوئی۔ اس نے اپنی بیوی کا مغرباں غبر گھر کو دے دیلی۔ اس نے چٹھوں میں کمری بیوی کو اپنی پیٹنی کے راسے سے کسی کاکڑ کے تلی۔ ایک روز میں بیوی نے ان خون کا کلا کو چھاتو اس نے کہا کہ یہ بہت ہی بیماری اور گہری پھٹی کانون ہے۔ یہ میں سرگرا کر گیا۔ جبکہ نے نہیں اپنی باتوں کا جاو چلایا کمری بیوی میں بہت ہی تہد بلیاں اور دھن میں لیکیں۔ اب وہ حڑے حڑے کے کھانے پانے کی گھر کے کام میں خوب دلچسپی لیتی تھی اس سلیف کی کا تاجار با تھا۔

ایک دن میں دو تریس ملّاں ہنک لئے تو ن پتا
 وہ میرے گھر میری بیوی سے ملنے جا رہی ہے
 نے مجھے تاکید کی کہ میں اس کی موجودگی میں
 نہ گھر نہ جاؤں۔ خیر اُس روز میں جان بوجھ کر گھر
 سے گیا تو دیکھا کہ گھر کا نقشہ ہی بدلا ہوا ہے۔
 فرہنگ پور بیڈروم وغیرہ کی سیٹنگ تبدیل تھی۔
 لگے ہوئے تھے اور میری بیوی بہت

خونگوار سڑو میں تھی۔ جب میں نے اس ہتھیار کی وجہ دریافت کی تو کہنے لگی کہ یہ سارا میری پہلی مہمک کا تھیل ہے۔ بہر حال اس روز مجھے بہت خوشی ہوئی تھی اب میں نے ایک خاص بات یہ نوٹ کی کہ جب کھر آتا تو میری بیوی بھی مسکری ہوئی اور بڑی خوش دلی اور چامٹے سے میرا استقبال کرتی۔ اس کا منٹا بھی دن بدن کم ہوتا جا رہا تھا۔ اب وہ ہر کام سلیٹے اور ڈپلن سے کرنے لگی تھی۔ پانچ وقت نماز پڑھتی۔ اپنے اونگھ گھگھارے خصوصیات کو بول کر رشتے داروں اور عزیز و اقارب سے تعریف حاصل کرتی اور بڑھ گیا تھا۔ آئے والے ہماہوں کی خوب توسیع کرتی حتیٰ کہ اس کی سلیٹہ مندی نکھ کھلا اور اچھے اخلاق کے سبب قابل ہو گئے۔

کشرہ فقط ہیک کہ وجہ سے ہوتا تھا۔ ان تمام
جزوں کی تفصیل ہیک کے نمونہ پر بتائی جس پر مثال
کا بہت ممنون ہوتا تھا اور اس کا ہر دم شکر ہے اور کتنا
جواب میں وہ خوب ہستی اور ہستی کردہ میں سب کچھ میری
عبادت میں کر رہی ہے۔ انھیں فرض کی وجہ سے ہم
جیتوں میں ایسا ہیونہی کہ زندگیاں تبدیل ہو گئیں اور
خاندان ہمیں ہستی مثالی طور پر اور زیادہ لگے۔ ہیک
ہمارے لیے بہت دوامیاس کرتی تھی۔ یاس کی دواؤں
محبت خلوص محبت اور محنت کا نتیجہ تھا کہ ہمارا گھر نہ
مثالی بن گیا تھا۔ ہماری دوستی دو سال تک چلی رہی۔
ہیک کی شخصیت میں ایک نقص تھا یا کیر کی تھی۔

جہاں نے اپنے کارناموں میں جو کس کرم سے ایک دوسرے کو چھوئے گا یا تو مجھے گلے کرے یا میرے دل میں اس کو چھوئے گا خیال بھی آیا تو مجھے گلے کرے یا میرے دل میں اس کو چھوئے گا خیال بھی آیا تو مجھے گلے کرے یا میرے دل میں اس کو چھوئے گا

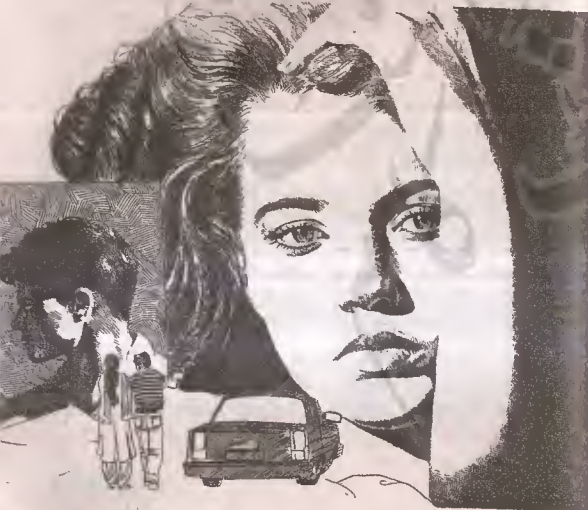
مہتاب خان

دو ایک نشان

غریب حسن کا خلیا

ایک آواز اٹھا لے جاتی ہے ہم کو
ایک سائے کے پیچھے ہم بھی چلتے ہیں

ایک پر اہم راہ کی عجیب کہانی، آپ کا اس قصے پر اعتبار کرنا پڑے گا



مہتاب میرے لیے اس سے بڑھ کر قیمتی تحفہ نہ کر آتی۔
پھر ایک روز مہک نے مجھے یہ دوح فرما کر سنائی
کہ اس کی شادی ہو رہی ہے اور وہ شادی کے فوراً بعد
اپنے شوہر کے ساتھ بیرون ملک چلی جائے گی۔ میں
بہت پریشان ہو گیا اور مجھ پر اداسی طاری ہونے
لگی۔ جب وہ آخری بار مجھ سے ملنے آئی تو اس کی
چھائی کا سوچ سوچ کر مجھے ہول اٹھ رہے تھے اور
آنکھوں سے آنسوؤں کی برسات جاری تھی۔ اس
نے نیچے اپنی سیم دے کر روئے سے منع کیا تھا میں اس
کی ایک ہی درخواست تھی کہ میں ہمیشہ اسے اپنی
ڈھانڈ میں یاد رکھوں۔ آخر چھائی کی کھڑی آن بچھی
میں نے ڈھیروں ڈھاؤں اور نیک تمناؤں کے ساتھ
اسے رخصت کیا کیونکہ اگلے روز اس کی اسلام
آباد روڈ پر تھی جہاں ایک فائیناسٹار ہوٹل میں اس کی
شادی کی تقریب ہونا تھی اور وہیں سے دہلی کے بعد
اس کی بیرون ملک روانگی تھی۔ اس کے جانے کے
بعد میری بیوی بھی اداس رہنے لگی تھی اور میں بھی بہت
منغوم رہتا تھا۔ جب بھی آنکھوں سے آنسو نکلتے تو
مجھے اس کی دی ہوئی قسم یاد آ جاتی اور میں اپنے
آنسوؤں کو روک لیتا اور دل سے اس کی خوشیوں بھری
زندگی کے لیے ڈھاکتا۔ جب بھی اس کی یاد تازہ
میں اپنے موبائل فون پر اس کی مودی اور تصویریں
دیکھتا اس کی ریکارڈ کی ہوئی آواز سناتا۔

مگر پھر اس کے دیکھ کر یہ سہارا بھی ختم ہو گیا ایک
دن مہتاب سائیکل چلاتے ہوئے میں موبائل فون میں رہتا
کہ فون میرے ہاتھ سے پھینک کر گیا اور پیچھے سے آنے
والا گاڑی نے اسے دھک دیا اور فون چٹکا چور ہو گیا۔ یوں
اس کی یاد تازہ کرنے کا ذریعہ بھی ہاتھ سے گیا۔
کوئی چھ ماہ بعد اچانک ایک کان فون آیا اس نے
بتایا کہ وہ بہت خوش ہے۔ اسے بہت چاہئے والا
شوہر ملا ہے پھر یہ چھ ماہ بعد اس نے فون پر بتایا کہ

مہک کی ایک بڑھ اور لاڈ والا محبت کو میں مرتے
دم تک نہیں بھول سکوں گا۔ میری بیوی کو آج تک
مہک سے میری دوستی اور اگلی تمام خوشگوار تہذیبوں
کے راز کا علم نہیں ہو سکا۔ اس کو کچھ بتاؤں کہ میری
کو سب کچھ بتا دوں پھر کچھ سوچ کر خاموش ہو جاتا
ہوں۔ آپ ہی مشورہ دیجئے، کیا میں اپنی بیوی کو یہ
سب کچھ بتا دوں یا راز ہی رہے دوں؟

اُن دنوں میری نئی نئی شادی ہوئی تھی اور اُن ہی دنوں میرا دفتر سے چناب کے ایک علاقے جو ہر آباد تاجدار ہو گیا تھا۔ میں نے سوچا کہ پہلے وہاں کرے گا گھر وغیرہ تلاش کروں پھر بڑی کو بھی پاس بلواؤں گا۔ یہی سوچ کر میں جو ہر آباد روانہ ہو گیا تھا اور وہاں پہنچ کر ڈیوٹی جوائن کر لی تھی۔

جو ہر باد میں میری رہائش ایک ہوئی تھی۔
 یہ براہ سبز علاقہ تھا وہی یہ دیوں کا موسم تھا۔ بڑی
 کڑاکی کے دار سردیاں پڑ چکی تھیں۔ میرا لہجہ چونکہ
 کراچی سے ہے اور کراچی میں سردی اتنی شدید نہیں
 ہوتی۔ لیکن میرا واسطہ کسی سردی سے پڑا تھا۔
 قصہ مختصر نے دہاں زرد و شوہر سے مکان کی تلاش
 شروع کی ہوئی تھی۔ اس سلسلے میں اپنے دفتر کے
 ساتھیوں سے بھی کھرب کھرب تھا۔

میرے دفتر کے ساتھیوں نے مجھے کافی گھر دکھائے تھے مگر مختلف وجوہات کی بنا پر مجھے اُن میں سے کوئی بھی پسند نہیں آیا تھا۔ اس تلاش میں دو ہفتے گزر چکے تھے اور معاملہ جوں کا توں تھا۔ ہوئی کہ رہائش بھی چھٹے ہفتے کی پڑ رہی تھی۔ بیوی کے بھی فون پر فون آرہے تھے۔ میری سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ کیا کروں؟

اُس روز صبح میں ہی سے ابراؤ کوہ تھا۔ شام
ہوئے ہی بارش شروع ہو گئی تھی اور موسمِ انتہائی سرد
ہو گیا تھا۔ میں ہوٹل کے کمرے میں پریشانی کے عالم
میں بیٹھا تھا۔ ابھر گرج چمک کے ساتھ تیز بارش ہو
رہی تھی۔ اُس وقت مجھے جانے کی بڑی طلب محسوس
ہو رہی تھی، سو میں نے ہوٹل کے پیرے رشید سے
جائے سکونائی ہوئی تھی۔ وہ خود ہی دیر بعد میرے
گھر گئے۔

رشید بہت شریف انفس اور بھلا انسان تھا۔ مجھ سے کافی بے تکلف ہو گیا تھا اور میرے کئی چھوٹے موٹے کام کر رہا تھا۔ مجھے چاہئے دینے کے بعد اس

نے مجھے پریشانی کے عالم میں بیٹھے دیکھا تھا تو فوراً ہی پوچھا تھا۔

”خیر تو ہے صاحب! آپ کچھ پریشان لگ رہے ہیں؟“

”ہاں پریشان تو ہوں اور پریشانی کی وجہ یہ ہے کہ مجھے اب تک کوئی کرائے کا گھر نہیں ملا ہے۔ اگر کوئی مکان پسند آتا ہے تو کرایہ زیادہ ہوتا ہے اور اگر کرایہ مناسب ہوتا ہے تو مکان اچھا نہیں ہوتا۔ مجھے یہاں اپنی بیٹی کو بھی بلانا ہے مگر جب تک گھر کا انتظام نہ ہو جائے میں آپس بھی نہیں بلا سکتا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ کیا کروں؟“

کچھ دیر کی خاموشی کے بعد رشید پرسوج اعجاز میں بولا تھا۔ ”صاحب! ایک جگہ کرائے کے لیے خالی ہے مگر وہ آبادی سے تھوڑی دور ہے۔ اُس کا مالک ملک سے باہر ہے لیکن اس کے بیٹے سے میری جان چچان ہے وہ جگہ سامان دغیرہ کے ساتھ ہی کرائے پر دے رہے ہیں اور.....“

”یار اس کا کرایہ بھی تو زیادہ ہو گا ناں؟“ میں نے فوراً ہی رشید کی بات کاٹی تھی۔

”صاحب.....! یہی تو اسی بات ہے کہ اس کا کرایہ کم ہے کیونکہ وہ غیر آبادی جگہ ہے جسے لیکن ایک بات تاملوں اس جگہ کے بارے میں مجھ کو سننے سے مشغول کیا ہوا ہے کہ وہاں کچھ سارے وغیرہ کا سلسلہ ہے۔“ رشید نے اس کو جھنجھکیے ہوئے کہا تھا۔ مگر صاحب.....! یہ تو ہمیں رشتے سے کم نہیں اس لیے ان باتوں پر یقین تو نہیں رکھتے ہیں کہ وہ اس طرف کے لوگ تو خاصہ تو ہم پرست ہوتے ہیں، وہ تو یونہی سنی سنی بات بغیر کسی تصدیق کے آگے بڑھا رہے ہیں۔“

”رشید! تم مٹی سے پتا کرو کہ کیا میں ایک دو دن اس جنگل میں گزار سکتا ہوں؟ اگر جنگل مجھے پسند آ گیا اور کرایہ بھی مناسب ہوا تو میں اپنی فیملی کو بلوا لوں

گاہ میں جانتا تھا کہ عام طور پر ایسا نہیں ہوتا مگر جب رشید نے منشی سے بات کی تو وہ اس پر راضی ہو گیا۔ منشی بھنگی کی دیکھ بھال کے لیے اکثر وہاں جایا کرتا تھا وہ نہ اس کی رہائش گاہ میں منشی سے اُس نے میرے لیے وہاں ناصر ایک کمرہ صاف کروا دیا تھا ساتھ ہی وہاں میرے لیے دو چار دن کھانے پینے کا انتظام بھی کر دیا تھا۔

وہ جنگ آہادی سے پھر جو ایک نسان مقام پر
مقام شہر سے باہر جانے والی سڑک سے جڑی ایک
چوٹی کی سڑک اس جنگل کے سامنے سے جاتی تھی
اسی سڑک پر دن بھر میں شاید ہی کوئی ٹیکسی یا بس
وغیرہ جاتی ہو۔ میں تین دن کی گاڑی سے کہ وہ جنگل
کے سینے کے لیے روانہ ہوا تھا اس دن بھی میں ٹیکسی
بائیں سڑک کی طرف بھرنی ہو جا چلا رہی تھی۔
جب میں جنگل میں پہنچا تو فحشی میرے خرم مقدم کے
لے وہاں موجود تھا۔

مثنیٰ مجھے دکانے لگا۔ یہ ایک کشادہ جگہ تھی۔ اس وقت میں بچہ محسن محسوس کر رہا تھا اسی لیے تعلیمی معیار نہیں کر سکا۔ ہم لوگ اس کمرے میں چلے آئے جو مٹی کے مے کے ٹکڑے کروایا ہوا تھا۔ اُس نے میرے لیے کھانا بھی تیار کر لیا ہوا تھا۔ ہم دونوں نے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھایا تھا جو بہت لذیذ تھا۔ کھانا کھانے کے بعد وہ چلا گیا تھا اور میں یہاں تنہا رہ گیا تھا۔

میں جھٹکے گا ایک چکر لگانے کے خیال سے باہر آ گیا تھا۔ اندھیرا بڑھا چکا تھا۔ پائس کم ہوئی تھی۔ مکان کے پچھلے دروازے سے کوئی پندرہ مڑ کی دوری پر کیراج تھا۔ میں نے اُس کا بھی چکر لگایا مگر اُس کے اندر نہیں گیا۔ ابھر اُھر کچھ ریل کرش اندر چلا گیا اور اُدھر تنگ روم میں جا بیٹھا۔ چاروں طرف مکمل سکوت طاری تھا۔ کہیں سے کوئی آواز نہیں آ رہی۔

هم سفر

اپنے رستے، سب چلتے تھے

ترے ساتھ

ہم جانے تھے

اپنے رستے، سب جانتے ہیں

ترے ساتھ

ہم ملتے ہیں

اپنے رستے، سب حائلوں کے

ترے ساتھ

ہم جائیں گے

اے ہمسفر، ہم کون ہیں؟

اور کون تھے؟

ظرف احسن، بتاؤتم

لکھنے پڑھنے والوں کا

برشا از اسے

بمصر مصر الكائن في

۱۵۸۱ تک ۱۵۸۲

نہجہ الیہ کا آخری

ظریف احسن

تھی سردرات کا سناٹا چھایا ہوا تھا۔

رات بہت سکون سے گزری تھی۔ میں نے وہاں کوئی غیر معمولی بات محسوس نہیں کی تھی۔ میں بڑا بہادر آدمی واضح ہوا ہوں مگر مجھے یہ کہنے میں کوئی عار نہیں ہے کہ رات کے اندھیرے میں مجھے کچھ خوف سا محسوس ہوا تھا چونکہ روشتی میں معدوم ہو چکا تھا۔ میں نے کچھ کا افسوس کیا تھا یہ ایک خاصا وسیع جنگ تھا جو مجھے بے حد پسند آیا تھا یہاں موجود فرنیچر اور تالین وغیرہ اگرچہ خاصے پرانے لگد رہے تھے مگر قابل استعمال تھے سو میں نے اپنی ہیوی کوکبی فون کر کے یہ خوش خبری سنا دی تھی کہ کرائے پر ایک بہترین بیگنل گیا ہے اور جلد ہی میں اسے بلالوں گا۔ وہ یہ سن کر بہت خوش ہوئی تھی لیکن میں نے اسے سنا دیکر وہ بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا کیونکہ عورتیں کچھ تو ہم پرست ہوتی ہیں اور پھر مجھے خود بھی ایسی کوئی غیر معمولی بات محسوس نہیں ہوئی تھی۔

وہ اس بیگنل میں میری تیسری رات تھی۔ کھانے وغیرہ سے فارغ ہو کر میں نے کئی دیر اپنی بیوی سے فون پر بات کی تھی۔ رات کے تقریباً بارہ بج رہے تھے میں بستر پر لیٹنے ہی جا رہا تھا کہ مجھے ایک کار کی آواز سنا دی دی گئی تو اس لگا تھا کہ وہ کار بیگنل کے گیٹ پر کھڑی ہوئی ہے۔ میں نے اٹھ کر کھڑکی سے باہر دیکھا تھا مجھے گیٹ کے پاس کار کی بیڈل لائٹ کی روشنی تو دکھائی دی تھی مگر کار وہاں سے نظر نہیں آ رہی تھی میں نے سوچا کہ گیٹ تک ہو آؤں اور معلوم کروں کہ کیا مسئلہ ہے؟

میں نے وہاں پہنچ کر دیکھا کہ ایک چھوٹی سی خوبصورت سفید کار گیٹ کے سامنے کوئی میں گڑکی دور پر چھوٹی سڑک کے سینے درمیان میں رکھی ہوئی تھی۔ ہیل لائٹ کی روشنی تھی جب میں گھوم

کے کار کے سامنے پہنچا تو دیکھا کہ ایک جوان انصر لڑکی ہونٹ اٹھا کر انجن پر کھجی ہوئی پچھو کر رہی تھی۔ "میں آپ کی کچھ مدد کر سکتا ہوں؟" میں نے اس کے قریب جا کر پوچھا تھا۔ "انجن میں کوئی خرابی ہوئی ہے گاڑی اسٹارٹ نہیں ہو رہی۔" اس نے انجن سے نظر اٹھا کر مجھے بخود دیکھتے ہوئے کہا تھا۔ "اچھا" میں نے دیکھا ہوں۔ "کچھ کہہ کر میں نے گاڑی اسٹارٹ کرنے کی کوشش کی تھی لیکن انجن ٹپ سے کس نہ ہو تھا۔ وہ اتنا گرم ہو گیا تھا کہ چھوٹے سے ہاتھ چلتا تھا۔ میں نے لڑکی سے پوچھا تھا۔ "بڑی ایئر میں پانی ہے؟" "مفروضہ ہوگا۔" اس نے بوسے لیتے ہوئے جواب دیا تھا لیکن مجھے اطمینان نہیں ہوا تھا۔ میں دوڑ کر اپنے کمرے سے پانی کی ایک بوتل لے آیا تھا اور بڑی ایئر کا ڈھکن کھول کر چھپے ہی اس میں پانی ڈالنا چاہا تھا وہ اٹل کر باہر آ گیا تھا۔ اس سے یہ ظاہر ہو گیا تھا کہ وہ لڑکی کا پیروں سے رہنے والی تھی یعنی وہ بوسے پر بھی رائیڈ کرنا چلی جا رہی تھی اور اب انجن بند ہو گیا تھا ہم لوگوں نے کافی دیر تک انجن ٹھنڈا ہوجانے کا انتظار کیا تھا لیکن کوئی مثبت نتیجہ نہیں نکلا تھا۔ "اس کا مطلب ہے کہ مجھے ساری رات یہاں رہنا پڑے گا؟"

"اس میں کوئی مشکل نہیں؟ مطلب..... اگر تم چاہو تو میں اس گھر میں تمہاری میرا پانی کر سکتا ہوں۔" میں نے اس کے سوال کے جواب میں کہا تھا۔ "مگر....." اس کے انداز سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ کرنا نہیں چاہتی تھی۔ "تم رات سے اس پیرا کی پیدل کہاں جاؤ گی؟" میرے سوال پر وہ خاموش رہی مگر کئی

دوران اس سڑک پر کسی گاڑی کی چمکتی بیڈل لائٹ نہیں اپنی جانب کی نظر آئی تھی۔ میں نے لڑکی سے کہا تھا۔ "کوئی تمہارا مسئلہ حل ہو گیا۔ یہ گاڑی نہیں شہر تک پہنچا دے گی۔" مگر میری یہ بات سن کر بھی اس کا اضطراب اور پریشانی کم نہیں ہوئی تھی۔ میں بہت قہر سے سوچنے لگا تھا کہ آخر لڑکی کا کیا ہے؟ گاڑی قریب آئی تھی تو میں نے اسے رککنے کا اشارہ کیا تھا۔ ڈرائیور نے گاڑی ہمارے قریب لا کر روکی تھی اور ساری صورت حال جان کر اس نے بتایا تھا کہ وہ شہر جا رہا ہے اور لڑکی کی خراب گاڑی کو tow کرنے کے لیے تیار ہے لیکن وہ لڑکی اس بات کے لیے بھی تیار نہ ہوئی تھی اور پھر آخر میں میں نے ہوا تھا اس لڑکی کی کار چیل کر بیگنل کے کیراج میں پہنچا دی جائے جسے وہ صبح کسی کو بیچ کر منگوائے گی جبکہ وہ خود اس وقت دوسری گاڑی کے ڈرائیور اس جوان کے ساتھ شہر جانے کے لیے تیار ہو گئی تھی۔ میں کیراج کی چابی ڈھونڈ لیا تھا اور کار کے ڈرائیور کی مدد سے جس کا نام جہانگیر تھا لڑکی کی کار دیکھ کر کیراج میں پہنچائی تھی اور پھر میں نے اُن دونوں سے کہا تھا۔

"رات کا سرد ہے اس لیے اگر وہ چاہیں تو اندر چل کر میرے ساتھ گرم گرم چائے پی میں پھر اپنے سفر پر روانہ ہو جائیں۔" جہانگیر ڈرائیور نے مشورے پر چل کے لیے تیار ہو گیا جبکہ لڑکی کچھ جھجک رہی تھی۔ بہر حال میں نے اُندر آ کر چائے بنا کر ان کی ایک ایک کپ انہیں دے کر خود بھی اُن کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھا دیا تھا۔ وہ تقریباً پچیس چھپیس برس کی ہوئی خاصی خوبصورت تھی لیکن اس کی آنکھوں میں ایک عجیب

ساٹھا تھا جسے میں ٹھیک لفظوں میں نہیں بتا سکتا۔ اس کے خوبصورت ہونٹوں پر کئی تاریکی رنگ کی لپ اسٹک بھی بوی عجیب سی ہی لگ رہی تھی۔ اس کا برتاؤ بھی مجھے غیر فطری سا لگ رہا تھا۔ میں اور جہانگیر بڑے خلوص سے اس کی مدد کر رہے تھے مگر یوں لگ رہا تھا کہ ہمارے لیے اس لڑکی کے دل میں کچھ شک ہے۔ چائے کے خاتمے پر جب جہانگیر گاڑی اسٹارٹ کرنے کے لیے بار کھانا کھا تو میں نے لڑکی سے پوچھا تھا۔ "تمہیں پیسوں وغیرہ کی ضرورت تو نہیں ہے؟" "نہیں..... میرے پاس کافی پیسے ہیں....." اس نے بہت رکھائی سے کہا تھا اور میرا رخسار یہاں دیکھے بغیر باہر چل گئی تھی۔ اُن دونوں کے جانے کے بعد میں نے سب دروازے بند کیے تھے اور اپنے کمرے میں جا کر سونے کی تیاری کرنے لگا تھا کہ میرے ذہن میں یہ سوچ جاگزیں کہ اگر وہ لڑکی کوئی ایسی؟ اور رات گئے اس سناٹا مقام پر کیوں اور کہاں سے آ رہی تھی؟ میرے دل میں تجا نے کیوں اس لڑکی کے متعلق ایک شک سا پیدا ہو گیا تھا وہ اپنی گاڑی اس بیگنل کے کیراج میں چھوڑ گئی تھی۔ میں نے سوچا تھا کہ اس گاڑی کو ڈرائیور نے ایک بار چیک کر لیا مگر ہوا اس لیے میں نے پھر کیراج کی چابی اٹھائی اور باہر کی جانب چل دیا تھا۔

باہر بالکل سناٹا چھایا ہوا تھا۔ ہوا بھی بند ہو گئی تھی۔ رات بالکل اندھیری تھی۔ کیراج میں کیونکہ روشنی کے لیے بلب وغیرہ نہیں تھا اس لیے میں ایک موسم بند اور بائیس ساتھ لے گیا تھا۔ یہ کیراج زیادہ بڑا نہیں تھا اس میں ہینکل ایک ہی کار کھڑی کرنے کی گنجائش تھی۔ میں نے موسم بستی کی روشنی میں کار کا پچھلا دروازہ کھولنے کے لیے

﴿ خواب نگار ﴾

ہم بھی

رت جکوں کی نرت میں

ترے خواب نگر

میں گھوما کرتے تھے

اور جن مشغلوں سے

آنکھیں دھنی ہوئی تھیں

ہم وہ منظر

پکوں سے چوما کرتے تھے

اشعر جواد..... کراچی

”کل رات بیٹھ آیا ہے؟ آپ کا دماغ تو خراب نہیں ہے؟ جو واقعات آپ نے سناے ہیں ان کو کڑے ہوئے تو بارہ سال ہو گئے ہیں؟“

آج میں اپنی بیوی اور شادی شدہ بچوں کے ساتھ ٹائرڈ زندگی گزار رہا ہوں لیکن مہرباں بس پہلے بیٹھ آئے والے اس واقعے کو آج تک نہیں بھولا ہوں اور یہ بات بھی اپنی جگہ طے شدہ حقیقت ہے کہ وہ واقعہ میرا کوئی خواب یا خیال نہیں تھا کیونکہ میرے پاس وہ چائے کا خالی کپ آج بھی موجود ہے اور محفوظ ہے جس میں اس لڑکی شہباز نے چائے پی لی تھی اور اس پر موجود مٹی کا پل اسٹک کا نشان تو کسی پانی، صابن یا کسی شے کے چھونے کے باوجود صاف نہیں ہوا ہے۔

۵۵

پولیس والے اپنے کام میں بڑے ماہر ثابت ہوئے تھے انہوں نے دوسرے دن اس واردات اور مجرمہ کے بارے میں میرے پاس لگا لگا تھا اور اس لڑکی کی شناخت کے لیے مجھے پولیس اسٹیشن طلب کیا تھا۔ میں اس وقت ڈیوٹی آفس کے پاس بیٹھا تھا کہ ایک پولیس والا بڑی سونپی سی ناک سے گراٹا ہوا کپا اور وہ ناکل اس نے ڈیوٹی آفس کے سامنے رکھ دی تھی۔ ڈیوٹی آفس نے اس لڑکی کا نام شہباز بتاتے ہوئے ایک نوٹو مجھے دکھایا تھا۔ وہ تصویر اس لڑکی کی تھی۔ میں نے اسے فوراً پہچان لیا تھا۔

ڈیوٹی آفس نے مجھے بتایا تھا کہ وہ لڑکی ایک عادی بچرم تھی اور اسے شروع کے دنوں میں وہ شائع مال وغیرہ سے مختلف چیزیں چرانے کے جرم میں کئی بار پکڑی بھی جا چکی تھی۔ اس کے بعد وہ جرموں کے ایک گروہ میں شامل ہو گئی تھی اور پھر مجرموں کے دو مختلف گروہوں کے ایک کا قیام کے دوران میں اس لڑکی کے ساتھ کوئی بار مادی گامی تھی۔ وہ اپنے ساتھی کی لاش کو کار میں لیے وہاں سے بھاگ نکلنے میں کامیاب تو ہو گئی لیکن اس کی کارشیر کے باہر کسی مقام پر خراب ہو گئی تھی۔ اس لڑکی شہباز نے لاش کے ساتھ اس کار کو ایک جنگل کے کیران میں چھپا دیا تھا اور خود کسی دوسری کار میں لفٹ لے کر شہر کے لیے چل دی تھی لیکن وہ شہر تک نہیں پہنچ سکی تھی۔ راستے میں تھیں رنداری کے باعث وہ کار حادثے کا شکار ہو کر الٹ گئی تھی اور وہ ڈیڑھ گھنٹے کے ساتھ جس کام کا شکار ہو گیا تھا حادثہ پر ہی ہلاک ہو گئی تھی۔

ڈیوٹی آفس کی زبانی یہ تمام کہانی سن کر میں نے انتہائی غیب سے کہا تھا۔ ”لیکن آپ کو یہ سب اتنی جلدی کیسے معلوم ہو گیا؟ یہ واقعہ رات ہی تو پیش آیا ہے؟“

اس کار میں شہر کے باہر گھومتی رہی ہوگی اور شاید اسی نے اس کا ٹکڑی بھی کیا ہو..... مگر اب تو وہ جا چکی تھی اور میں ایک بہت بڑی مصیبت میں محسوس کیا تھا۔ میں نے فیصلہ کیا تھا کہ پولیس کو اس معاملے کی خبر دوں گا۔ پھر میں نے صبح تک انتظار کرنے کے خیال سے کیران کا دروازہ بند کر دیا تھا اور اسے اتالا لگائے بغیر اپنے کمرے میں آ کر لیٹ گیا تھا۔

کروٹیں بدلے سج ہو گئی تھی۔ میں پولیس سے رابطہ کرنے سے پہلے ایک بار پھر کیران میں گیا تھا لیکن کیران کا دروازہ کھولتے ہی جیسے میری آنکھیں جھٹی ہو چکی ہو گئی تھیں۔ کیران خالی تھا، وہاں پتھر نہیں تھا نہ کار نہ ہی لاش..... کیران کے فرش پر جہاں رات کو موم پیٹی گئی تھی وہاں موم کی بوندیں بھی ہوئی تھیں اور کہیں کوئی نشان نہیں تھا۔ اس صورت حال کے بعد صرف دو ہی باتیں ممکن تھیں یا تو رات میں اس لڑکی کے پیچھے سے لوگ وہ کار نکال کر لے گئے تھے یا پھر میں شاید بیوی سے گفتگو کے بعد بستر پر لیٹے لیٹے اٹھ گیا تھا اور میں نے وہ لڑکی اور اس سے متعلق سب معاملہ خواب میں دیکھا تھا لیکن پھر فوراً ہی مجھے یاد آیا کہ میں نے تو خود ان لوگوں کے لیے چائے بنائی تھی انہیں پانی بھی اور چائے کے خالی کپ، ڈب، ڈرائنگ روم میں ٹیبل پر پڑے رہنے دیئے تھے۔ میں فوراً ڈرائنگ روم میں گیا تھا چائے کے خالی کپ وہیں موجود تھے۔ اس کا مطلب وہ سب خواب نہیں تھا وہ لڑکی رات میں کسی وقت کار کیران سے نکال کر لے گئے تھے۔

دوسری صبح میں سیدھا پولیس اسٹیشن جا پہنچا تھا اور تمام واقعہ پوری گوث موجود کر دیا۔ وہاں وہ قدرے ایرانی اور دہشت سے میری باتیں سن رہا تھا پھر اس نے میرے بارے میں میرے دفتر اور ہوٹل وغیرہ سے تسلی کر کے مجھے جانے دیا تھا۔

ہینڈل کو دیا یا کسی تھا کہ یوں لگا کہ جیسے کسی چیز کو اندر سے کسی نے دھکا دیا ہو دروازہ فورے سے کھل گیا تھا اور اس میں سے کوئی چیز نکل کر بالکل میرے اوپر آ گری گئی۔ اس کی چیز کے دھکے سے میں دیوار سے جا کھرا یا تھا اور میرے ہاتھ سے موم پیٹی بھی گر گئی تھی جو گرے ہی چھٹی گئی۔ خود ہر گرے والی چیز کو میں نے ذرا ٹائول کر دیکھا تھا تو مجھے معلوم ہوا تھا کہ وہ کوئی لاش ہے کسی آدمی کی لاش جس کی مونچھیں بھی تھیں کیونکہ میرے ہاتھ اس کے مونچھوں والے چہرے پر پڑا تھا۔ میرے تو روٹنے کھڑے ہو گئے تھے۔ مجھے اپنے دل کی دھڑکنیں لگتی ہوئی محسوس ہوئی تھیں۔ میں نے بڑی مشکل سے لاش کو کھینچ کر کار کے اندر کیا تھا اور کسی نہ کسی طرح دروازہ بند کر دیا تھا پھر کافی دیر اندر میرے میں کار کے پیچھٹونے کے بعد مجھے بھی ہوئی موم پیٹی اور ہاتھ کی ڈیپا لگ گئی تھی۔ میں نے اسے دوبارہ جلایا تھا۔ لاش کی صورت گاڑی میں موجود وہ دبہت لمبا تھا اٹلا چھٹ سے بھی لمبا وہ بہت دھاپتا اور سائل تھا اس کا چہرہ بالکل مر جھایا ہوا تھا۔ میں نے اس کا جائزہ لیا تو یہ پتہ چلتے میں درمیان لگی کہ اس کی موت کیسے واقع ہوئی تھی۔ اس کی کمر میں کوئی مادی گامی بھی، کوئی گولی یا سوراخ اس کی پیٹھ میں دائیں بازو کے نیچے دکھائی دیا۔ کوئی بار نہیں لگی تھی بلکہ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ مجھے پورے میں نہیں انک گئی تھی۔

تلاش کے باوجود مجھے اس کی جیب میں کسی طرح کا کوئی کاغذ نہیں ملا تھا کہ اس کی شناخت کا پتہ چل سکے۔ ہاں اس کے قریب پیرتھ سٹیٹیک میں ہزار ہزار کے نوٹ موجود تھے۔ سب دیکھ کر میرا دماغ جھک کر وہ کیا تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ کیا معاملہ ہے؟ آخر اسے کس نے قتل کیا تھا؟ اتنا تو صاف ظاہر تھا کہ وہ لڑکی اب تک اس لاش کے ساتھ

نسرین رانا

چالیس دن بعد

رہا چنانچہ کا خیال
جسے سمجھا نہیں شاید کسی نے
میں اپنے عہد کا وہ ساخڑ ہوں

جلد کانٹے والے ایک شخص کے ساتھ پیش آنے والا عبرت اثر قصہ عجیب



بقاعدہ تیز آواز میں رونا اور چلنا شروع کر دیا تھا۔
اچانک کسی نے پیچھے سے جھولا تمام لایا اور جھولا بچہ دم
رک گیا۔

”کیا ہوا ہے بی؟“ ماموں کی آواز کانوں میں
آئی۔ میں فوراً جھولے سے اتر گئی۔ ماموں مجھے اندر
لے گئے۔ اُس وقت میری حالت ایسی تھی کہ خوف
کے مارے پولا نہیں جارہا تھا۔ نانی نے میری حالت
دیکھی تو پریشان ہو گئیں۔

”ارے..... کیا ہوا میری بچی کو؟“
”جانتیں اباں.....! یہ باہر جھولا جھولتے ہوئے
چلا رہی تھی اور جھولا بھی بہت تیز تیز بل رہا تھا۔ اگر
میں فوراً نہیں جاتا تو یہ جو لے کر کرکھی ہو
جاتی۔“ ماموں نے بتایا۔

”ہزار دفعہ کہا ہے دوپہر میں اسکی باہر نہیں جانا
کر؟“ نانی نے مجھے آغوش میں لیے ہوئے ڈانٹا
تھا۔ میں دو دن تک بخار میں جیتی رہی تھی اور اس
دوران نانی نے کتنے ہی مولویوں سے مجھ پر دم کروایا
تھا اور اس دن کے بعد میں نے دوپہر کے وقت باہر
نکلنے سے تو یہ کر لی تھی۔ پان ہی دنوں جبکہ میں اس
حادثے سے تازہ تازہ ہوتی تھی تو ایک رات نانی نے
اسی علاقے میں ہونے والے ایک برادر واقعہ کے
بارے میں بتایا تھا۔ اس وقت نانی کے گرد میری امی
اور میری خالائیں بھی سو جو گئیں۔ واصل ان دنوں
میری چھوٹی خالو کو طفلہ بڑھنے کا شوق چرایا تھا۔ وہ
بچ وقت نمازی تو تھیں۔ نانی نے انہیں ایسا کرنے
سے منع کرتے ہوئے کہا تھا۔

”ایسے طفلہ نہیں کرتے ہیں۔ صبح نہیں ہوتا۔“
نانی نے چھوٹی خالو سے کہا تھا۔ اس وقت میں نانی
کے پاس ہی بیٹھی تھی۔

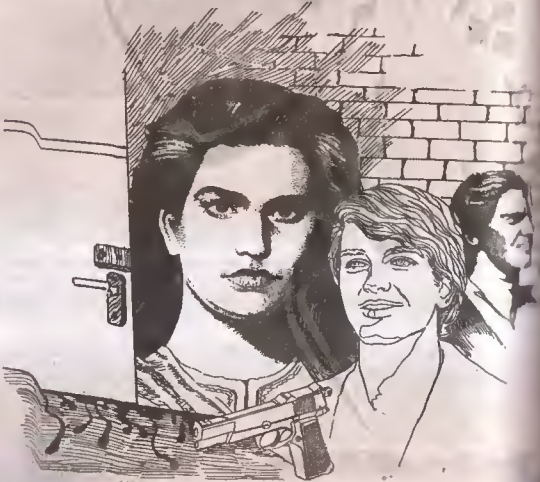
”جانتی ہو مسجد کے پاس والے گھر میں جو
عورت راتی ہے اُس کے شوہر نے چلہ کاٹا تھا؟

انجمن اہل حق

یا کمین صہبہا کا خیال

عجب ہے یہ تماشا گاؤ عالم
کہ اپنا بھی یہاں اپنا نہیں ہے

ایک بیکار عورت اور ایک فوجی جوان کی کہانی، ایسے واقعات اب معاشرے کا حصہ بن گئے ہیں



جائیں دن تک وہ اپنے کمر میں بیٹھے تھے خانے میں تھا۔ اکیلا رات دن وہ بیٹھ رہتا تھا۔ بیوی کو بھی تھے خانے میں آنے سے منع کر رہا تھا۔ بیوی بس کھانا دے جاتی تھی مگر تھے خانے میں اندر نہیں جاسکتی تھی۔ دروازے کے نیچے سے کھانا آگے کر دیتی تھی۔ وہ معطل نہیں کس وقت اٹھتا تھا؟ جائیں دن تک وہ شخص نہ کسی سے ملا اور نہ ہی بات کی بس تھپتھپانے میں چلکانے میں مصروف رہتا تھا۔ اتنا کہہ کر کافی خاموش ہو گئی۔

”پھر کیا ہوا اماں؟“ تھوڑی دیر بعد امی نے بے چینی سے پوچھا۔

”ہونا کیا تھا؟ اس کے چلے میں کوئی غلطی ہو گئی اور پھر وہ تہ خانے سے باہر نہیں آیا.....“

”اچھا؟“ چھوٹی خالہ کہنے سے حریت کے ملبے اُٹلا۔
 ”کیوں باہر نہیں آیا؟“ بڑی خالہ نے بھی محسوس سے پوچھا۔
 ”ہوا بول کہ اس نے چلے شروع کرتے وقت

اپنی ہوئی سے کہا تھا کہ چالیس دن بعد میں خود باہر
اؤں گا اس وقت تک موکل میرے قبضے میں
آجائیں مگر چالیس دن سے زیادہ گزر گئے اور وہ
باز نہیں نکلا تو اس کی بیوی پریشان ہوئی اس نے کئی
بار سوچا کہ خانے میں جا کر دیکھے مگر ہمارے شوہر
کی بات یاد آگئی کہ چلے کے دوران وہ خانے میں
نہیں آتا ماس خاں کے تحت کہ کہیں چلے رہا ہے
ہو جائے وہ خانے میں نہیں گئی مگر تک کہ دن
گزرے تو اسے تلخ رہ گئی۔ آخر شوہر قاتل اور ایک
دوسرے کو کھوج کر خانے کے پاس گئی تو اسے شدید
بو محسوس ہوئی ایسا لگا رہا تھا جیسے گوشت سڑا
ہو..... وہ پریشان ہوئی کہ میرے شوہر کا ہستہ
آہستہ پرے ٹھہر گیا پہلنے لگی۔ آخر تجر ہو کر اس
نے محلے والوں کو بلوایا جب لوگوں نے اسے خانہ
کو لواتا ایک دلزدہ منظر سامنے تھا۔ وہ خانہ بدلو سے

”واہ واہ! کیا خوبصورت جھمکے ہیں، کتنے کے ہیں؟“ شوئیس میں سے مختلف زیورات میں سے فرحانہ کی نظر سونے کے جھمکوں پر ٹپک گئی۔

”بی بی یہ جڑاؤ ہیں۔“ دکا عمار نے فرحانہ کی حالت پر نظر دوڑا ہے تو بیڑا بے نیچے میں کہا۔

میلی ہی جاوڑا رکھنے شلوار قمیض میں وہ اونچی نیچری پیر میں پھنسا کر ٹھیک کا کر نے والی ماسی لگ رہی تھی۔

”معتل کے اندر..... تو مجھے بھی نظر آرہا ہے کہ یہ جڑاؤ ہیں؟“ فرحانہ نے دانت پیٹے ہوئے سامنے بیٹھے دُور سے خوش شکل لڑکے کو مخاطب کیا۔

”تمیں ہزار کے۔“ دکا عمار نے منہ بناتے ہوئے جواب دیا۔

”اسے متیئے؟“ فرحانہ نے دانتوں میں لگی دانی۔

”سونے کا ریٹ آسمان سے بائیں کر رہا ہے بی بی.....“ وہ سخت کوفت کے عالم میں واپس کا کٹوٹر کی طرف بڑھ گیا۔

”ارے ارے دکھا تو دے کر نہیں بھاگ جاؤں گی۔“ فرحانہ نے اسے پلٹتے دیکھا تو بے اختیار ہنسی۔

”ہلرخریدنے والی تو ہو پھر دکھا بھی دوں گا۔ اب جاؤ تھوڑی زیادہ دماغ نہیں خراب کرو۔“

”آکر دیکھیں گا..... کہ تو ایسے رہا ہے جیسے دیکھنے کے بھی کچھ کئے ہیں۔ ایسے جان چڑھا رہا ہے مجھ جیسے نظر گدوں کی اس کی دکان کو۔“ فرحانہ نے ایک تہہ زلزلہ دکا عمار پر ڈالی اور باہر لڑ گئی۔

”کم بخت! اس کی دکان پر اچھے ڈیزائن نظر آتے ہیں۔ کسی نے ہی کہا ہے جسے مسکرا نہیں آتا۔ اسے دکان نہیں کھولنی چاہیے۔“ وہ رکشے کی طرف بڑھتی ہوئی خود سے جھوٹی۔

”.....“

”ڈیڑھ سو روپے ہوں گے۔“ رکشے والے نے سائیکل گاس میں دیکھتے ہوئے کہا۔

”نیو کراچی سے سر جانی ڈاؤن ڈیڑھ سو روپے؟“ کیا حسیا کے ہوئے؟

”ایک سو تیس میں چلتا ہے تو بیٹھ جاؤ ورنہ اپنی راہ لو۔“ رکشے والے نے سگریٹ لہوں میں دبا تے ہوئے بے زاری سے کہا۔

”سوئی گورنمنٹ کا بیڑہ فرق ہو، ہر چیز کے دام اتنے بڑھ گئے ہیں کہ بس اب تو اپنا دم لٹکنے کی قوت آگئی ہے۔“ ہاتھ میں پگھلا سبزی کا کھیلہ سیٹ پر مٹی کی اب وہ خود بھی بیٹھ چکی تھی۔

”بھیا! ذرا تیز چلتا، پہلے ہی بہت دیر ہوگئی ہے۔“ رکشا سٹارٹ ہوتے ہی فرحانہ نے کہا اور پھر اچانک ہی وہ کسی خیال کے تحت چوکی اور موہا بل بیک سے نکال کر مہر لانا لگی۔

.....

فرحانہ بیک کو مضبوطی سے بازو کے غچہ دیا ہے اسی سنار کی دکان پر داخل ہوئی۔ آج اس کے ساتھ ایک سات سالہ لڑکھی تھا۔

”لو یہ آج پھر آگئی؟“ زوہیب نے نعمان کی توجہ فرحانہ کی طرف دلائی۔

”ارے..... تیرے؟“ فرحانہ نعمان کو دیکھتے ہی بے ساختہ بولی۔ ”تجہ ہمارے دکان ہے؟“ اس نے ایک ہی سانس میں ہی سوال کر ڈالے۔

”نہیں! میرے دوست زوہیب کی دکان ہے میں ٹیکسری سے فارغ ہو کے اکثر یہاں اس کے پاس وقت گزارنے کے لیے بیٹھ جاتا ہوں۔“

”اوہ! اچھا.....“ فرحانہ نے طنز پر نظر زوہیب کے اسی پر ڈالی مگر آج وہ خود بھی ٹھیک ٹھاک تیار ہو کر آئی تھی۔ صاف سحرے لباس پر نفاست سے کیا میک اپ اس کی شخصیت کو نکھار رہا تھا۔

”اتح جانتے ہو اسے؟“ زوہیب نے نعمان سے آنکھیں سے پوچھا۔

”ہاں! یہ میرے ساتھ ٹیکسری میں کام کرتی ہیں۔“ ہمارے ڈپارٹمنٹ ایک ہیں لیکن میں ان کو آتے جاتے ہوئے اکثر دیکھتا ہوں۔“ نعمان نے وضاحت کی۔

”اوہ! اچھا.....“ زوہیب نے ہر پھر نظروں سے فرحانہ کا سر تاپا جائزہ لیا جو ابھی تک جھمکوں میں ہی مگن نظر آ رہی تھی۔

”یہاں جو پسند آئے آپ مجھے بتائیں، یہ اپنا بار ہے آپ سے زیادہ پرافٹ نہیں لگے گا۔“ نعمان نے فرحانہ کو مخاطب کیا۔

”نہیں بھئی! یہ جھکے تو واقعی میری ریخ سے باہر ہیں۔ آپ مجھے یہ سونے کی بالیاں دکھا دیں۔“ وہ دوسری طرف شوئیس میں لگی بالوں سے ایک پر لگی رکھتے ہوئے بولی۔ زوہیب نے فوراً ہی بالیاں نکال کر اس کے سامنے رکھ دیں۔

”ارے یہ تو بہت ہلکی ہیں۔“ فرحانہ خفیف سی ہو گئی۔

”سناڑ سے پانچ ہزار کی ہیں یہ محترمہ.....!“ زوہیب نے ہنسی لہوں میں دلائی۔

”یہ..... کاغذ جیسی بالیاں..... سناڑ سے پانچ ہزار کی؟“ وہ ہنسی ہی اب نعمان کا چہرہ دیکھ رہی تھی۔

”ارے یا! یہ اپنی جاننے والی ہیں! کچھ ڈسکاؤنٹ تو کرو۔“ نعمان نے زوہیب کو آکھ مارے ہوئے پیار سے سمجھایا۔

”وہ کیا ہوں۔“ زوہیب نے بالیاں اپنے سامنے رکھی دینے میں شین پر رکھ دیں اور پھر قدرے توقف کے بعد بولا۔ ”ٹھیک ہے آپ اس کے پانچ ہزار دے دیجیے گا۔“

”پانچ ہزار بھی زیادہ ہیں۔“ فرحانہ منہ بناتی

ہوئی بولی۔

”جائزہ رہا ہوں آپ سے تو نعمان کی وجہ سے پانچ سو میں سے چھوڑ دیئے ورنہ نہیں کریں اس میں میرا کوئی پرافٹ نہیں ہو رہا۔“ زوہیب اب اسٹول پر بیٹھا فرحانہ کے فیصلے کا منتظر تھا۔ ”ارے آپ اچھی طرح سوچ لیجئے جب تک میں آپ کے لیے گولڈ ڈرک منگوا رہا ہوں۔“ نعمان گولڈ ڈرک کا کہنے کے لیے شاپ سے نکل گیا جبکہ فرحانہ کی نظریں گھوم پھر کر ابھی گولڈ کے جھمکوں پر جاری تھیں۔

”میں نے ٹھیک ہے یہ بالیاں ہی دے دیجیے۔“ فرحانہ نے بادل آغوش نہ جواب دیا۔ اتنی دیر میں گولڈ ڈرک بھی آگئی۔

”یہ لیجئے آپ کی بالیاں۔“ چھوٹے سے سرخ مٹی ڈبے میں زوہیب بالیاں سیٹ کرتا اب فرحانہ کی طرف بڑھ چکا تھا۔

”اعتباط ہے رکھے گا آج کل کچھ پتا نہیں۔“ نعمان نے گولڈ ڈرک فرحانہ کے ساتھ بیٹھے ہوئے بچے کی طرف بڑھا تے ہوئے کہا۔

”ہاں یہ تو ہے۔“ فرحانہ نے بیک کی اندرونی جب سے پیسے نکال کر زوہیب کے حوالے کیے اور بالوں کا احتیاط سے بیک میں رکھنے لگی۔

.....

”ارے آپ کہاں غائب ہیں؟ کیسے ہیں؟ میں کہاں دن سے آپ کی تلاش میں ہوں۔“ کارمش ٹیکسری کے میں کینٹ پر فرحانہ نے نعمان کو دیکھتے ہی ایک ہی سانس میں ہی سوال کر ڈالے۔

”میں بالکل ٹھیک ہوں آپ سناڑے سب خیر تھے تو ہے نا؟“ نعمان متعجب مچا۔

”وہ..... اصل میں مجھے جیولری کی دکان والے زوہیب کا نمبر چاہیے۔“ فرحانہ نے جلدی سے اپنا مدعا بیان کیا۔

”خیریت زوہیب کا نمبر کیوں؟“ نعمان کے لیے میں ہیرا لی تھی۔
”افوہ وہ دفعہ موسوف کی دکان پر گئی ہوں مگر دونوں دفعہ اپنی بندگی سوچا پاب نون کر کے جاؤں تو بہتر رہے گا۔“ فرحانہ نے بات بتاتے ہوئے کہا۔
”دکان جسے کے علاوہ کھلی رات ہے۔ خیر میں دیتا ہوں نمبر۔“ نعمان نے موبائل جیب سے نکالتے ہوئے کہا۔

”ہاں ہاں پلیز۔“ آپ کی مہربانی ہوگی ورنہ سرجانی ناؤن سے ٹھیکرا اپنی چاٹ سخت کوفت میں جٹا کر دیتا ہے۔“
”کیجیے ٹوٹ کیجیے۔“ نعمان نمبر بتانے لگا اور فرحانہ تیزی سے وہ نمبر اپنے موبائل میں فیکس کرنے لگی۔

”دوئے آپ کا دوست بڑا اکڑوتم کا ہے۔“ فرحانہ منہ بتاتے ہوئے موبائل بیک میں رکھتے ہوئے بولی۔

”ٹھائی نہیں ہوئی نا اس کی جیسی اتنی اکڑ ہے۔“ نعمان ہنستے ہوئے بولا۔
”اکڑ تو اس کی اب میں نکالوں گی۔“ فرحانہ نے آہستگی سے کہا اور خوشی سے مسکرا دی۔ نعمان اپنے راستے پر چل دیا جبکہ فرحانہ تو کسی اور سی دنیا کی میر کے لیے لکھ چکی تھی۔

”اللہ۔ موبائل بچ سسٹم بنانے والوں کو سلامت رکھے۔“ فرحانہ نے زوہیب کا نمبر فریڈنز اینڈ فامیلی لسٹ میں فیکس کرتے ہوئے کہا اور فوراً ہی زوہیب کے نمبر پر کال ملائی۔ دوسری طرف سے زوہیب نے فوراً ہی کال ریسیڈ کر لی۔
”کیسے حراج ہیں آپ کے؟“ فرحانہ نے پری ادا سے کہا۔

”جی آپ کون؟“ دوسری طرف سے آوا آئی۔
”آپ کی عاشق۔۔۔۔۔“ ایک قہقہے کے ساتھ فرحانہ بولی۔
”آپ کی فضول باتوں کے لیے میرے پاس فالو وقت نہیں۔“ زوہیب نے یہ کہہ کر لائن کاٹ دی۔

”اوئے ہوئے۔۔۔۔۔ تو کیا اخروٹ ہے۔۔۔۔۔ تو پیٹے والا نہیں لگتا ہے اس کے آگے اپنا پیٹھ پھوڑنا پڑے گا۔“ فرحانہ نے دانت پیستے ہوئے کہا مگر بہت نہیں ہاری اور ایک بار پھر زوہیب کا نمبر ملا بیٹی کال ریسیڈ ہو چکی تھی۔
”زوہیب۔۔۔۔۔ پلیز۔۔۔۔۔ لائن نہیں کا لیجے گا۔“ وہ نرمی سے بولی آواز بتاتے ہوئے بولی۔

”آپ آخر ہیں کون؟“ اپنا نام سننے ہی زوہیب بات کرنے پر مجبور ہو گیا۔
”آپ جانتے ہیں مجھے نہیں۔۔۔۔۔“
”لیکن کیا کیا؟“ زوہیب نے سوال کیا۔
”میں کی میرے دل کا حال نہیں جانتے؟“ فرحانہ عبت بھرے لیے میں بولی۔
”سنائیے اپنے دل کا حال۔“ زوہیب کے لیے میں بے زاری تھی۔

”زوہیب میں جب سے آپ سے ملی ہوں آپ کو بھول نہیں پائی۔ آپ کی شخصیت میں جاوے ہے شاید میں اسی لیے بار بار آپ کی طرف متوجہ رہی ہوں۔“ وہ گہری سانس لیتے ہوئے بولی جسے کوئی بہت بوجھ اور بوجھ دماغ سے سرگ کر ہوا میں تحلیل ہو گیا۔
”آپ کی مجھ سے کب ملاقات ہوئی تھی؟“ زوہیب نے اعتبار سوال کر بیٹھا۔
”جب میں آپ سے طوں کی تو آپ جان

ہائیں گے۔“ فرحانہ نے جذباتی لہجے میں کہا۔
”آپ شاید کچھ غلط نہ رہی ہیں میرا مطلب ہے آپ جس سے ملی ہیں وہ نہیں ہیں ہوں۔“
”آپ کا گول چہرہ ہے ناں؟ اور داڑھی موٹھیں بھی ہیں؟“ فرحانہ نے فوراً اپنی لمبی کٹ کرنا چاہی۔

”ارے۔۔۔۔۔ تو مردوں کی شان ہے ہر دوسرا مرد داڑھی اور مونچھوں میں ہی نظر آتا ہے۔“ زوہیب ہنستے ہوئے بولا۔
”بے وقوف۔“ فرحانہ آہستگی سے بولی۔
”شاید آپ خود ہی بے وقوف بن گئیں۔“ زوہیب زور سے ہنسا۔

”آپ کی سندی ہوئی ہے پاس سنار کی دکان ہے ناں؟“ فرحانہ کا بچہ خاصا مضبوط تھا۔
”جی ہاں۔۔۔۔۔“ زوہیب نے بے اختیار کہا۔
”پھر میں بے وقوف نہیں ہوں۔ لیکن ہاں آپ سے پہلی ہی نظر میں پیار کرنے کی بے وقوفی رکھتی ہوں۔ یہ کہتے ہی فرحانہ نے لائن کاٹ دی اور زور زور سے قہقہے لگانے لگی۔
”مسٹر زوہیب۔۔۔۔۔ اب تم چھٹس گئے ہو اب اس نمبر پر تمہاری کال خوشی آئے گی۔“ شوخی اور مسکراہٹ سے کھیلنے اس کے لب بے سادہ موبائل کی اسکرین چونسے لگے۔

دوسرے دن ٹھیک بارہ بجے فرحانہ کا موبائل بجا۔
”زوہیب کا نام اسکرین پر بلیک کر رہا تھا۔“
”اوہنہ۔۔۔۔۔ ظاہری اگر کبھی۔۔۔۔۔ اب آیا نا لائن پر۔“ فرحانہ نے تیزی سے کال ریسیڈ کر لی۔
”بہت ناراض ہوں آپ سے“ پھر چھٹس سنوں گی اور ہاں آئندہ مجھ سے بے وقوف کے نمبر پر کال کرنے کی ضرورت نہیں۔“ یہ کہہ کر فرحانہ نے لائن کاٹ دی۔
”بے وقوف تو اب میں نہیں بنائوں

گی۔۔۔۔۔“ فرحانہ نے ایک فہمی مسکراہٹ کے ساتھ موبائل اٹھتے پھرتے ہوئے کہا۔ موبائل پھر بجنے لگا۔
”کیوں ٹھک کر رہے ہیں آپ مجھے؟“ فرحانہ ناراض سے لہجے میں بولی۔
”ارے۔۔۔۔۔ آپ تو اتنی ناراض ہیں کہ کچھ بھی سننے بنا لائن کاٹ دیتی ہیں؟“ دوسری طرف سے زوہیب کی آواز آئی۔

”ٹھیک ہے اب لائن میں کال کر دے“ کہنے کیا کہا نا چاہتے ہیں؟“ فرحانہ اپنی لمبی دباتے ہوئے گویا ہوئی۔
”آپ کو میرا نمبر کہاں سے ملا؟“
”آپ کے وزٹنگ کارڈ سے۔۔۔۔۔“ ابھی وہ آگے کچھ بولی کہ زوہیب بول اٹھا۔

”میرے وزٹنگ کارڈ پر میرا سیل نمبر نہیں ہے صرف شاپ کال پی ایبل نمبر ہے۔“
”جلیے اس سے کیا فرق پڑتا ہے میں آپ تک پہنچ گئی ہوں۔“ فرحانہ نے لیے باعث خوشی ہے مگر اس کی کچھ خاموشی اور کھانسی جانتے۔
”ان کے احاسات کی آپ کو بالکل قدر نہیں۔“ وہ بڑے لیے میں بولی۔

”اچھا ناں اگر میری وجہ سے آپ کا دل برا ہوا تو سوری۔ سوری میں بھی کسی سے نہیں کہتا لیکن آپ سے کہہ رہا ہوں۔“ زوہیب نے برقی رفتار سے اپنی بات مکمل کی۔
”اچھا ایک شرط پر آپ کا سوری منظور ہوگا۔“
”کون کی شرط؟“
”آپ کو مجھ سے ملنا ہوگا۔“ فرحانہ اپنی خوشی پر قابو پاتے ہوئے بولی۔
”ہاں ملنا تو میں بھی آپ سے چاہ رہا ہوں۔“ زوہیب کے لیے میں بھی جلد بازی تھی۔
”آپ نے میری شاپ تو دیکھی ہے ناں میں

اسی لائن میں آگے ایک آکس کریم پارلر ہے ہم وہیں کل ملتے ہیں۔“ زوہیب نے کہا۔
 ”ٹھیک ہے میں آ جاؤں گی۔“
 ”مگر میں آپ کو کچھ لوں گا کیسے؟“
 ”میں گرین سوٹ میں آؤں گی۔“ فرحانہ ہوسے بولی۔

”ٹھیک ہے باتیں پھر میں آپ سے کل کر کروں گا لیکن یاد رہے ٹھیک ہونا ہے۔“
 ”جی ٹھیک ہے۔“ فرحانہ کے ہاں بھرے ہی زوہیب نے لائن کاٹ دی۔
 ”یہ بولی نا بات زبردست فرحانہ.....! تم بالکل صحیح جا رہی ہو۔“

.....

آکس کریم پارلر کے باؤل سے بے نیاز زوہیب نے فرحانہ کا منتظر تھا۔ پانچ سے چھ اور چھ سے سات بجتے کو آئے تھے مگر فرحانہ نہ تو کال ریسیو کر رہی تھی اور نہ ہی خود آئی تھی۔ زوہیب آکس کریم پارلر میں بیٹھے جڑوں کو دیکھتا رہا تو کئی آنے والی لڑکیوں میں گرین رنگ کے پڑوں میں بیٹوں کو لڑکی کوکھتا رہا۔ بالآخر ٹھیک آکر وہ واپس دکان پر آ گیا۔

”مب خیریت تو ہے نا؟“ نعمان نے اس کے لئے ہوئے منہ کو دیکھ کر پوچھا۔
 ”کچھ خاص نہیں یاد نہیں۔ جس کام کے لیے گیا تھا وہ وہاں نہیں۔“ زوہیب نے اپنی ہنسی دباتے ہوئے کہا۔

”چلو یاد ہوتا ہے کسی بھی غم نہیں کرد پھر میں نکلوں؟ مگر ریسب میرا کہیں جانے کے لیے انتظار کر رہے ہیں۔“ نعمان کے جاتے ہی زوہیب کی انگلیاں مشتعل موبائل کی key پر بیٹھ کر رہی تھیں کہ اچانک ہی کال ریسیو کر گئی۔

”آئیں کیوں نہیں؟ میں نے کتنا انتظار کیا؟“ زوہیب خاصا برہم تھا۔
 ”سواری زوہیب ایک ایمر جنسی ہو چکی تھی میری بڑوں والی آئی کی کا ایکٹیف ہو گیا تھا۔“ جی جی تو بالکل ڈر گئی تھی۔ ”فرحانہ بے ساختہ رونے لگی۔
 ”ارے پلیز! رونا بند کرو۔“ زوہیب یکدم نرم ہو گیا۔

”شکر ہے میری آئی جی سگنل مجھے وہ اپنی جان سے زیادہ عزیز ہیں۔“
 ”اچھا.....“ زوہیب نے اسی پر اکتفا کیا۔
 ”بالکل اتنی ہی عزیز جیسے آپ۔“ فرحانہ کی سڑسڑولی آواز زوہیب کی سماعت سے نکل گئی۔
 ”آپ جی کبہ رہی ہیں؟“ زوہیب کے لہجے میں بے چینی تھی۔

”آپ مجھے فرحانہ کہہ کر بلائیں کیا آپ آپ لگا رہی ہے؟ اور میں چھوٹ نہیں ہوتی۔“
 ”اب کیسی ہیں آپ کی آئی؟“ زوہیب اب قدرے پرسکون تھا۔
 ”اب کالی بہتر ہیں۔ اچھا میں آپ سے لیٹ نائٹ بات کروں گی آگے ٹھوڑا معروف ہوں۔“ فرحانہ نے کمال مہارت سے بہانہ بنایا اور لائن کاٹ دی۔

”ہا.....ہا.....ہا.....“ زوہیب تم میرے انتظار میں صرف میرے بارے میں ہی سوچ رہے ہو گے۔ میں یہی تو چاہ رہی تھی اب تمہاری مجھ سے ملنے کی ٹاپ ہی مجھے مزہ دے لی۔ ایکٹیف نہ تو بہانہ تھا زوہیب اب تم مجھے چھوڑ کر نہیں جاسکتے۔“ فرحانہ کے چہرے پر لڑائی کی خوشی کی حد تھی۔

.....
 ”یار زوہیب“ خیر خیریت تو ہے نا؟ میں دو تین دن سے تمہیں پریشان دیکھ رہا ہوں؟“ نعمان

نے زوہیب کو کریدنا چاہا۔
 ”کچھ خاص نہیں، اسی لیے ایک برس ملسد ہے۔ انشاء اللہ جلدی حل ہو جائے گا۔“ زوہیب نے آنکھیں سے کہا۔
 ”اچھا پھر میں نکلتا ہوں تم فون پر مجھ سے رابطہ رکھنا دینے کی سونے کی بوتلی قیمت کے باعث کوئی گاہک تو ہے نہیں۔“

”ارے یہ بھی کوئی کہنے کی بات ہے بارزندہ صحبت باقی۔ میں ہوں ناں تیرے ساتھ دیکھ لوں گا۔“ نعمان نے زوہیب کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا تھا۔
 ”نعمان کی روایتی کے زماور بعد ہی موبائل پر فرحانہ کی کال آئی تھی۔ زوہیب نے فوراً کال ریسیو کی تھی۔

”کیا بات ہے آج آواز میں وہ جوش نہیں؟“ فرحانہ نے زوہیب کی آواز سننے ہی کہا تھا۔
 ”بس طبیعت کچھ ٹھیک نہیں ہے مگر میں درد ہے میرے۔“ زوہیب کے لہجے میں کٹھن تھا۔
 ”میرے پاس آ جا میں آپ کا سر دبا دوں۔“

”جی نہیں میں ٹھیک ہوں ابھی پوسٹان لوں گا تو بالکل فٹ ہو جاؤں گا۔“ زوہیب کے بولنے لگے جواب پر فرحانہ زور سے ہنس دی۔
 ”زوہیب“ آپ کا دل نہیں چاہتا جب آپ کی ایسی کیفیت ہو تو کوئی آپ کا سر دباے؟ پیار سے آپ کا سر اپنے گاندھے پر رکھ کر آپ کے بال سہلائے؟“

”ہوں.....“ زوہیب ہوں پر اکتفا کیے اپنے دل کی بے ترتیب ہڑھڑکوں کو سن رہا تھا۔
 ”اف زوہیب“ میرا تو دل کرتا ہے.....“ وہ اتنا ہی کہہ کر خاموش ہو گئی۔
 ”تمہارا دل کیا کرتا ہے؟“ زوہیب بے چین ہو چکا تھا۔
 ”کچھ نہیں رہے ہیں مجھے شرم آ رہی ہے۔“
 ”پھر بھی کہو۔“ زوہیب اصرار کر رہا تھا۔
 ”مجھے آپ سے ملنا ہے زوہیب“ کتنے دن ہو گئے آپ کو دیکھا ہی نہیں؟“ فرحانہ گہری سانس لیتے ہوئے بولی۔
 ”لو! مجھ سے؟ مجھے خود نہیں دیکھتا ہے۔“ عجیب آگم میں جل رہا ہوں۔ تمہاری باتوں نے مجھے امیر کیا ہوا ہے ایسا لگتا ہے تم سے جنم کا رشتہ ہے۔“ زوہیب وہوش کی سی کیفیت میں بول چلا چلا رہا تھا جبکہ فرحانہ کا بس نہیں چل رہا تھا کہ خوشی سے چلا نہیں لگتی۔
 ”مجھے نا ایسا سار ہو گیا دیکھنے کا شوق ہے آپ کبھی گئے ہیں وہاں؟“ فرحانہ بے ساختہ دل کی بات زبان تک لائی۔
 ”ہاں! جا چکا ہوں چلتا ہے وہاں میرے ساتھ؟“
 ”ہوں.....“ فرحانہ نے آنکھیں سے کہا۔
 ”چلو ٹھیک ہے کل چلتے ہیں۔“
 ”کیا سچ؟“ فرحانہ کی آواز میں خوشی اور خوشی آ گئی۔

”ہاں! بھی“ میری قہر کی دکان تک پہنچو پھر وہاں سے کیسے لیں گے۔“ زوہیب نے دوسرے دن کا پروگرام بناتے ہوئے کہا۔
 ”اوہ آئی لو یو سوچ زوہیب.....!“ فرحانہ نے استے زور سے کہا کہ زوہیب ایک بل کے لیے موبائل کان سے دور کرنے پر مجبور ہو گیا۔
 ”پاکل ہو بالکل.....“ زوہیب اس وقت ہواؤں میں اڑ رہا تھا اور خود کو دنیا کا خوش نصیب انسان تصور کر رہا تھا۔

ٹیکسی جیسے یہ زوہیب کی دکان کے سامنے رکھا
وہ بھی سنواری فرحانہ کو دیکھ کر بے ساختہ بولا۔ ”اوہ
ہو۔ تو تم ہو؟“

”کیوں میں ابھی نہیں ہوں کیا؟“ فرحانہ نے
خفگی سے سائڈ ڈور کھولتے ہوئے کہا۔

”نہیں ابھی ہوئیں نا میں زیادہ بچی کرتی ہو۔
یہ کیوں ہے؟“ فرحانہ کے ساتھ ایک سات سالہ بچے
کو دیکھتے ہوئے زوہیب نے پوچھا۔

”یہ میرا سب سے چھوٹا بھائی ہے مجھ سے بہت
پیار کرتا ہے بلکہ میرے بغیر نہیں رہتا اس لیے میں
ہیش اسے اپنے ساتھ ہی رکھتی ہوں۔“ فرحانہ نے
منفصل معلومات پہنچائیں۔

”اچھا جی۔۔۔۔۔“ زوہیب ٹیکسی ڈرائیور کو ہونٹ
کا پتا بتاتے ہوئے فرحانہ کی طرف متوجہ ہوا۔

”وہ لے کر تم ایک دفعہ میرے کہدیتیں کہ مجھے آپ
کی دکان پر جھکے پسند آئے تھے۔“

”تو وہ آپ میرے لیے لے آئے؟“ فرحانہ
نے زوہیب کی بات کاٹتے ہوئے انسانی سے سوال
کیا۔

”جی نہیں میں تمہیں پہچان جاتا میرا یہ
مطلب تھا۔“ زوہیب نے بات مکمل کی۔

”تجسوس۔۔۔۔۔“ فرحانہ نے منہ بناتے ہوئے
کہا جبکہ زوہیب معنی خیز انداز میں مبرا کردہ گیا۔

.....

زوہیب نے رفتہ رفتہ آنکھیں بند کر کے فرحانہ
کی تمام خواہشات پوری کرنا شروع کر دی تھیں۔

ہوٹل، شاٹنگ مال، تفریحی مقامات غرض یہ کہ فرحانہ
جو فرمائش کرتی اُسے پوری کرنا زوہیب کے لیے
فرض ہو جاتا۔

اُس روز فرحانہ زوہیب کی شدید خواہش پر

اُسے پہلے مرتبہ اپنے گھر لے آئی تھی۔

”ارے۔۔۔۔۔“ گھر میں رکھی رہتی ہو تمہارا بھائی
کہاں ہے؟“ زوہیب نے خالی گھر میں اکیلے فرحانہ
کو دیکھتے ہوئے پوچھا تھا۔

”اسی ابو تو ہیں نہیں میرے ایک آنٹی ہیں رشتہ
کی ان کے ساتھ ہی رہتی ہوں۔ بھائی ابھی ان کے
ساتھ نکلا ہوا ہے۔ آپ آرام سے بیٹھیں جب تک
وہ دونوں آ جاویں گے۔ میں ابھی سی جائے جا کر
لاؤں ہوں آپ کے لیے۔“ فرحانہ نے خوشی سے
چٹکی بھاتے ہوئے کہا تھا۔

”نہیں تم یہاں میرے پاس بیٹھو۔“ زوہیب
نے فرحانہ کا ہاتھ پکڑ کر کہنے ہوئے اسے خود سے
قریب کر لیا تھا اور پھر محبت کب ہوں کاروبار اختیار
کر رہی تھی اور کب دونوں اس آگ میں جلتے گئے
تھے دونوں کو پتا ہی نہیں چلا تھا۔ شیطان ان پر مکمل
حادی تھا اور پھر جب دونوں ہوش کی دنیا میں آئے
تھے تو فرحانہ زوہیب کا کار پکڑے پوچھ رہی تھی۔

”تم نے یہ کیا کیا؟“ فرحانہ نے کہنے کے چلے جا رہے
تھے۔ اس کی پچلیاں بندھی ہوئی تھیں۔

”سوری فرحانہ میں سخت شرمندہ ہوں مجھے کچھ
سمجھ نہیں آیا۔۔۔۔۔“ اس سے آگے زوہیب کچھ نہیں
کہہ سکا۔

”زوہیب۔۔۔۔۔ یہ ہے تمہاری محبت؟ تم نے تو
مجھے کہیں منہ دکھانے سے قابل نہیں چھوڑا۔“ وہ
زار و تفتاب رو رہی تھی۔

”فرحانہ۔۔۔۔۔! میری بات سنو ہم جلد ہی نکال
کر لیتے ہیں۔ میں گھر جاتے ہی امی سے بات کرنا
ہوں پھر سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔“ زوہیب
نہایت جذباتی انداز میں بول رہا تھا۔

”ہاں زوہیب۔۔۔۔۔“ پلٹ کر جلدی کر دیا نہ ہو کہ
بہت دیر ہو جائے؟“ فرحانہ نے آنسو پونچھتے ہوئے

کہا۔

اسی وقت دروازے پر دستک ہوئی تھی۔ فرحانہ
نے دروازہ کھولا تو اس کا چھوٹا بھائی ساجد کھڑا تھا۔

”اب میں جا رہا ہوں۔“ زوہیب حقیقتاً کھڑا
گیا تھا اس لیے وہ زیادہ دیر کا نہیں اور دروازے
سے نکل گیا۔

”تھکے ہو کھانا کھو؟“ فرحانہ نے زوہیب کے
جلدی کیوں آ گیا؟“ فرحانہ نے زوہیب کے
جائے ہی مصدوم ساجد کے گال پر ایک ٹھپڑ رسید کیا تو
وہ زور زور سے رونے لگا ہوا کرے سے نکل گیا۔

”شکر ہے میرا پلان کامیاب ہو گیا۔ اگر یہ
اور جلدی آ جاتا تو ساری محنت رائیگاں چلی
جاتی۔۔۔۔۔“

.....

”یار تو فرحانہ کو چانتا ہے نا؟ میں اس سے
شادی کرنا چاہتا ہوں۔ امی انہی ہیں تو بھی چلنا
میرے ساتھ؟“ زوہیب نے یہ خبر نعمان کو سنائی تو وہ
حیرت سے گویا ہوا۔

”کون فرحانہ؟ کس سے شادی کرنے جا رہے
ہو؟“

”ارے یار وہی جو تمہارے ساتھ جھگڑی میں
کام کرتی ہے۔ اس کا آگے پیچھے تو کوئی ہے نہیں
ہوں کہ تم اس کے بھائی ہی جاؤ تا کر امی کو بھی تلی ہو
جائے۔“ ایک ہی سانس میں زوہیب ساری بات
کہہ گیا۔

”یار تو تو پاگل ہو گیا ہے۔ وہ فرحانہ شادی
شده ہے۔“

”اے۔۔۔۔۔“ تیرا دماغ تو ٹھیک ہے نا؟“
زوہیب نے نعمان کو قفسے بھری نظروں سے دیکھا۔

”ہاں یار وہ جو بچہ اس کے ساتھ اُس دن آیا
تھا وہ فرحانہ کا بیٹا ہے بلکہ اُس کی تو ایک بیٹی بھی ہے

جو اس کے شوہر خیر احمد کے ساتھ ڈھاکہ میں رہتی
ہے۔“

”تو صحیح کہہ رہا ہے؟“ زوہیب کا دل چاہ رہا
تھا کہ زمین چٹ جائے اور وہ اُس میں سا
جائے۔

”ہاں میرے دوست۔۔۔۔۔! اکل ٹھیک کہہ
رہا ہوں لیکن یہ نہیں جانتا کہ ان کی ٹھیکہ گی ہوئی ہے
یا پھر۔۔۔۔۔“

نعمان اس سے بھی آگے کچھ بتانا مگر زوہیب
نے اسے روک دیا۔ اسے مصدوم نظر آنے والی فرحانہ
سے اسے بڑے دھوکے کی امید نہیں تھی۔ وہ فرحانہ
سے حقیقتاً جی محبت کرنے لگا تھا۔

”سوری یار مجھے اگر پہلے علم ہوتا کہ فرحانہ نے
مجھ سے تیرا نمبر اس بری نیت سے مانگا ہے تو میں بھی
نہیں دیتا اور تو اتنا آگے نکل گیا۔ مجھے اب بتا رہا
ہے؟“ نعمان زوہیب کو گلے سے لگاتے ہوئے چلے
جا رہا تھا مگر وہ خاموشی سے بند آنکھیں کیے اپنے
آنسو جذب کر رہا تھا۔

.....

”کیوں شادی نہیں کر رہے تم مجھ سے؟“
فرحانہ زور سے جھنجھکی۔

”کیوں کہ تم شادی شدہ ہو؟“ زوہیب نے
ضبط کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا تھا۔

”وہ۔۔۔۔۔ وہ۔۔۔۔۔ شادی ختم ہو چکی
ہے۔“ فرحانہ حقیقتاً شٹنا لگی تھی۔

”تم نے مجھ سے جھوٹ کیوں بولا فرحانہ۔۔۔۔۔؟
میں تم سے کچی محبت کرتا تھا۔“ زوہیب رندگی آواز
شروع کر رہا تھا۔ ”مگر اب تمہارے اوپر میرے راستے
الگ ہیں اب تمہارا مجھ سے کوئی تعلق نہیں۔“

زوہیب نے کچی فیصلہ کیا تھا۔

”اوہ۔۔۔۔۔ اگر تم نے ایسا کیا تو میں سب کو خاص



انسان میں درویشی

محسن بھولی کا خیال
خون رلائیں گے مہرمت قریب آئیں
کہ وہ دہر، دہر سے تماشا کر

ایک قتل کی لرزہ خیز کہانی جو ہے انسان ہستی کی اس سطح پر بھی آسکتا ہے؟

اپنے شوہر اور بڑے بیٹے کے کام پر جانے کے بعد گھر سے نکل گئی اور واپس نہیں آئی..... اور پھر نرسین کی لاش تین روز کے دوران سو بجر بازار قحانے کی حدود میں چار مختلف مقامات سے کٹڑوں کی صورت میں ٹھکی۔

نرسین کے قتل کی اطلاع دس مارچ کو لوگوں کو اس وقت ملی جب سو بجر بازار قحانے کی حدود سے پولیس اہلکاروں کو پوری میں بند متوقل کی لاش کے ٹکڑے ملے..... اس کی تفصیل کچھ یوں ہے کہ کارڈن کے ایک نجی اسپتال کے قریب واقع کچرہ کنڈی سے پوری میں بند قحانوں کی لاش کے اعضائے کی اطلاع پر پولیس نے انہیں اپنی تحویل میں لے کر سول اسپتال پہنچایا تھا۔ متوقل کی لاش کو نامعلوم



ایک ایچ اے او سبجر بازار چارخیشود

ملزمان نے تھوہدار آلے کی مدد سے کاٹ کے ٹکڑے ٹکڑے کیا تھا۔ گیارہ مارچ کو سو بجر بازار قحانے کی حدود میں واقع قحیل پاؤہ کی کچرہ کنڈی سے متوقل کا ہڑ مل جاگیر سو بجر بازار چارکٹ کے

الان ان الحقیفہ!..... دینا انسانوں کا جنگل بنی جا رہی ہے۔ اب یہاں انسان درویش کی شکل اختیار کرتا جا رہا ہے۔ یہ تبدیلی ظاہری نہیں بلکہ فطری طور پر ہو رہی ہے۔ آپ کے سامنے بظاہر ایک انسان موجود ہے جسے اشرف المخلوقات قرار دیا گیا ہے لیکن یہ انسان کب درویش کی شکل اختیار کرے گا کچھ کہا اور سوچا نہیں جا سکتا۔ وہ کب آپ پر بھٹ پڑے گا کب چھری سے آپ کا گلہ اڑا دے گا کب آپ کے ٹکڑے کر دے اور وہ ٹکڑے شہر کے مختلف مقامات پر کتے اور بلیوں کے کھانے کے لیے پھینک دیے جاساں گے شہر کراچی کے ایک علاقے قائد آباد کی رہائشی خاتون نرسین کے ساتھ کیا گیا ہے۔

قائد آباد کی رہائشی نرسین نے اپنے قتل سے ایک روز پہلے 14 سالہ بیٹے کے سامنے نامعلوم شخص سے سوبائش توں پر بات چیت کے دوران کہا تھا۔ ”تم کل مزار قائد پر آ جانا“..... اگلے روز وہ

زویہ بھیر آ آ رہی تھیں اور مجھ سے ناجائز تعلق استوار کر رکھا ہے۔ اس کے بعد زویہ بھیر نے اسے آٹھ ہزار روپے بلانا دینا شروع کر دیے تھے لیکن اب تقریباً ایک ہفتے قبل فرحانہ نے زویہ بھیر کو کون کر کے کہا تھا کہ اُسے بلانا نہیں کی ہو گیا ہے اور علاج کے لیے رہا وہ ہزار کی ضرورت ہوئی۔ زویہ بھیر فرحانہ کا یہ مطالبہ سن کر چراغ ہو گیا تھا اس نے ایک منصوبے کے تحت جس میں اُسمان بھی شامل تھا فرحانہ کو کچھ سوکھ بلیا تھا جہاں ایک گھر میں دونوں نے فرحانہ کو زینا دی کا نشانہ بنا کر اُسے اگلے کے کٹلے میں مارے پھندہ لگایا تو وہ بے ہوش ہو گئی اور پھر دوپٹے کی مدد سے اُس کے گلے میں پھندہ لگایا جس سے ڈھرائی ہلاک ہو گئی اس کے بعد دونوں نے قتل کر فرحانہ کو پوری میں بند کیا اور سر جانی قحانے کی حدود میں پھینک دیا۔

پولیس فرحانہ کے سوبائش توں پر کال نہیں اور ڈسٹ کی مدد سے دونوں ملزمان نوان اور زویہ بھیر کو گرفتار کر چکی ہے۔

تائیں ”نجی کہانیاں“..... انعمان اور زویہ بھیر کی زندگی برباد ہو چکی ہیں جبکہ فرحانہ اپنی زندگی سے اچھڑھو بیٹھی ہے۔ اس سارے قصے میں قصور کس کا قحانہ ہے؟

فرحانہ کے شوہر میر احمد کا..... جو اُسے یہاں اکلا چھوڑ کر ڈھاکہ میں رہنا پسند ہے؟ یہ مہنگائی کا..... جس سے تنگ آ کر فرحانہ ایسے معاملات اور مطالبات پر مجبور ہو گئی اور زویہ بھیر کو پیسے کمانے کا ذریعہ بنایا؟ سوبائش کی سسٹم کا..... جو قاصدوں کو مٹا دینا چاہتی ہے جس میں دیکھ کر مصروف ہے یا پھر حالات کا ہمارے؟ قحانے میں روز بروز ایسے واقعات اور حادثات بڑھتے جا رہے ہیں جو باعث فکر ہے۔

کر تمہارے گھر والوں کو بتا دوں گی کہ تم میرے ساتھ زینا کرتے رہے ہو.....“ فرحانہ نے اپنے انداز کا ہر گالہ تھا۔

”اس کی ذمہ دار تم خود ہو.....“ زویہ بھیر چیخا تھا۔

”تم سچ نہیں ہو زویہ بھیر! اور تم جانتے ہو میں ایسا کر بھی نہیں سکتی ہوں۔“

”تم چاہتی کیا ہو؟“

”میری خاموشی کی قیمت پانچ ہزار روپے ماہ وار مجھے دے دو اور.....“

”کیا؟ پانچ ہزار روپے ہر مہینے؟ تمہارا دماغ تو خراب نہیں ہو گیا؟ تم مجھے بلیک میل کر رہی ہو.....“ زویہ بھیر فرحانہ کی بات کاتے ہوئے غصے سے چیخا تھا۔

”ہاں..... یہی سمجھ لو دیتے ہو تو ٹھیک در نہ میں کل ہی تمہارے گھر پہنچ رہی ہوں.....“ فرحانہ کی دھمکی کا رد ثابت ہوئی اور زویہ بھیر ہر مہینے پانچ ہزار روپے فرحانہ کو دینے پر رضامند ہو گیا۔

غزل

سرقتل اٹھایا جارہا ہے

مرا لاشہ چھپایا جارہا ہے

ہوا سارکت کڑی ہے ڈر کے مارے

دیا پھر سے جلایا جارہا ہے

ابھ کر بچ و دھم میں زندگی کے

تعلق کو چھایا جارہا ہے

تتاے زندگی میں کیا کروں اب؟

مجھے تم سے ڈرایا جارہا ہے

کوئی تو درمیاں ہے تیرا جو

مجھے دل سے بھلایا جارہا ہے

ہاتھ آسمان سے دور بیٹھے

زمین کو آزیایا جارہا ہے

ہمناشاہ

تو وہاں اس نے لاوارث لاشوں کے ریکارڈ میں اپنی بیوی کی تصویر دیکھی تھی۔ ایسی انتظامیہ نے اسے بتایا تھا کہ..... اس خاتون کی لاش نگڑوں کی صورت میں ملی ہے۔ بعد ازاں شناخت کے بعد سرسرن کی لاش محمد شریف کے حوالے کر دی گئی تھی جس کی تدفین علاقے کے قریبی قبرستان میں کی گئی۔

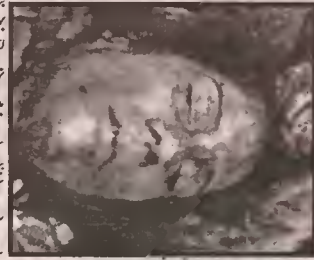
اس کیس کے تفتیشی افسر سرزاد کے مطابق اس واردات کا مقدمہ نمبر 1276/34 زبردستہ 302/34 کے تحت درج ہوا تھا اور مقتول کے شوہر محمد شریف کو حراست میں لے کر چند روز تک تفتیش کی گئی تھی لیکن یہ ثابت ہونے پر کہ وہ بے گناہ ہے پولیس نے رہا کر دیا تھا۔ مقتول کے سوبائل فون کا ڈیٹا بھی نکلوا دیا گیا جس کے مطابق اسے آخری تین کالیں بیکسلا سے کی گئی تھیں جو تین مختلف لوگوں نے کی تھیں۔ ان افراد کو کراچی بلایا گیا ہے جن سے تفتیش کے بعد کیس میں مزید پیشرفت ہوئی ہے۔ پولیس افسران اور لیڈی ایم ایل او نے پوسٹ مارٹم کے بعد بتایا تھا کہ..... مقتول سے ایک سے زائد افراد نے زبردستی کی تھی اور پھر گھر دبا کر قتل کرنے کے بعد لاش کے ٹکڑے کیے گئے تھے۔

پولیس کی اس کیس کے سلسلے میں تفتیش جاری ہے اور امید تو یہی ہے کہ اس کیس کا مجرم با مجرمان بہت جلد پکڑے جائیں گے لیکن سوال یہ ہے کہ ان کو سزا دی ہوگی؟ ہمارا قانون تو انسان کو انسان کے قتل کرنے کی سزا دیتا ہے لیکن انسان درعدہ بین کر کسی انسان کو قتل کرنے زندگی سے محروم کرے تو اس کی سزا کیا یہی عام انسانی سزا ہوگی؟؟؟

☆☆☆

کی کیا یاں بچوں کے حوالے کی تھیں اور انہیں کہا تھا۔ ”میں ایئر پورٹ جا رہی ہوں شام تک واپس آ جاؤں گی۔ تم لوگ تالہ کھول کر گھر پہلے جانا۔ میں نے کھانا پکا کر کچن میں رکھ دیا ہے۔“ مقتول کے شوہر محمد شریف نے دورانِ تفتیش بتایا تھا۔ ”ایئر پورٹ کے علاقے میں سرسرن کی ایک منہ بولی بہن رہتی ہے وہ اکثر اس سے ملنے کے لیے وہاں جاتی رہتی تھی۔ میں نے کئی بار اپنی بیوی کو وہاں جانے سے منع کیا تھا لیکن اس نے میری بات نہیں مانی تھی۔ سو چند دن مارچ کو میں گھر پہنچا تو بچوں نے

بتایا کہ اس کی بج سے اپنی بہن سے ملنے گئی ہیں لیکن ابھی تک واپس نہیں آئیں۔ یہ سن کر میں نے اپنے بڑے بیٹے کے ساتھ مل کر اپنی بیوی کو ڈھونڈنا شروع کر دیا۔ اس دوران سوبائل فون پر اپنی بیوی سے رابطہ کی گئی تو کوشش کرتا رہا لیکن اس کا



مقتول سرسرن

سوبائل فون مسلسل بند جا رہا تھا۔“ محمد شریف اور اس کے بیٹے کو مقتول کی منہ بولی بہن کے گھر کا پتہ معلوم نہیں تھا..... آخر کار محمد شریف نے قائد آباد قلعے میں جا کر اپنی بیوی کی گمشدگی کی رپورٹ درج کرائی تھی اور اپنے تمام رشتے داروں کو بھی اپنی بیوی کی گمشدگی کی اطلاع دی تھی۔ بعد ازاں اس نے شہر کے تمام سرکاری و دینی اسپتالوں میں اپنی بیوی کی تلاش شروع کر دی کہ کہیں وہ راستے میں کسی حادثے کا شکار نہ ہو گئی ہو اور پھر جب محمد شریف اپنی بیوی کی تلاش میں ایڈمی سرحدانے گیا تھا

قریب سے مقتول کا سرا مل جو ایک چھلی میں بند کیا گیا تھا۔ پولیس نے جانے تو بڑے چھچھ کر مقتول کا سرا اپنی تحویل میں لے کر سول اسپتال پہنچایا تھا۔ بارہ مارچ کو مقتول کے ہاتھ اور پاؤں گاڑوں کے قریب واقع کچرہ کڈی سے ملے تھے۔ انہیں بھی چھلی میں بند کیا گیا تھا اس لاش کو نگڑوں کی صورت میں ایڈمی سرحدانے منتقل کیا گیا تھا اور پھر ایڈمی سرحدانے میں سول مارچ کو مقتول کی شناخت 39 سالہ سرسرن زوجہ محمد شریف کے نام سے ہوئی تھی۔

مقتول سرسرن باج بچوں کی ماں اور قائد آباد کی رہائشی تھی۔ مذکورہ کیس کے حوالے سے SHO سولجر بازار انسپکٹر خوشنود نے بتایا کہ مقتول سرسرن نے عمر شریف نامی شخص شادی کی تھی۔ اس کی پہلی شادی فیصل آباد میں پولیس نامی شخص سے ہوئی تھی اور پھر میں برس قبل پہلے شوہر سے علیحدگی کے بعد مقتول سرسرن فیصل آباد سے کراچی آ گئی اور قائد آباد میں کرائے پر گھر لے کر رہائش اختیار کر لی۔ یہاں سرسرن کی ملاقات محمد شریف سے ہوئی جو اسے پسند آیا تھا اور وہ بھی اسے پسند کرنے لگا تھا۔ بعد ازاں دونوں نے شادی کر لی تھی۔ محمد شریف شاطیغ میں واقع ایک کیران میں کام کرتا تھا۔ ان کے بچوں میں چار بیٹے اور ایک بیٹی شامل ہے۔ دن مارچ کو گھر سے نکلنے کے بعد مقتول سرسرن اپنے بچوں کے اسکول گئی تھی۔ اس نے گھر

سنگ کہانی جیسے جگاتے دوڑتے بھاگتے سچے مناظر کی آنکھوں نگہیں روزانہ

رخسانہ سہام مرزا



ایک سطر مقدس کا روح پرور آنکھوں دیکھا احوال، رخسانہ سہام کے قلم سے

ارتقا دارنی کا خیال
نہ زانو راہ کی حاجت، نہ شمع منزل کی
ہے ذاست سرور کوئین راہبری کے لیے

ایک سطر مقدس کا روح پرور آنکھوں دیکھا احوال، رخسانہ سہام کے قلم سے

اب ہمیں بھائی مسعود کے ساتھ جدہ روانہ ہونا تھا اور وہاں تقریباً بیس سال بعد اپنی بیاری خالہ بی بی سے ملنا تھا۔ ہمارا بچپن اور ان کا لڑکپن ساتھ گزارا تھا۔ ہماری طرح وہ بھی مسکاتی دیدھیں مسودن میں پانچ مرتبہ فون پر پوچھ چکی تھیں۔
”رخسانہ! تم کب آ رہی ہو؟“
ان کی بے نیالی ان کی محبت کا پتہ دے رہی تھی کہ وہ رہا انتظار میں۔
مکہ معظمہ کے جدہ کا راستہ ایک گھنٹہ کا تھا۔ ہم مغرب کی نماز کے بعد روانہ ہوئے تھے۔ بہترین سڑکیں صاف سترا ماحول، ایک گھنٹہ کب گزر گیا؟ پتہ ہی نہیں چلا۔ راستے میں پھر خالہ کا دو ہاتھوں آیا تھا۔ ان پر یہ گھنٹہ بہت بھاری گزر رہا تھا اور پھر جب ہم لوگ وہاں پہنچے تو وہ دھڑا انتظار نظر آئی تھیں۔ انہوں نے سب بچوں کو بھی بلا لیا تھا۔ خالہ بی بی تو مجھ سے والہانہ اعزاز میں لپٹ گئی تھیں۔ بار بار میرا چہرہ دیکھیں اور پیار کرتیں۔ شاید ان کو اب بھی میرے اندر وہ چھوٹی شریف بدختر رخسانہ نظر آتی ہو۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ انہوں نے کسی ایسا نہیں کہا تھا کہ رخسانہ چھوٹ بولتی ہے بس وہ اپنی منانی پیش کرتی رہتیں اور پھر جب اس کے باوجود ان کو سزا مل جاتی تھی مگر سے باہر نکلنے پر پابندی لگ جاتی تو وہ مجھ سے ناراض ہونے کی بجائے کہتیں۔
”چلو آؤ کہانیاں سناتی ہوں۔“
”اے بھانڈو۔“
جوا خالہ بی بی ہمیشہ یہی کہتیں۔ ”اے کچھ مجھ نہیں آتا رہنے دو۔“



مزدہ سہام، مسجد نبویہ کے دروازے کے سامنے

اور پھر وہ مجھے شہزادی شہزادے جن دیوار کیوں کی کہانیاں سنا کر کہیں۔
”دیکھو! سب کچھ نہیں بس کہانی ہے۔“
”تمہیں غصے میں ان کے کانٹے پر کھڑک لیتی۔“
”نہیں..... نہیں.....“
وہ فوراً ہار مان کر کہیں۔ ”اچھا! میرا کدھا تو چھوڑ دو۔“
میں کوئی خالہ بی بی کی اصل دشمن تھوڑی تھی اور



زین ماہر اور سعید مصطفیٰ کے ساتھ

Mail لے گیا تھا کہ تمہیں جو چیز بھی پسند آئے صرف اپنے لیے ہی نہیں دانیال کے لیے بھی خرید لیا۔ وہ لوگ مال کے تو منزہ اور خالد کی بیگم عاشرہ کے ساتھ چلی گئی تھیں بس میں اور خالد بی بی وہیں کافی شاپ میں بیٹھے رہ گئے تھے اور پھر بس وہ لوگ ہی تھیں، میں سٹی رہی تھی۔ درمیان میں ایک خط بھی نہیں بولی تھی۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ صرف مجھ سے بولنا چاہتی ہیں۔

پوچھا تھا۔
”بلڈ پریشر بڑھ گیا ہے کیونکہ تم جو چاہتی ہو۔“
خالد بی بی کے چہرے پر ایک ہنسکی سی مسکراہٹ اور آنکھوں میں نمی تھی۔
”خالد بی بی.....! میں تو جانے کے لیے آئی تھی۔“
”ہاں! مجھے معلوم ہے۔“
”تو پھر دکھ کیوں؟“

”دکھ تو ہوگا بس۔“ خالد بی بی نے ہنسکی مسکراہٹ اور ہنسکے لیے جس کچھ ایسے کہا تھا کہ میں نے بے اختیار ان کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا تھا اور میرے آنسو بہہ نکلے تھے۔ خالد بی بی نے میرے سر پر ہاتھ پھر کر کہا تھا۔
”بھگوان! کاشا ماہد!“
میں منزہ اور زین گاڑی میں بیٹھ گئے تھے اور

پوچھتی تھی۔

”طلیب تھو؟“

خالد بی بی کے سب سے بچے ہماری ملاقات کے باعث ملے والی اپنی ماں کی خوشی سے خوش تھے۔ میری خالد زین کو بہنوں نے بتایا تھا۔ ”جب سے آپ نے پاکستان سے یہاں آنے کا فن کیا تھا؟ یہ ہم



میری بھاری خالد اور میں

میری اور خالد بی بی کی محبت!!
ملے ملانے کا سلسلہ ختم ہوا تو خالد بی بی کی میڈ (maid) نے تھوہ اور بہت سارے خشک میوے حلوے میز پر سجادیئے تھے۔ ہم ٹھہرے جانے پینے والے تھوہ دودھ کی جانے لگی تو اس نے پوچھا۔
”طلیب تھو؟“
یوں ہمیں طیب تھوہ کی صورت اپنی پسند کی جانے لگی تھی۔ اس کے بعد تو وہ ہم سے ہر گھنٹے بعد

سے کہہ رہی تھیں! دیکھو! زین آ رہی ہے۔ 1209
تاریخ کو دینے میں ہوگی پھر کہہ آئے گی اور مسعود کے گھر ٹھہرے گی پھر میرے پاس جدہ آئے گی۔..... اور پھر باہمی اور حال سے جڑی باتیں کرتے بہت سادہ وقت ہمارے درمیان سے سرک گیا تھا۔
دوسرے دن خالد بی بی کا چھوٹا بیٹا خالد ہمیں سندھ پر لے گیا تھا۔ وہاں ہم نے بڑا لذیذ کھانا کھایا تھا پھر وہ زین کو یہ پیرا برا حکم دیتے ہوئے



جدہ کا ساحل..... کچھ وقت بعد وترق کے لیے

ہاب ریگٹ بنا تھا کہ اکثر مسافر کھڑے ہو گئے دیکھئے گا۔
تھے۔ کہستان مشکل کہہ رہا تھا۔

”جب تک جہاز رک نہیں جاتا سیٹ سے نہ

اٹیں۔“

مگر جناب..... وہ اللہ کی نہیں سننے تو پاکستان

صاحب کی کیا سنیں گے۔ جہاز میں ایئر کنڈیشن

نہ ہو سکتی تھی۔ پاکستان کی ٹوٹی پھوٹی انگریزی

لارے آکسفورڈ کے تعلیم یافتہ نہیں سمجھ پائے۔

ناؤں نے کہا۔ ”بیٹھ جاؤ بیٹھ جاؤ۔“

”ارے بی بی..... ان کو ان کے حال پر چھوڑ

دیتے۔“ میں نے دل ہی دل میں مشورہ دیا تھا اور یہ

کر کرنے لگی تھی کہ..... ہمارا چیلنج کوئی دوسرا نہ

لے جائے مگر اس سب کے باوجود ہماری ایک زم زم

کی بوتل غائب تھی۔ اپنے وطن واپسی پر کوئی پاکستانی

فلوٹینا تھا سوال کیا۔ اس بوتل پر زین کا نام اور پتہ

لکھا تھا۔ ہم نے بوتل لے جانے والے کو معاف کیا

مگر ہمارا زم زم پتہ دیتے بوتل پر لکھے نام کو ضرور عا

لڑنے والیاں انگریزی زبان میں ایک دوسرے
تاہو توڑ جملے کر رہی تھیں۔ انگریزی بولنا ہمارا
فریضہ ہے دنیا کے تری یافتہ مالک اپنی زبان پر
ہیں اور اس وقت وہ تری کے لحاظ سے کہاں ہیں
اور ہم..... پس جانے دیجئے۔

ایک خاتون کو بورڈنگ لاؤنج میں یاد آیا کہ
اپنا پرس ہاتھ روم میں بھول آئی ہیں وہ دوبارہ بار
روم جانے کے لیے نئے ریمیں کی طرف بھاگیں
کے مشورہ پر نہ چھا۔

”کہاں جارہی ہو؟“

”میں اپنا پرس بھول آئی ہوں۔“ بیوی کا ڈر

ن کر شہر صاحب نے ڈانٹا شروع کر دیا تھا۔

”دست جاؤ چھوڑ دو دم کو پکڑ لیں گے ہاتھ نہ

بھڑکیاں ڈال کر تھیل بیچ دیں گے۔“

خیمہ نہ تھیں اور پرس لینے چلی گئیں۔ شوہر

فوراً ہی اپنے پاس کڑی والدہ سے کہا تھا۔

”یہ کتنی گورت سے میری شادی کر دے گی تم کو

ہی ملے گی؟“

چند منوں بعد وہ خاتون اپنا پرس لے کر آ

تھیں مجھ سمیت سارے لاؤنج کے مسافر ان

ہاتھ میں جھکڑاں تلاش کرنے لگے تھے لیکن

تو ان کے شوہر کی خواہش ہی مگر کوئی تماشہ نہ ہوا

بہر حال یہاں مجھے میرے مزدور بھائی یاد آیا کہ

تھے۔ کیا لیتے کیا فریضہ تھا نہ جہاز میں سوار ہوئے

جلدی نہ اترے میں بے مبری..... حق جلال کا

اور کھانے والے ایسے ہی ضابطہ ہوئے ہیں۔ میں

اپنے ان بھائیوں کو سلام کرتی ہوں۔ کوئی تو ہے

اپنے ملک کی عزت کروا رہا ہے اور کرتا ہے۔ یہ

ساری نیک تمنا ہیں ان کے ساتھ ہیں یہاں

خوش رہیں۔

ہمارے جہاز نے کراچی لینڈ کیا جہاز فرسٹ

پھر جب گاڑی چلائی تو ہم نے مرکز نہیں دیکھا تھا۔
جدہ ایئر پورٹ پر کافی رش تھا۔ لوگ عہر کر کے
آ رہے تھے لیکن وہاں ایک طوفان بدستری تھا وہاں
کوئی کسی کو برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں تھا نہ
بچوں کا خیال نہ عورتوں کا لحاظ یہ سب لوگ عہر کر کے
جا رہے تھے لیکن ادب تہذیب اور لحاظ کے دامن
سے غاری لوگوں نے کوئی سبق نہیں لیا تھا۔ سیکس نہیں
تھا جہاز پر سوار ہونے کے معاملے میں جلد بازی
بدستری کا یہ عالم تھا کہ ادا ان محفوظ لان نہ سمجھ لوگوں
کو کون سمجھاتا کہ جہاز نہیں کسی بس کی طرح چھوڑ کر
نہیں جانے کا۔ خالی روانہ ہو کر اپنا پیڑول نہیں
جلائے گا مگر وہاں تو نہ زبان پر لگام تھی نا ہی ہاتھ
میدوں پر اٹھتیاں..... ایک وقت تو مجھے ایسا لگا تھا کہ
اب مار پیٹ شروع ہو جائے گی سو مجھ سے نہ رہا گیا
تھا۔ میں نے کہا تھا۔

”اللہ کے واسطے خاموش ہو جائے یہاں
ایک دوسرے کی چوکیاں مت اچھالنے میں چار
کھٹے کے بعد آپ پاکستان پہنچ جائیں گے وہاں تو
آپ اور پدر آزاد ہیں ساری میز اس نکال لیجیے
گا۔“

مگر میری صداقت وہاں تھار خانے میں طوطی کی
آواز تھی، ٹھوڑی دیر میں کاؤنٹر مل گئے تھے اور لوگ
ایکٹر میں سے فارغ ہونے کے اور بورڈنگ کارڈ
لی لے گئے۔ حیرت کی بات یہی کہ بورڈنگ کارڈ
ملنے کے بعد بھی لوگ دھکم پیل میں لگے ہوئے تھے
جبکہ بورڈنگ کارڈ ملنے کے بعد تو جہاز نے ان کو لے
کر ہی جاتا تھا۔

ایک کاؤنٹر پر ہماری دو خواتین ہانگوں کی طرح
لڑ رہی تھیں اور سوسری ایئر لائنز اس کاؤنٹر بند کر کے
تماشہ دیکر ہاتھ عربوں کی خاصیت سے کردہ بہت
کم بولتے ہیں، پس خاموشی سے تماشہ دیکھتے ہیں۔

میری کہانی میری زبانی سچی کہانیاں کے لکھاری اور قارئین کی کہانی لفظوں کی زبانی

انور فرہاد

روشنی کے گھر میں

حادثہ سید کا خیال
زبان رکھتے ہیں جگر بھی چٹائیں بولتی ہیں
جو چہرہ پر لکھی ہیں داستانیں بولتی ہیں

ہمارے ستر ترین لکھاری کی بھرپور زندگی کی کہانی کا آخری حصہ

فرہاد! میں تو نگار چھوڑ کر جا رہا ہوں میں نے
بھائی الیاس سے بات کر لی ہے تم میری جگہ کام
شروع کر دو۔
”مگر آپ کیوں نگار چھوڑ رہے ہیں؟“ میں
نے گرجند ہو کر پوچھا۔ ”کیا کوئی پریشانی ہو گئی ہے
یہاں؟“
”میں ایسی کوئی بات نہیں بات دراصل یہ ہے
کہ فیض احمد فیض اور سید سبط حسن ایک سیاسی منت
روزہ ”کیل و نہار“ نکال رہے ہیں۔ مجھے اس پرچے
کی آفر آئی ہے۔ میری اہلیہ فلیڈ وہی ہے یہاں تو
میں بس وقت گزار رہا تھا۔“

اس طرح حسین اعظمی اپنی کرسی پر مجھے بٹھا کر
خود ”کیل و نہار“ چلے گئے۔ میں نے نامہ نگاری
حیثیت سے ”نگار“ سے جو رشہ جوڑا تھا کوئی ایک
عشرے کے بعد وہ میرے سب ایڈیٹر بن جانے
کے بعد جڑ پک ہو گیا تھا۔ یہاں اس حیثیت میں
میں نے کم و بیش چار سال تک ملازمت کی پھر ایک

اب یہاں واپسی کے بعد یادوں کی کتاب
اور وہ چہرے جو میرے اپنے تھے۔ خال بی بی
پاس پہنچنے کے بعد پہلے دن سے ستر کے آ
مرطے تک میرے چھوٹے بھائی حسین ہمار
ساتھ رہے اور پھر منہ تمام وقت اُن کے ساتھ
رہی۔ ہر لمحے ماموں کی نگاہیں۔

”ماموں! آگس کریم کہانی
ماموں! مجھے تھو چاہے۔ ماموں! یہ
کیسے ہوگا؟ ماموں! ماموں! اور ماموں!
واقعی محبت پر کسی کی اجارہ داری نہیں
محبت کرنے وہی اپنا ہو جائے۔ یہ منظر دیکھ
میرا دل چاہتا تھا کہ میرے ماموں بھی سا
آجائیں۔ وہ بھی مجھ سے اتنی ہی محبت کر
تھے۔ میری ہر ہر بات پوری کرتے تھے۔ سہام
کہتے تھے کہ ”رخسانہ کے پاس ہر مرض کا علاج
ماموں ہیں۔“

کل میں اپنے ماموں کے ساتھ جہاں تھی
آج منہ چار چھین ماموں کے ساتھ وہی تھی اور
حسین تو اس سفر کے آغاز میں اس سفر کی ابتدا
کاروائی سے لے کر ہمارے سعودی عرب
خروج تک کسی ٹیلی فون مشوروں تو کبھی بذات
ہمارے ساتھ ساتھ تھے اور لگ رہا ہے کہ جیسے
بھی ساتھ ہی ہیں۔

حسین کی طرح مسعود نے بھی کوئی کی
چھوڑی۔ مدینہ میں ہوئی کی بنگ سے لے کر
تک ہمارے جدہ جانے تک ہر قدم پر ساتھ
رہے۔ مسعود بھی ایک رشتے سے میرے ماموں
بھی ہیں اور بھائی بھی۔ ماموں! ماں!
منہ۔ واقعی بہت پیارا رشتہ ہوتا ہے بس یہی
تھا یہی حقیقت تھی۔

نعت

طیبہ کی ہواؤں کی تاثیر زبانی ہے
محبوب کی گلیوں کی تصویر زبانی ہے
شہان زمانہ بھی دیکھے ہیں گدا اُن کے
طیبہ کے گداؤں کی تقدیر زبانی ہے
جنت بھی خدا اُن پر قربان ہے کعبہ بھی
محمد ﷺ کے رونے کی توفیر زبانی ہے
قرآن کی صورت میں الفاظ گئے ڈھلتے
سلطان مدینہ کی تقریر زبانی ہے
قیدی ہیں ملائکہ بھی نرسل بھی امیران اُن کے
محبوب کی زلفوں کی زنجیر زبانی ہے
مکرم مصور کا عکاس ہے ہر پہلو
بے مثل مصور کی تصویر زبانی ہے
رونے پہ نگاہیں ہیں اور گلیاں مدینہ کی
فرحانہ ترے خوابوں کی تعبیر زبانی ہے

✽

مولانا شہید الاسلام المصری

وقت آیا کہ اس ادارہ سے علیحدہ ہو گیا لیکن کسی ناممکنی یا تنازعے سے سبب نگار کی ملازمت نہیں چھوڑی تھی، بس زیادہ آمدنی کے لالچ میں یہ نوکری چھوڑی تھی۔ ہوا یہ تھا کہ اس ملازمت کے دوران ”قلم اور فیشن“ نام کے ایک مفت روزہ میگزین میں مجھے پارت ٹائم نوکری مل گئی تھی۔ میں نگار سے شام پانچ بجے چھٹی کر کے پریس جیپور جا جاتا تھا۔ ”قلم اور فیشن“ کا دفتر تھا۔ یہ جریدہ صرف قلم جرنلس اقبال احمد خان کا تھا جو شادی کے بعد مستقل طور پر لندن سدا رہ گئے تھے تو جاتے وقت اپنا یہ میگزین فروخت کرتے خریدنے والے نما اور خان اور طاہر رشوی (غالبان کے بھئی نام تھے۔) تھے جو بنیادی طور پر کاروباری لوگ تھے اور ان کی طرح کے کام کیا کرتے تھے۔ ان کا ایک پر فٹنگ پریس بھی قائم آباد میں تھا۔ انہوں نے پرچے کی خریداری کے بعد اپنے طور پر ایک اشاف تو رکھ لیا تھا مگر انہیں ایک تجربہ کار فیشن کی ضرورت تھی۔ یہاں چند مینیجے تھے بہت جونی جی طور پر کام کیا تو مالکان نے بہت متاثر ہوئے اور اسرار کر نے لگے کہ آپ ہمارے پاس نقل نام ملازمت کر لیں! نگار کو چھوڑ کر ہمارے پاس آ جائیں۔ نگار والے آپ کو کیا دیتے ہیں؟

”ہم آپ کو چھوڑ دوں گے۔“

واقعہ رہے کہ وہ شام کے دو بجے تھے مجھے دو سو روپے تنخواہ دیتے تھے جو اس وقت کے لحاظ سے خاصی معقول رقم تھی۔ میں نے بھائی الیاس رشیدی کے سامنے ساری صورت حال بیان کر دی تھی۔

”اکرم تم اپنے بہتر مستقبل کے لیے جانا چاہتے ہو تو میں تمہیں روکوں گا میں دیکھ رہا ہوں کہ تم نے یہ کئی کئی شکایتیں دی اور ذہنی شاید مجھ سے نہیں کوئی

شکایت ہوگی۔“ انہوں نے میری بات سن کر کہا تھا۔ اس طرح میں بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ نگار چھوڑ کر قلم اور فیشن چلا گیا تھا۔

میری بیگم میرے اس فیصلے پر خوش نہیں تھیں۔ ”میرا خیال ہے آپ نے اپنا فیصلہ نہیں کیا۔ یہ دنیا ادارہ ہے نئے لوگ ہیں۔ نگار کی منظم ادارہ ہے۔ یہ نئے لوگ وہاں تنخواہ یہاں سے کم بھی مگر ملازمت کی سیکورٹی تو تھی۔“

اس وقت تو مجھے اپنی المیہ کی باتوں کی اہمیت سمجھ میں نہیں آئی تھی مگر ایک سال کے بعد یہی جب ”قلم اور فیشن“ کو چھوڑنا پڑا تھا تو مجھے یہی بات شرت سے یاد آئی تھی۔ ”قلم اور فیشن“ میں میں مکمل طور پر ایڈیٹر تھا میرے ساتھ جو اشاف تھا اس کا مجھے مکمل تعاون حاصل تھا۔ پرچہ بڑے اچھے اعزاز میں پابندی وقت کے ساتھ نقل کر رہا تھا۔ مالکان مجھ سے بہت خوش تھے، میری جو اشاف کے بعد دفتر پریس جیپور سے شفٹ ہو کر قائم آباد نمبر ایک آ گیا تھا جہاں ان کا ایک فٹنگ پریس بھی تھا۔ ان کے پریس کا کام بھی بہت ٹھیک تھا کہ طریقے پر چلتا تھا۔ ایک صاحب جو پریس کے منیجر تھے انہیں بھی کچھ کہنے لکھانے کا شوق تھا۔ ان کا ایک کام بھی ”قلم اور فیشن“ میں چھپتا تھا۔ وہ مالکان کی گڈک میں شامل تھے۔ پریس جیپور میں چلتا تھا یہی کمرشل پوزیشن اس کی بہت اچھی تھی مگر جب دو تین مہینوں کے بعد پریس سے متعلق حساب کتاب ہوتا تو معلوم ہوتا کہ منافع کی بجائے گھانا ہو رہا ہے۔ بات دراصل یہی کہ منیجر اور پریس کا کچھ آپریٹر دونوں مل کر مالکان کی آنکھوں میں حوصلہ جھونکتے تھے۔ رات کی شفٹ میں جب ان کو کوئی ٹھیک نہیں ہوتا تھا دونوں شراب اور جناب کے شوق میں ہی بی بی بیہ دردی سے ادارہ کا پیڑ خرچ کرتے تھے۔

جب مالکان کو درون خانہ کی گڑبگڑ کا احساس ہوا تھا تو شاطر منیجر نے انہیں ”قلم اور فیشن“ کے مسئلے پر الجھا اور پریس کرنا شروع کر دیا تھا۔ مالانہ منیجنگ کے دوران منیجر صاحب بھی شریک ہوتے اور پرچے کے بارے میں مختلف ممانات سے اعتراض کرتے جن میں خاص پرچہ کی طرف بھی اشارہ کیا جاتا اور کہا جاتا کہ کثرت اتنی بھی کئی کہ پلینٹ پر اس کا نقص انمبر کر سائے آیا ایڈیٹر صاحب نے اس طرف توجہ نہیں دی جس کی وجہ سے پرچے کی ساکھ پر ناخوشگوار اثر پڑ رہا ہے۔ اپنی مفاد منشی عادت سے مجبور ہو کر یہ بات آکے نہیں ہو سکتا کہ ”ٹھیک ہے آئیہ میں اس باتوں پر مزید توجہ دوں گا اور کوشش کروں گا کہ اس کی غلطی دوبارہ نہ ہو۔“

میری اس مفاد منشی ڈیوٹی سے میرا اشاف خوش نہیں تھا۔ ایک دن ان سب نے میرا ٹھیکر ڈاکا اور کہا: ”انور صاحب!..... آپ کیوں اپنے ناکردہ کاموں کا عذاب اپنے سر لے لیتے ہیں؟ آپ کب کب بات کیوں نہیں کرتے؟“

”کیا بات کروں مکمل کر؟ اس طرح معاملات جگڑھیں جائیں گے؟“

”معاملات بگڑتے ہیں تو بگڑنے دیں مالکان سے کہیں ہم پر غلط الزامات لگانا بند کریں۔ صورت دیکھ ہمارا منشی قبول کریں۔ آپ کے ساتھ ہم تمام لوگ بھی استعفیٰ دے دیں گے۔“

ایک وکیل صاحب تھے جو مالکان کے قانونی مشیر کی حیثیت سے کام کرتے تھے انہوں نے بھی کہا۔ ”ہاں انور صاحب!..... اپریس والے اپنا بل آپ پر اور آپ کے اشاف پر ڈال رہے ہیں اس موقع پر خاموش رہ کر آپ صرف اپنے آپ پر اور اپنے اشاف پر قلم کریں گے بلکہ اصل مجرم کو پر مکمل کھینچ کر مار دیں گے۔“

اس کے بعد ہم نے ایسا ہی کیا ”اجتماعی طور پر اسے استعفیٰ مالکان کو کھادینے جس کے بعد نہ صرف ”قلم اور فیشن“ بند ہو گیا بلکہ کچھ دنوں کے بعد وہ پریس بھی اپنا وجود فنا کر نہ سکے گا۔

”پورے کے لالچ میں آدھے سے بھی گئے؟“ بیوی نے اپنی بات یاد دلاتے ہوئے کہا۔

”جو ہونا ہوتا ہے وہ ہونا ہو کر رہتا ہے۔“ یہ کہہ کر میں نے انہیں جھاننے کی کوشش کی۔ اب میری در بدری اور پریشانی کا دور شروع ہو گیا تھا۔ کچھ عرصے کے بعد سینئر منشی نے عہدے سے روزنامہ ”مصلحت“ کا لٹا دوہاں ملازمت مل گئی۔ اس کے ایڈیٹر مل سکشن میں میرا آخر ہوا تھا مگر علوی صاحب ہر طرح کا مجھ سے لے لیتے تھے۔ انہیں لکھوانے کے ساتھ ساتھ ریپورٹری کرنا دیتے تھے۔ اگرچہ وہ بڑے سینئر منشی تھے لیکن مگر بارودتوں جیسا برتاؤ کرتے تھے۔ ان سے باری دوستی کا سلسلہ کب اور کیسے شروع ہوا یہ بھی قابل ذکر بات ہے۔

جن دنوں میں ”نگار“ میں ایڈیٹر کیا کرتا تھا ایک لڑکا اپنے اس مفاد منشی کے کمرے سے پاس آتا تھا۔ اس کا پورا نام تو پابندیں رہا لیکن اس کے نام کا ایک حصہ ”مردود“ یاد رہا گیا ہے۔ ایک بار اس کے ساتھ جن بھجوتوں کا تذکرہ ہو رہا تھا تو میں نے کہا۔ ”مجھے بھی کراچی کے چند بھجوتوں کا قصہ معلوم ہے۔“

یہ سنتا تھا کہ وہ ایک دم میرے پیچھے پڑ گیا۔ ”انور صاحب!..... بھئی خدمت میں یہ مجھے کچھ لکھ کر دے دیجیے۔“

”ارے یار!..... اچھی یہ قصے کیا کرو گے؟“

”میں تمہیں بتاؤں انہیں اپنے گلے میں نہیں ڈالوں گا۔ میرے ایک کرم فرما پیئر علوی وہ

”مشل“ ڈائجسٹ کے نام سے ایک بروجنگلے ہیں۔ میں اس پرچے میں ان کی معاونت کرتا ہوں آپ کی کہانی ہی ام ”مشل“ ڈائجسٹ میں چھاپیں گے۔

”اگر یہ بات ہے تو میں کھ دوں گا“ دو چار دن بعد آ کر لے جانا۔ اور پھر میں نے دو چھٹی چھٹی کہانیاں لکھ دیں جو میں نے نگار علی کے ایک قلم کار کی زبانی سنیں۔

عروج نے بتایا۔ ”نیروی صاحب کو آپ کی کہانیاں بہت پسند آتی ہیں اور ان کا کہنا ہے کہ اب ہر شمارہ کے لیے ان سے ایسی ہی کہانیاں لکھواؤ۔“

”ارے ہار۔۔۔۔۔ اتم نے تو مجھے اچھی مصیبت میں ڈال دیا مجھے کہانیاں وغیرہ لکھنے کی فرمت کہاں ہے؟“

مگر وہ بعد کہ کہانیاں تو آپ کو لکھنی ہوں گی۔ اب جان چھڑانے کے لیے میں نے کہا۔ ”بھئی یہ کام میں غصے میں نہیں کروں گا۔“

اگلی ملاقات میں عروج نے کہا۔ ”علوی صاحب آپ کو معاوضہ دینے پر تیار ہو گئے ہیں۔ آپ کو ایک کہانی کے 35 روپے پیش گئے۔“

یہ 73-1972ء کا دور تھا اس زمانے میں یہ 35 روپے بھی بڑے قیمت تھے۔ میں رضامند ہو گیا اور ”کراچی کے نبوت“ کے مستقل عنوان کے تحت ہر مہینے میری کہانیاں شائع ہونے لگیں۔ کچھ دنوں کے بعد وہ ایک نئے عنوان ”سہاگ رات“ کے تحت بھی کہانیاں لکھوانے لگے۔ اس طرح ہر مہینے 35 روپے کہانیاں کے معاوضے ملتے گئے۔ اپنا سلسلہ مستقل ہونے کے بعد میں خود ”مشل“ کے دفتر جانے آئے لگا اور نیروی صاحب سے بڑی ادبی انٹرا سٹینڈنگ ہو گئی۔ اس پرچے کے مالک

انتخاب باتری تھے اور نیو چالی کے علاقے میں واقع ان کے گھر پر اخبار کے دفتر سے ہی ”مشل“ شائع ہوتا تھا۔ کئی سال ڈیڑھ سال کے بعد بوجہ یہ بروج بند ہو گیا کہیں نئے علوی سے میری دوستی برقرار رہی۔ ”مشل“ کے بند ہونے کے بہت بعد انہوں نے ”صدقات“ نکالا تو اسی پرانے حوالے سے مجھے اس ادارے میں رکھا۔ یہ اخبار کی زیادہ دنوں تک چلنے سکا۔ ایک بار پھر دربدی کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ کچھ عرصے کے بعد روزنامہ ”انجام“ کا بڑے دھوم دھڑکے کے ساتھ اجرا ہوا۔ اس کے قلم نویسین کے انچارج کے طور پر میرا فخر رہا مگر ابتدائی دنوں میں ہی یہ غریبوں کیلئے گرہ بن گیا۔ ادنیٰ درآمدی اسعار و ڈیڈی حالتی بھی نہ کیلئے بدنامی میں بدل گئی اور ایک بار پھر میں بے کاری کے شب و روز گزارنے لگا۔

ایک دن ہمارے ایک دیرینہ دوست ایم ایس نے مجھ سے کہا۔ ”میرے ایک دوست غلام محمد غوری ہیں وہ ”ست رنگ“ ڈائجسٹ نکالتے ہیں۔ انہیں ایک بندے کی ضرورت ہے۔ چلو چل کر دیکھ لو کہ تم ان کا مطلوبہ کام کر سکتے ہو یا نہیں ان کے ہاں بنیادی کام تو پروف ریڈنگ کا تھا مگر اس کے ساتھ وہ مجھ سے کہانیاں بھی لکھواتے اور انگریزی ناولوں کی دس سے ڈیڑھ بجے تک۔ اس دوران میں منیر حسین صاحب کے قلمی ماہنامہ ”قلم الہیا“ کے لیے لکھنے میں مضامین لکھ دیا کرتا تھا جس کے معاوضے وہ بڑی پابندی سے دیتے تھے۔ ایک دن منیر صاحب کہنے لگے۔ ”آدھے دن کی نوکری ہمارے قلم ایڈیٹر بھی کرلو۔“ اس طرح میں ”ست رنگ“ کے دفتر سے نکل کر قلم ایڈیٹر بن گیا۔

کچھ عرصہ گزرا تھا تو ایک روز منیر صاحب نے

کہا تھا۔ ”ہمارے پاس بے غل ٹائم جاب کرلو۔“ اور میں نے دو پارٹ ٹائم جاب کی جگہ ایک قلم ایڈیٹر ملازمت کرنی اور کوئی سولہ سترہ سال ان کے ساتھ رہا۔ اس دوران میں نے فزکی لائسنس کے طور پر مختلف پورے اور ڈائجسٹوں میں لکھا جن میں ”ٹی وی ٹائمر“ اور ”مودی ڈائجسٹ“ کے علاوہ سپنس ڈائجسٹ اور جاسوسی دنیا بھی تھے۔

قلم ایڈیٹر میں نے اس لیے چھوڑا تھا۔ ان دنوں میں سخت عملی تھا جوڑوں کے درکار عامہ پر اپنا تھا جو ان دنوں اس قدر بڑھ گیا تھا کہ مجھے مکمل علاج اور آرام کی ضرورت تھی۔ چھ مہینے کے مکمل علاج کے بعد میں صحت یاب ہوا تو ”لہریں“ نام کے ایک ماہنامہ جریڈ سے وابستہ ہو گیا۔ یہ سارا پچھلے اکیسے ایڈٹ کرنا پڑتا تھا۔ ایک سال تک اس پرچے کے وابستہ رہا پھر یہ بروج مالکان نے خود ہی بند کر دیا۔ ابھی ”لہریں“ بند نہیں ہوا تھا کہ میں نے ماہنامہ ”مرکز گشت“ ڈائجسٹ کے لیے ایک قلمی مضمون سابق شرقی پاکستان کے سابق اداکار رحمان پر لکھ کر دفتر بھجوا دیا۔ ”مرکز گشت“ سپنس ڈائجسٹ کے ادارے سے نکلنے والا ڈائجسٹ تھا اس کے ایڈیٹر انچارج انور فراز کو یہ تحریر بہت پسند آئی۔ انہوں نے مجھے دفتر بلوایا اور یہ چما۔

”آپ کیا کرتے ہیں؟“

”ایک غیر معروف پرچہ ہے ”لہریں“ اسے ایڈٹ کر رہا ہوں۔“

”کیا پیسہ دیتے ہیں وہ؟“

”تین ہزار روپے۔“

”اس پرچے کو کوئی مایں اور ہمارے ہاں مستقل لکھیں۔“ آپ کو اس سے زیادہ پیسے ملیں گے۔“ اور میں نے ایسا ہی کیا۔ میرے کوئی مارنے سے پہلے ہی ”لہریں“ کی کاپی موت واقع ہو گئی۔ میں

نے ”مرکز گشت“ اور اس ادارے کے لیے بہت لکھا اور بہت کام کیا مگر 1992ء میں یہ سلسلہ بھی ختم ہو گیا جس کے بعد میں شہر سے نکلنے والے دیگر ڈائجسٹوں اور نیگزینز کے لیے لکھنے لگا اور فزکی لائسنس کا یہ سلسلہ جاری رہا۔ اس دوران میں ”اسکرین ڈائجسٹ“ کے نام سے ایک نئے قلمی ڈائجسٹ کی ادارت بھی کی۔ الف سے ی تک ساری تحریر میری ہی ہوتی تھی۔ دو اور خوبصورت جریڈ تھا مگر اس کے مالک اپنے دیگر کاروبار کی وجہ سے اس پرچے پر توجہ نہیں دیتے تھے انجام کار کی شراوں کے بعد ہی اسے بند کر دیا تھا۔

ایک دن میں روزنامہ ایکسپریس، کراچی کے دفتر میں اپنے بچہ سحانی دوستوں سے ملنے کی غرض سے گیا تھا جن میں سید محمد صوفی اور حیات عزیز نقوی وغیرہ سرگھر تھے۔ میں ریمپشن میں بیٹھا ان لوگوں سے باتیں کر رہا تھا کہ ”ایکسپریس“ کے ایڈیٹر نیروی دفتر میں داخل ہوئے تو مجھ پر نظر پڑتے ہی میرے پاس آ گئے۔

”ارے یا اتم کہاں ہو؟ ایکسپریس کے اجرا کے زمانے میں شہر کے صحافی آ کر مجھ سے ملے مگر تم نہیں آتے؟“

میں نے ان کی محبت کا شکریہ ادا کر کے ہوئے کہا۔ ”میں نہیں آتا کچھ ملازمت نہیں کرنے ہے۔ اب میں فزکی لائسنس کر کے ہی دال روٹی کا بندوبست کر لیتا ہوں۔“ اور پھر ان کے کہنے پر میں نے کچھ دنوں تک وہاں بھی کھار کھا پھر یہ سلسلہ بھی منقطع ہو گیا۔

ایک دن میں صفت روزہ ”نور جہاں“ کے دفتر میں بیٹھا تھا کہ میرے نو جوان سحانی دوست شہنشاہ حسین رضوی آئے انہوں نے کہا۔ ”ایک بڑی خبر لے کر آیا ہوں اور وہ خبر یہ ہے کہ نگار نگار ایوارڈ



تجھ کو شاید نہیں خبر سائیں
عشق کرتا ہے معتبر سائیں

تیرے قدموں میں رکھ دیا خود کو
اب جو چاہے سلوک کر سائیں

اپنے صدمے سے مار دیتا ہے
عشق مٹا نہیں اگر سائیں

تجھ کو چاہا نہیں، خدا کی قسم
تجھ کو پوجا ہے عمر بھر سائیں

بھول جاؤں میں کس طرح سب کچھ
زور چلتا ہے عشق پر سائیں

ساٹوں کی ہوا ہوں آج مجھے
اپنی مٹی میں قید کر سائیں

عکاشہ محرم

کر آؤں۔ بہن حسن نگار کا تعلق نہ صرف الیاس
بھائی سے بڑا پرانا تھا بلکہ نگار بھتیجا بھی کا پرچہ تھا جسے
بھائی الیاس نے خرید کر اخباری صورت میں جاری
کیا تھا جبکہ دانش دیوی جس زمانے میں فلم راتر ہوا
کرتے تھے ان دنوں ایک عرصہ تک نگار کی ادارت
سے وابستہ رہے تھے۔ بہن حسن نگار صاحب نے تو
اپنا کام یہ کہہ کر میرے سر قحط دیا تھا کہ ”یانا۔۔۔!“
الیاس صاحب سے رفاقت طویل عرصے پر محیط
ہے۔ ایسا کہ وہ کہیں نہیں کچھ ٹوس لکھ کر دے دوں
گا مگر انہیں معنوں کی شکل دے دوں۔ ”مرحوم میرے
ایسے سینئر میں تھے جن کی محبت اور شفقت مجھے
ہیش حاصل رہی تھی۔ میں ان کی بات مان نہ سکا۔
ان کے دینے ہوئے ٹوس پر میں نے ایک طویل
معنوں ”نگار کی کہانی“ نگار کی زبانی“ کی صورت
میں لکھا جو کولڈن جولی نمبر میں شائع ہوا۔۔۔ جبکہ
دانش دیوی مرحوم سے ملنے کے لیے مجھے ایامنامہ
”سچی کہانیاں“ کے دفتر جانا پڑا تھا وہ میری عمر
سینئر تھے اور بڑی بہت اور شفقت سے میں نے اسے
والوں میں تحفے میں ان کے پاس جو کام لے کر گیا
تھا اس پر تو انہوں نے سرسری کی بات کی البتہ مجھ
سے اس بات کی زبردست شکایت کی تھی کہ۔۔۔
”انور فاران۔۔۔ اہم شہر بھر کے ڈائجسٹوں میں
لکھتے ہو مگر کبھی ہمارے پرچے میں نہیں لکھتے؟“
”آپ لکھتے کو کہیں کے تو لکھوں گا۔“
”تو لکھو نا۔۔۔ اس طرح ایامنامہ ”سچی کہانیاں“
کے لیے بھی میں نے کہانیاں لکھنا شروع کر دی
تھیں۔ یہ سلسلہ آج تک جاری دسارے سے آگے چل
دانش دیوی عرصہ ہوا ہم سب سے ناتواں ذکر یادوں
کی دنیا میں جا بے ہیں کین انہوں نے ایامنامہ ”سچی
کہانیاں“ سے میرا جو رشتہ جوڑا تھا وہ اب بڑا
ہوا ہے۔ یہ سلسلہ جڑے کتنے سال گزر گئے مجھے اس

کے لیے مجھے جڑتی ملازم رکھ لیا تھا لیکن زیادہ
دنوں میں ان کا ساتھ نہ دے سکا پھر خاصے دنوں
کے بعد خالد چاولہ نے ایک دن فلم ایلیاس کے دفتر
میں مجھے کہا۔ ”انور صاحب۔۔۔! سنتوش کمار پر
ایک معنوں لکھ دیجیے۔“
سنتوش کمار کا انتقال کچھ عرصہ پہلے ہوا تھا۔ میں
نے مرحوم کے بارے میں معنوں لکھ دیا تھا۔۔۔ اور
یوں اگلے ہفتہ خالد چاولہ کچھ موجود تھے۔ ”انور
صاحب۔۔۔ آپ پر ہفتہ نور جہاں کے لیے ایک ایسے
معنوں لکھ دیا کریں۔“
”چاولہ صاحب! آپ تو جانتے ہیں کہ میں
کوئی شوقیہ قلم کار نہیں، میں لکھنا لکھنا میرا پیشہ
ہے۔“
”ٹھیک ہے آپ لکھیں تو۔۔۔ میں اپنی
استغاثت کے مطابق کچھ نہ کچھ ضرور دوں گا۔“ مگر
اُن کا۔۔۔ ”کچھ نہ کچھ“ یوں کہے کہ نہ ہونے کے
برابر تھا مگر میں نے لکھنے کا سلسلہ جاری رکھا۔ یہ
سلسلہ اُن کے انتقال کے بعد نور جہاں بند ہونے
کے بعد ہی ختم ہوا۔ ہاں تو بات نگار کی ادارت سے ٹوس
سے شروع ہوئی تھی جس کے دوران ”نور جہاں“ کا
قصد بھی آگیا۔ مرحوم الیاس رشیدی صاحب کو اب
دنیا سے گئے تقریباً بارہ تیرہ برس ہو رہے ہیں میں
ان کے انتقال کے اگلے ہفتے سے لے کر آج تک
نگار کے نمونہ عرصہ دراز سے لکھ رہا ہوں جبکہ درمیان میں میں
کبھی کبھی معنوں بھی لکھ دیتا ہوں۔
اور اب بات ہو جائے ایامنامہ ”سچی کہانیاں“
سے میرے تعلق اور رشتے کی۔ جن دنوں نگار کا
کولڈن جولی نمبر ایک ضخیم رسالے کی صورت میں
نکلنے والا تھا مجھے یہ ذمہ داری سونپی گئی کہ میں بہن
حسن نگار اور دانش دیوی صاحب سے مل کر نگار کا
الیاس رشیدی کے بارے میں ان کے تاثرات لے

کے بانی جناب الیاس رشیدی جنت آشیانی ہو گئے
ہیں۔ میں یہاں سے سیدھے ان کی میت میں
شرکت کے لیے جا رہا ہوں۔“
”یار۔۔۔! میں بھی تمہارے ساتھ چلوں گا۔
مجھ سے بھی تو ان کا بڑا پرانا رشتہ تھا۔“ جب ہم
دو دنوں بی ای سی ایچ ایس سوسائٹی کی رحمانی مسجد
پہنچے تو میت آخری آرام گاہ پہنچانے کے لیے کھڑی
پرہی جاری تھی۔ ہم دونوں بھی اس گاڑی پر سوار
ہو گئے جس میں شہر کے تمام عی فی سمانی اور فوری
شخصیات موجود تھیں۔ تدفین کے بعد صلاح الدین
پراچا اور مرحوم کے صاحب زادے اسلم الیاس نے
مجھ سے کہا تھا۔
”اچھا ہوا آپ آگئے نہیں آتے تو ہم آپ
کے پاس آتے۔ آپ کل نگار کے دفتر ضرور
آئیں۔“
میں اگلے روز وہاں پہنچا تو اسلم الیاس اور صلاح
الدین پراچہ نے کہا۔ ”اب آپ کو ایک ذمہ داری
سنبھالنی ہوگی اور وہ ذمہ داری ہے ادارت سے ٹوس کی۔
آپ کو تو معلوم ہے کہ کدو پریم گری کی وفات کے
بعد الیاس صاحب خود ادارت پر تھے تھے۔ اب یہ کام
آپ کو کرنا ہوگا۔“
”مجھے کوئی اعتراض نہیں مگر آپ لوگوں کو علم ہے
کہ میں ہفت روزہ ”نور جہاں“ میں بھی ادارت سے اور
ایک نمونہ عرصہ دراز سے لکھ رہا ہوں۔“
”آپ وہاں بھی لکھتے رہیں، ہمیں کوئی
اعتراض نہیں۔ ہفت روزہ ”نور جہاں“ بھی نگار کی
طرح ایک پرانا فنی اخبار تھا۔ اس کے بانی اور
باک ایس اے چاولہ تھے جن کی وفات کے بعد
ان کے دو بیٹوں سعید چاولہ اور خالد چاولہ نے
پرچے کو زندہ رکھا۔ سعید دفتر کی امور چلائے خالد
باہر کے کام کرتے۔ سعید چاولہ نے اپنی معاونت

کا حساب کتاب یاد نہیں۔ پہلے دانش دروی بہام مرزا شمس لویہ مرحوم وغیرہ پھر سلیم فاروقی چودری بگلاری اور اب منزہ بہام (جنہوں نے مرزا صاحب کی وفات کے بعد ادارہ سنبھال کر بیٹی ہونے کے باوجود بیٹے والا لقب ادا کر دیا ہے) اور اب سر مرزا سے یہ رشتہ برقرار ہے۔

میں نے ماہنامہ ”نئی کہانیاں“ اور دیگر میگزینز اور ڈائجسٹوں کے لیے بھی بے شمار کہانیاں لکھی ہیں لیکن کئی صورت میں اب تک نہ کہانیوں کا کوئی مجموعہ شائع ہوا ہے نہ کوئی شعری مجموعہ۔ اگرچہ میرے کچھ دوست اور بہنی خواہ مسلسل اصرار کرتے ہیں کہ ازم کش شعری مجموعہ تو پچھوالو کہ تمہاری شاعری محفوظ رہ جائے مگر ہم جیسے لوگوں کے لیے بہت سی باتیں چاہئے کہ باوجود ممکن نہیں ہوتیں۔ میرے بچوں کو شکایت ہے کہ آپ نے ہمارے لیے کیا کیا؟ ایک گھر تک نہیں بٹکتے؟ ہم لوگ آخر کب تک کرائے کے مکان کا غلاب جھیلے رہیں گے؟ بیوی کو بھی بھوکھ شوکھ ہی رہا کہ تمہارے گھر میں کچھ نہ تھا؟ کیا آرام؟ میں اُن سے بس یہی کہتا ہوں کہ اللہ جسے جس حال میں بھی رکھا ہے اس کا بڑا احسان ہے۔

پرنٹ میڈیا جب سے بحران کا شکار ہے اس سے وابستہ نہ تھے جیسے لوگ پہلے سے زیادہ پریشان ہیں۔ میں جیسا کہ پہلے عرض کر چکا ہوں کہ ابتدا میں سے میری طبیعت ذاتاً مختلف رہی ہے وہ جو کچھ لوگ بیخیر ہیں میں کراہتی جگہ بنا لیتے ہیں اسے آپ کو نمایاں کر لیتے ہیں یہ ”خونی“ مجھ میں نہیں جس کی وجہ سے میں دوسروں کی طرح اپنے آپ کا خدائی فائدہ نہ پہنچا سکا بلکہ یہ کہنا بہتر ہوگا کہ نقصان ہی پہنچایا خود کو بھی اور اپنے لوگوں کو بھی۔

اب میری عمر کا آخری بھر ہے متعدد بیماریاں

اس تہذیب کو غیر فخر الکریم کا لاکھ شکر ہے کہ میں اپنی تمام ذمہ داریوں سے تقریباً عہدہ بردار ہو چکا ہوں اور امید تو یہی ہے کہ مجھے بڑے سکون کے ساتھ مٹی اوڑھ کر مرنے کا فیصلہ ہو جائے گا۔

عائشہ عارف

آپ کی ملازمتی کے لیے

اِن منتخب شدہ پادوں کو آپ اپنی ملازمتی میں جاسکتے ہیں

انتخاب

تقلید

انسان کی جبلت میں عجیب شے ہے۔ نہ میں خوش نہ غم نہ تیرہ میں۔ قدرت نے ہمیں ہر طرف انکساکات بنا کر جہاں دنیا کی تمام حقاہات پر فضیلت بخشی ہے وہیں کچھ ایسے جذبات بھی ہماری طبیعت میں شامل کر دیئے ہیں کہ ہم اکثر اوقات کاہنی بنی خالق کی ہائیکری کر جاتے ہیں۔ کمالات و واقعات کی پریشانی پہ چلوے تو عجب تقدیر کے ہاتھوں گشت کے گئے لیکن اگر دیکھا جائے تو یہ سب ہمارا اپنا ہی کیا حرا ہے۔ بحیثیت قوم ہماری زندگیوں میں بارہ پچی کا عنصر اس حد تک شامل ہو چکا ہے کہ اب ہمیں سوائے چمک دک کے کوئی چیز بھاتی ہی نہیں۔ بڑے بزرگوں سے سنتے ہیں کہ ایک زمانہ تھا جب اس معاشرے میں نئے نئے والے ایک دوسرے کے اتنا قریب تھے کہ ایک ہی خاندان کا گناہ گزرتا تھا۔ ہماری اقدار دم و روان اور روایات ہی ہماری پہچان تھیں لیکن ترقی کے تیز رفتار پہرے نے ہمیں آسائشیں مہیا کرنے کے ساتھ ساتھ جہاں زندگی کو سہل کر دیا ہے وہیں اس نے ہماری اہلیت کو بھی کم کر دیا کہ میری طرح سے سب کو دیا ہے کہ خود اپنی پہچان

بھی نہیں جس میں بلکہ بھی کبھی تو ایسا ہوتا ہے کہ ہم واقعی ایک قوم کی بجائے بے ہنگم جہوم ہیں اور دوسروں کی تقلید کرتے کرتے ہماری حالت اس کے بھی کبھی ہوئی ہے جو جس کی چال چلتے چلتے خود اپنی ہی چال بھول گیا تھا۔

ریاض بلادیہ کی تعریف ”مہم زندہ قوم ہیں“ سے اقتباس انتخاب: عمران ہارون پھولانی۔

سرخ شہر اہل

ہماکسن دربار کے لیے یہ حکم تھا کہ وہ درویش اور یہودی گھوڑوں سے شاہیان نہ کریں اور کینڑوں سے بھی نہیں کہ وہ تو خرید و فروخت کی شے نہیں مگر رگوں میں غلط ملط خون سے کٹی اور نشتے اٹھتے تھے۔ خلیفہ کی بات جد اقصیٰ کہ وہ اپنے طاقت ور سرخ خون کی وجہ سے حاکم بن سکتے تھے اور ترکی کینڑوں کے ہر خلاف میں بیٹھ حکم چلایا تھا۔ کم سن عباسی خلفاء اپنی ماؤں کے سامنے میں تخت پر جلوہ افروز ہوتے تھے اور اس سے پہلے وہ ترک سرداروں کے بچوں کے ساتھ کھیلنے، کھیلنے جاتے اور پلٹتے تھے۔ اس نے اس جہوم بے پناہ کو جو یورپ کے اس کے گرد و پیش دور تھا پیشانی پر ہاتھ پھیر کر ہمکا اور سوچا۔ آقا کے لیے اس مرد زماں نے جو دو راہی ہے وہ سرخ

شراب ہوتی چاہیے۔ خون سے کبھی کسی کا علاج کیا گیا ہے؟ یقیناً سرخ شراب ہی ٹھیک ہے مگر اس شدت اور قہر کی پیاس آخر کیوں؟ شکست اور ناکامی کا علاج خون کیوں؟ وہ کرزہ کیا۔ اس نے اپنے آپ کو کھلی دی۔ ہاں! اسے ارغوانی کو اگر تہایت غصہ کیا جائے یا کھل جے تو وہ خون کی رنگ کی بنے ناب کشیں دے سکتی۔ اس کے بنی کے اندر کوئی کبہ رہا تھا۔ سرد اسیر کا مطلب ہرگز یہ نہیں تھا۔ یہ توجہ بہرہ غلط ہے۔ یہ مطلب فضول ہے۔ یہ بات کذب ہے۔ شاید وہ خودکامی میں اس حد تک منہمک اور اپنے سامعہ مباہلے میں اٹھا ہوا تھا کہ اسے اپنی بات کا جواب اپنے عقب میں آتی ہوئی اجڑے ہوئے کسی کی ایک صورت نے دیا۔ خون اور شراب دو الگ چیزیں ہیں اور جو پیاس خون سے بجھے گی وہ خون ہی سے نئے کی بشرط یہ خون خونی ناختی ہو کہ اس کی مددوں تک پکارنے کی صلاحیت ہوتی ہے۔

جیلہ ہائی کی تعریف ”وہت نوس“ سے اقتباس
انتخاب: باہر محبوب کراچی۔

نصوائی غزروں

مشور تاہد پہلی نظر میں سخت بدینہ لڑائی لگی تھی اور واقعی وہ بدینہ ہے۔ اس کی وجہ یہ نہیں کہ اسے اصحیٰ آداب کا علم نہیں۔ وہ خود بھی طور پر ملائی صوفیوں سے تعلق رکھتی ہے۔ اس کا جی چاہتا ہے کہ وہ ہماری محفلوں میں ایسی حرکات کرے جن پر لوگ ملامت کریں۔ وہ کسی کی کوئی بات نہیں مانتی۔ وہ ہر ایک کو لٹا لٹاتی ہے۔ وہ کوشش کرتی ہے کہ اس کے جانے کے بعد تمام خوش اور مرد جی بھر کر اس کی برائی کریں۔ اس سے خار کاٹھیں۔ اس کو فطرت سے یاد کریں مگر اس کو سمجھوں نہیں۔ اس فطرت سے وہ چاہے خود کوں کس اصول سے اپنے لیے پیدا کرتی ہے اس کا انسانی غرور ہر گز ہے۔ یہ وہ چمک مار کر ان کے دائرے سے نکل جاتی ہے اور کہتی ہے ”وہیکو“

”تم میں سے نہیں۔“ وہ مردوں سے کہتی ہے۔ میں ایک پہنچ ہوں۔ میں تمہارے مجبور جسموں کو نہیں مانتی۔ میں تمہارے ہم و ادھار کے ساتھ نہیں ہوں۔ تم کھس کن کے سچے ہو۔ تم ایک چائنا کاکر روئے اور انسانے کھنے لگتے ہو۔ تم کچھ بھی نہیں ہو۔“ اور مرد اپنا گال سہلاتے ہوئے بھاگ جاتے ہیں یا اس کے گرد حمال ناچنے لگتے ہیں۔ مشور تاہد اس طرح محروں اور مردوں کے درمیان پل پر کھڑی دونوں کو بخانی ہے۔ وہ کسی ایک کے دائرے میں جانے کے لیے تیار نہیں۔ وہ جس سے دوستی کرنا چاہتی ہے اس کو مختلف طریقوں سے اشتعال دلاتی ہے اور سوچتے کرتی ہے تاکہ وہ اس سے چڑ جائے۔ نفرت کرے اور گالیاں دے۔ اس میں کامیاب نہ ہو سکے تو وہ بے چین ہو جاتی ہے پھر مردوں سے کرید کرید کر پہنچتی ہے۔ میرے بعد کسی نے کیا کیا تھا؟“ وہ برداشت نہیں کر سکتی کہ کوئی کھل اس پر ملامت کے بغیر اٹھ جائے۔

احمد نیر کی تعریف ”مختار چمری“ سے اقتباس
انتخاب: قردا گنن ننب۔ ملتان۔

فوائد ہی فوائد

ایک صاحب پرانی کار کے فوائد اور ہی کار کے نقصانات پر روشنی ڈالتے ہوئے بولے۔ ”کار جب بھی خریدیں پرانی خریدیں۔ اولہ از گولہ۔ پرانی کار کی توات ہی کچھ اور ہے۔ کیا اچھی شے ہوتی ہے۔ نہ کسی کا پی لچائے نہ کوئی طرح بد ڈالے نہ کوئی ہاتھ لگائے۔ ایک شیش نہیں چڑتا نہ چڑے کوئی بات نہیں۔ کوئی پتھر سے کیر کھینچا چلا گیا تو کیا ہوا کسی نے کیل سے اپنا اسم گرامی جلی حروف میں لکھ ڈالا اچھا کیا برا نہ کیا۔ باہر کھڑی ہے کھڑی رہے۔ کن ہے جائے؟ کسی کی مت تو ماری نہیں کی۔ جہاں جی چاہے۔ جاہد بخشی دو چاہے کھڑی کر دے۔ اطمینان سے اپنا کام کر دے۔ جب بھی لوٹ کر آؤ وہیں ملتی ہے جہاں کھڑا کرتے ہو۔ چور اچھے بھلا

کیوں لوٹ دیتے گئے ایسی کار کو باڈی اتنی مضبوط کہ ہر سروس نہ کر لیں۔ نہ کھلے نہ بولے۔ جتنا چاہیں لوڑ اٹھائیں۔ سینٹ کی بوریاں آئینیں کاٹھ کٹاڑ جو چاہیں ڈکی میں بھر کر لائیں۔ جتنی چاہیں سواریاں بٹھائیں کیا مجال سینچیں جیوں بھی کر جائیں۔ کچھ سے غمرا جائے کھیا کر جانے کا کار کا بال بھی پکا نہ ہوگا۔ ایک ڈراما سا ڈینٹ پر کیا تو پر گیا۔ چھوٹی کار والے تو خود ہی اسٹرا ایک طرف ہو جاتے ہیں جیسے کسی سربراہ کی کار ہو۔ واللہ بات ہی کچھ اور ہے پرانی کار کی۔ پریشان بھی زیادہ نہیں کرتی۔ پٹرول بھی کم کھاتی ہے۔ لکڑ دھکے جو گلوٹاتی ہے۔ دھکے لگوانا کوئی عیب نہیں اس میں کچھ فوائد مضمر ہیں۔ گھر کے بیشتر افراد کی صحت ٹھیک رہتی ہے۔ اسی بھانے ورزش ہو جاتی ہے۔ روند اس مشینیں ”دور میں وقت کہاں ملے ان کاموں کے لیے؟ اس کے ریسٹروں کی کھینچیں میں مدد دیتی ہے انھما کا کمر میں لیں ذرا دھکا لگا کر تو دیکھئے فوراً پھڑکا جائے۔ کتا خوش نصیب ہوتا ہے پرانی کار والا۔ کبھی پرسکون زندگی گزارتا ہے۔ کبھی سرے سے ہوتا ہے دنیا و نایبھا سے بے خبر ہو کر۔ نہ کیراج کی ضرورت محسوس کرتا ہے نہ چونکداری کی۔ گلی میں کھڑی کرتا ہے اور بے فکر ہو جاتا ہے۔ پرانی کار کم خرچ بالائین پائیدار فائدے سے بھر۔

افشوائی حقائق

☆ مضبوطی باتیں
☆ غصہ کبھی بھی نہایت قابل اور ذہین انسان کو بھی بے وقوفی دلا نکالت پر مجبور کر دیتا ہے۔
☆ ظلم ایسا بادل ہے جس سے اللہ تعالیٰ کی رحمت ہرتی ہے۔
☆ مگر اللہ تعالیٰ کی جانب سے عطا ہونے والا بہت بڑا عطا ہے۔
☆ انسان کی سب سے بڑی دشمن حرص اور لالچ ہے۔

☆ انسان بیماری کے ڈر سے کھانا چھوڑ دیتا ہے۔
☆ عذاب کے ڈر سے گناہ بھی چھوڑ دیتا ہے۔
☆ دوسرے کو اپنی ساری محبت دو دگر دہائیں۔ یہ عمل آئے کل آپ کا سب سے زیادہ نقصان پہنچانے والا دشمن بن سکتا ہے۔
☆ پاؤں پھسل جائے تو جسنانی چوٹ لگی گی مگر زبان کو نہ بھٹے دوزخ روحانی چوٹ کا باعث بھی ہو سکتی ہے۔

☆ ڈاکٹر محمد حسن کی تعریف ”گہ دھت“ سے انتخاب
انتخاب: نعیم احمد آکاش حیدر آباد۔

نظر ثانی

☆ غصہ ہم سے لڑتا ہے وہ ہمارے اعصاب کو مضبوط کرتا ہے اور ہماری استعداد کو تیز تر بناتا ہے ہمارا اخلاق ہمارا درگاہ سے سونچنے کے دو انداز ہیں ایک یہ کہ غصہ کسی پر تنقید کرے آپ کی مخالفت کرے آپ اس کو فوراً اپنا دشمن سمجھ لیں اور اس سے نفرت کر لیں دوسری صورت یہ ہے کہ تنقید اور مخالفت پیش آنے کے بعد آپ اپنے اوپر

☆ مسرت: خان خاں کراچی۔
☆ اصول ہوتی
☆ حکمت ایک درخت ہے جو دل میں آگ سے اور زبان سے پھل دیتا ہے۔
☆ کامیاب ہے وہ انسان جو ضرور بات زندگی سے وقت نکال کر خدا کا شکر ادا کر دے۔
☆ جتن جزیں انسان کو جاہ کر دیتی ہیں۔ حرص

بیویاں

امریکا کے ایک شہر کے میئر کو پتا چلا کہ اس کے علاقے میں رہنے والا ریڈ اٹھین دھتے عدد بیویوں کا شوہر ہے تو فوراً وہ اس کے گھر پہنچا۔

”دیکھو میئر.....“ میئر نے ریڈ اٹھین سے کہا۔ ”ہمارا قانون ہرگز اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ کسی مرد کی ایک سے زیادہ بیویاں ہوں۔ قانون کا احترام کرنا سیدھے گھر جاؤ اور اپنی پانچوں بیویوں کو تازہ کر آج سے وہ تمہاری بیویاں نہیں رہیں۔“

ریڈ اٹھین نے چند لمحوں تک میئر کے مشورے پر غور کیا اور اچانک وہ اس طرح کانپنے لگا جیسے اس پر جازا چڑھ گیا ہو پھر وہ ہاتھ جوڑ کر رزنی ہوئی آواز میں بلا۔

”میری بیویوں کو یہ بات آپ ہی تا کیا؟“ دوسری صورت میں مج کے اخبار میں میری تصویر شائع ہوئی اور نیچے لکھا ہوا۔

”وہ ریڈ اٹھین جو پانچ بیویوں کے ہاتھوں مارا گیا۔“

مرسلہ: شریل القدس۔ جبک آباد۔

سیر کاری اسلام

ایک سرکاری افسر سے ملاقات کے لیے ایک صاحب وقتے وقتے سے فون کر رہے تھے۔ صبح سے دوپہر تک انہیں مندرجہ ذیل جوابات سننے کو ملے۔ ”صاحب تو ابھی آئے ہی نہیں۔ صاحب بس آئے ہی والے ہیں۔ کچھ دیر پہلے صاحب کا فون آیا تھا کہ انہیں آئے میں کچھ دیر ہو جائے گی۔ جی ہاں وہ آئے تھے لیکن ابھی ابھی بوئے صاحب نے انہیں پیٹنگ کے لیے بلا لیا ہے۔ جی۔ وہ ابھی پیٹنگ سے نہیں آئے۔ اب تو وہ بیچ کے لیے چلے گئے ہیں۔“

دوپہر دو بجے کے بعد ان صاحب کو مندرجہ ذیل جوابات سننے کو ملے۔ ”میں وہ بیچنے ہی والے

ہوں گے۔ میں وہ ابھی تک نہیں آئے آپ بیٹا نام دے دیجیے۔ وہ بلڈنگ میں ہی نہیں ہیں۔ ان کی واکٹ کری پرلگی ہوئی ہے لیکن یہ نہیں معلوم کہ وہ کہاں ہیں مجھے پتا چاہئیں ہے کہ وہ واپس آئیں گے یا نہیں؟ جی ہاں ان کا سواہل آف ہے۔ ارے جناب وہ آئے تھے لیکن بس دو منٹ پہلے ہی چھٹی کر گئے ہیں۔ اب تو دینے کی آفس بند ہی ہو رہا ہے۔ میرے ہاتھوں میں تالاب۔“

اسلام

بچے نے باپ کے دفتر میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔ ”کیا حال ہے ڈیڈی میں اصرے گر رہا تھا میں نے سوچا ڈیڈی کو سلام کرتا جاؤں۔“

”کوئی قائل نہیں بیٹا؟“ باپ نے غصیلی سانس لے کر کہا۔ ”تھوڑی دیر پہلے تمہاری اہلی جی اصرے گزری تھیں انہوں نے جی سوچا کہ مجھے سلام کرنی چاہئیں۔“

”جیب میں موجود ہمارے پیسے ڈالنے کی مرسلہ۔ نوین نقوی۔ بمبک۔“

چیزم آلو لائق

خدا ہم کو ایسی خدائی نہ دے کہ اپنے سوا کچھ دکھائی نہ دے خطاوار سمجھے گی دنیا تجھے اب اتنی زیادہ صفائی نہ دے جسو آج اتنا کہ اس شور میں صدا سکون کی سنائی نہ دے غلامی کی برکت سمجھنے لگیں اسروں کو ایسی رہائی نہ دے مجھے ایسی جنت نہیں چاہیے جہاں سے مدینہ دکھائی نہ دے خدا ایسے احسان کا نام ہے رہے سامنے اور دکھائی نہ دے

(نثر بردار) حسن انتخاب: روبینہ سید، کراچی۔

☆

دکھ فسانہ نہیں کہ تجھ سے کہیں دل بھی مانا نہیں کہ تجھ سے کہیں آج تک اپنی بے گلی کا سبب خود مجھ جانا نہیں کہ تجھ سے کہیں بے طرح حال دل ہے اور تجھ سے دوستانہ نہیں کہ تجھ سے کہیں ایک تو حرف اٹھا تھا مگر اب زمانہ نہیں کہ تجھ سے کہیں قصدا ہم فقیر لوگوں کا اک ٹھکانہ نہیں کہ تجھ سے کہیں اب تو اپنا بھی اس گلی میں فراز آنا جانا نہیں کہ تجھ سے کہیں اب تو اپنا بھی اس گلی میں فراز آنا جانا نہیں کہ تجھ سے کہیں

(احمر فراز) حسن انتخاب: رابعہ مظفر، کراچی۔

☆

دکھوں کی شرمیں زخموں کی گہرائی مجھے دے دو مسیحا تم ہو آذن مسیحائی مجھے دے دو تم اپنی ذات میں خود انجمن ہو تم کو کیا غم ہے تم تمہا ہوں یہ ذوق برہم آرائی مجھے دے دو تم اپنے دل کے درد اڑے متقل شوق سے کرلو بس اپنی ذات سے آذن شامائی مجھے دے دو تمہارے بعد رہ منتر مجھے بے رک لگا ہے دو آکھیں مجھیں لو یا اپنی بیٹائی مجھے دے دو میں ماسوں میں مسو لوں کہ تمہاری ہر امانت کو یہ دشت ناک سنائے یہ تمہائی مجھے دے دو

(انتظار ساجد) حسن انتخاب: شیدا ترم، کراچی۔

☆

میری ساری زندگی کو بے غمراں نے کیا مر میری تھی مگر اس کو بھر اس نے کیا

میں بہت کھڑا تھا اس ملک میں ہجرت کے بعد پر مجھے اس ملک میں کمزور رہا اس نے کیا راہبر میرا بنا گمراہ کرنے کے لیے مجھ کو سیدھے راستے سے روک دیا اس نے کیا شہر میں وہ معتبر میری گواہی سے ہوا پھر مجھے اس شہر میں نا ستر اس نے کیا شہر کو براد کر کے دکھا دیا اس نے منبر شہر پر یہ ظلم میرے نام پر اس نے کیا

(منیر نیازی) حسن انتخاب: شعیب جی الدین فریدی۔ لاہور۔

☆

ستارے بانٹا ہے وہ فناء تقسیم کرتا ہے سنا ہے جس موسم میں ہوا تقسیم کرتا ہے تمہاری یاد کو میرے لیے دلی پر اتارتی ہے کہ جیسے روشنی شب میں دیا تقسیم کرتا ہے اسے روکو کہ باز آئے سراسر بے پاگل پن جو بہروں کے غلوں میں صدا تقسیم کرتا ہے اسی سے مانگ تو عرفان چھوڑ دے سب کو جو پھر میں بھی کیڑوں کو غذا تقسیم کرتا ہے

(عرفان صادق) حسن انتخاب: فیاض علی۔ اسلام آباد۔

☆

شاہد نکل ہی آئیں خروں کے حصار سے اب کے ہمیں امید بہت ہے بہار سے جگنو کی کڑے آ کے ہا دانے تیرگی گھبرا گیا ہوں طول فط انتظار سے مصیبت کی حد ہے کہ ہم اہل کارواں منزل کی راہ پوچھ رہے ہیں غبار سے خود ساختہ حلقہ محسوس سے ہوشیار محروم کر نہ دیں فخر سایہ دار سے

(موسیٰ عظیم آبادی) حسن انتخاب: اقبال حسین، کراچی۔

ماہِ جمادی الثانی

عزیزو.....!

ہاؤ مجاہدوں کو خراجِ کھانہ کی معنوں میں اہم ہے، خصوصاً ان حضرات کے لیے جو عملیات میں دخل رکھتے ہیں۔ اس اہک کا شمار ”آغوشی“ ہے۔ ایسے عیوضات اور دوا عاکیں جو آتشیں مقبلی ہیں ان کی تیاری اس ماہ میں سرچ الا رمجی جاتی ہے لیکن اس کے لیے کسی کی رہبری اشد ضروری ہے۔ ”آبائی“ صفت عیوضات میں نقصان کا احتمال نہیں۔

اس اہدائی بیسیوں تاریخ کو خصوصی اہمیت حاصل ہے۔ ہرگزوں کے مطابق اسی تاریخ کو حضرت یعقوب کو حضرت یوسفؑ کے زندہ ہونے کی خبر ملی۔ اسی تاریخ کو گریہ الیوب کا انتقام ہوا۔ اسی تاریخ کو آنحضرت ﷺ کی صاحبزادی حضرت فاطمہ الزہراءؑ دنیا میں شریف لائیں۔ اس روز روزہ رکھنا صدقہ دینا اعمال خیر بجالانا بزرگانِ نبشت کا تہنیت رہا۔ اس روز خداوند عالم سے مغفرت طلب کرنا مددِ افضل ہے۔ طلب حاجت کے لیے مندرجہ ذیل دعا کا پڑھنا افضل ہے لیکن اس کے پہلے دو رکعت نماز بجالائیں اور بعد سلام مندرجہ ذیل دعا کو پڑھیں۔

اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَسْتَلْکَ بِاَنَّکَ مَلِیْکُ وَاَنَّکَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ مُّقْدِرٌ وَاَنَّکَ
مَدْبِیْتُ مَنْ اَمْرٌ یَّحْدُوکَ اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَتُوْجِّهُ اِلَیْکَ بِنَبِیِّکَ مُحَمَّدٍ نَبِیِّ الرَّحْمٰتِ عَلَیْهِ
وَالِیْهِ اَمَّا مُحَمَّدٌ فَارْسُوْلُ اللّٰهِ اِنِّیْ اَتُوْجِّهُ بِکَ اِلَی اللّٰهِ رَبِّکَ وَرَبِّیْ لِیُجِیْعَ لِیْ بِکَ
طَلِبَتِیْ اَللّٰهُمَّ بَنِّیْکَ اَنْجِحْ لِیْ طَلِبَتِیْ بِمُحَمَّدٍ
پھر اے حاجت طلب کرے جو اے اللہ پوری ہوگی۔

□ ز-ز-پنڈی۔

☆ (۱) اللہ تعالیٰ کے لئے دعا ہے کہ یہ سب باتیں ہمارے دل پہ لکھی جائیں اور ہم ان سے اپنے لئے سبق حاصل کر سکیں۔ آمین

ہے۔ زندگی اللہ کی امانت ہے تم سے اس بارے میں پوچھا جائے گا لہذا جو بیت کیا وہ ختم ہو گیا۔
 خراب ہو گی کی زندگی زار و بار اللہ سے بہت دعا میں کیا کرو۔ یہ شک و شبہ وہاں سے ہر مان آقا ہے یعنی
 نماز گزار اور عشاء کے بعد 7-7 بار سورۃ توبہ پڑھی
 نہ تکل جسی اللہ سے لے کر غرض اللہ تعالیٰ کے حضور
 پڑھا کرو۔ سب اچھا ہوگا۔ لاجل لا ملجأ کا بہت ورد
 پڑھا کرو۔

بھائی صاحبزادے! یہاں مسئلہ بہت اہم ہے مگر
 بیٹے انصاف اور فکر کرو گوش کرو یہ جاننے کی کہ وہ
 ایسی کیں ہوگی ہے انور بیٹے دیئے میں بھنے کوئی
 اعتراض میں مگر تم مسکری کر کو جانو تم حقوڑے
 دنوں کے لیے جھینوں پر آتے ہو تمہاری موجودگی
 میں حالات ٹھیک رہتے ہیں مگر یہ جاننے کی کہ کوش
 کرو کہ تمہاری بیوی اولاد والہ کا بیٹے میں کس
 سے ہے بہت اہم ہے کہیں اساتو نہیں کر تمہاری

شایدہ پردین۔ لاہور۔

☆ بیٹی شادیہ! اللہ تمہیں اولاد کی خوشیاں
کھائے۔ سب سے اہم نماز کی پابندی ہے۔ ہر مسئلے
پیشی پر ہو رہا ہے؟ گمراہیوں سے بات کر کے بھرنے
حالات سے آگاہ کرو۔

□ شاہینہ سلطان - لاہور۔

۵ بابا جی! اللہ آپ کو بہت اچھا رکھے۔ میرا

حد 1000 بار یا سوا حید کا پود کیا کرواؤں وہ
خز و درخشے۔ اس کے علاوہ دن میں باغ باز
سورۃ الناس سورۃ لقن آدم آیت الکرسی پڑھ کر گھر
کے تمام افراد پر تصور میں دم کرو۔ یہ سچہ محدقہ
کے قیام ضرور کیا کہ روچا ہے کسی گرجے میں کیوں نہ
ہوں۔ بھیکار یاہوہ حالات سے آگاہ کرو۔

□ طاہر خان - خوشاب۔

0 باباجی! میں آپ کا بہت پرانا مداح ہوں۔ جب بھی کوئی مشکل درپیش آتی ہے، میں آپ سے رابطہ کرتا ہوں۔ باباجی! میری بیٹی بہت نافرمان ہو گئی کہ بھابیوں کے ساتھ رہنا کتنا مشکل ہے؟ مجھے ایسا وظیفہ دیں جس کی برکت سے جلد زائل میری بھی شادی ہو جائے۔

○ شَهِدَ اللَّهُ أَنَّهُ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ
وَأَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهُ
وَأَنَّ الْإِسْلَامَ دِينُهُ
وَأَنَّ الْيَوْمَ نَبَأُ الْفُتُوحِ
أَلَمْ نَكْنِزْ لَهُ الْفَتْحَ
وَأَنَّ الْيَوْمَ نَبَأُ الْفُتُوحِ
أَلَمْ نَكْنِزْ لَهُ الْفَتْحَ

مٹی شاہینہ! مندرجہ بالا آیت پر نماز کے بعد 33

بار پڑھو اور دُعا کرو۔ بایں ہونے کے بجائے پورے یقین اور اعتقاد کے ساتھ دُعا کرو۔ لوگوں کے رویے سے کبھی بھی دلیبر وادشہ مت ہونا۔ اللہ بھی انہی کی ہر حرکت ہے جو اس کی رضا میں راضی رہے ہیں۔ لفظ کی مدت ایک ماہ ہے۔

□ ہمیز کریں۔ کچا دل
☆ بنی علیہم اوزن کہ کرنے کی دوا ان کل جلی تازہ نہیں کر رہا ہوں۔ اشیاء و متباب نہیں۔ جیسے بنی و متباب ہوں کی مطلع کیا جائے گا۔

□ فاطمہ سلیمان۔ پشاور۔
□ بابا جان! السلام علیکم میں اپنی محنت کو کر بہت پریشان ہوں سچہ ماہ ہو گئے ہیں کھائی ٹھیک نہیں ہوتی، کم ہو جاتی ہے مگر ختم نہیں ہوتی۔ ڈاکٹر دو کی دوا کھا کھا کر ٹھگ آ چکی ہوں۔ کھائی رات میں بہت زیادہ ہوتی ہے جس کی وجہ سے بڑی رات سو بھی نہیں پاتی۔ آٹھوں کے نیچے بہت گہرے چلتے پڑ گئے ہیں۔ میں دیکھنے میں سرخیش ہوئی ہوں حالانکہ بابا بنی امیری خوراک بھی اچھی ہے اور خضر یا کاشا میں پہلے بھی نہیں کھاتی تھی۔ مجھے کوئی دوا بتادیں میں بہت تنگ آ چکی ہوں۔

☆ بنی فاطمہ! اللہ نہیں مکمل شفا عطا فرمائے۔ نماز کی پبندی رکھو اور دُعا و درویش بہت پڑھو۔ بہت سہل طریقہ تیار ہوں یا باندی سے استعاضا کرواؤ۔ اللہ ضرور شفا ہوگی۔ اور کھانا کھان کی صورت میں باریک باریک کات لو پھر ان پر پکا سامک چھڑک کر توے پر بھون لو۔ نہار منہ 4-5 قاشیں کھم اللہ پڑھ کر کھالیا کرو۔ سیسافاضی کا بہت درد کرو۔ اللہ ضرور کرے فرمائے گا۔

□ مکی نذر بشو پورہ۔
□ بابا بنی! آپ کو سخت دے۔ میں شادی سے پہلے سے آپ کے رابطے میں ہوں۔ ہمیشہ آپ

سے ہی رہنمائی کی درخواست کی اور اللہ کا احسان ہے بڑا کریم رہا۔ بابا بنی! آپ کی یہ بنی اب بڑی دلی ہے۔ میری شادی کو پانچ سال کا عرصہ گزر چکا ہے مگر میری اولاد نہیں ہے۔ بڑا طویل عرصہ صبر کر کے گزارا مگر اب کچھ نہیں چیتے۔ دیتے۔ میرے شوہر بھی اکلوتے ہیں بیٹے لہذا مسائل میں سب کو بہت آرزو ہے۔ میری ساس تو بہت اچھی ہیں مگر پوچھی ساس بہت تکلیف دہ باتیں کرتی ہیں حالانکہ وہ خود غیر شادی شدہ ہیں اور ساری زندگی ان کی اپنے بھائی کے ساتھ ہی گزری مگر مجھے طے ہوئی ہیں سر بھی بہن کی باتوں میں آ جاتے ہیں لیکن بابا بنی! آج تو یہ ہے کہ بہت وقت گزر گیا ہے اب تو میرے مگر والے بنی پریشان ہوئے ہیں۔ آپ اکثر تعویذ دکر کہتے ہیں مجھے بنی ارسال کر دیں۔

☆ بنی مکی! خوش فہم آ باد رہو۔ تعویذ میں ضرور تیار کروں گا مگر اس کے لیے مجھے تفصیل درکار ہے۔ رات اور ناری والہ کا نام شوہر اور شوہر کی والدہ کا نام میرا تار تار بنی ارسال کر دو۔ جوانی لٹانے پر واضح اور صاف پتہ لکھو تاکہ جواب تمہیں بھیجا سکے۔

□ زب اب۔ کراچی۔
□ بابا بنی! میں نے پہلے بھی آپ کو کوئی بار اس مسئلے کے لیے خط لکھا اب پھر لکھ رہی ہوں۔ میں ایک لڑکے کو بہت چاہتی ہوں وہ بھی مجھے بہت چاہتا ہے مگر شادی نہیں کرتا۔ ہماری جیت کو 5 سال ہو چکے ہیں دونوں خاندانوں میں تقریباً تمام بڑے سے بات جانتے ہیں۔ بابا بنی! اگر میری اس سے شادی نہیں ہوتی تو میں مر جاؤں گی۔ سلیز۔ آپ اللہ والے ہیں کچھ کریں۔

☆ بنی باب! ایک شخص تم سے محبت کرتا ہے مگر اپنا نام نہیں چاہتا یہ کیسی محبت ہے؟ تمہیں اس

بات کا احساس ہی نہیں کہ وہ تمہیں صرف بدنام کر رہا ہے۔ غلط باتیں کر رہا ہے۔ اب بھی وقت ہے اپنا راستہ بدل لو۔ اپنے والدین سے محبت کرو بہن بہنیں سے محبت کرو اللہ اور اس کے نبی سے محبت کرو۔ کامیاب رہو گی۔ نماز یا پبندی سے پڑھا کرو اور آیت الکرسی پڑھ کر اپنے اور ضرور دم کرو تاکہ شیطان سے محفوظ رہو۔ کوکم پر صرف شیطان حادی ہے اور کچھ نہیں۔ اللہ تمہیں محفوظ رکھے۔

□ تنزیلہ اہم۔ خانیوال۔
□ بابا جان! میں سیکڑائز میں پڑھتی ہوں پچھلے 3 سال سے امتحان پاس نہیں کر پارہ ہوں چاہے کتنی محنت کروں انگریزی کے سبب میں قیل ہو جاتی ہوں۔ آپ مجھے تعویذ دے دیں تاکہ میں پاس ہو جاؤں۔ سب لوگ بہت مذاق اڑاتے ہیں۔

☆ بنی تنزیلہ! تعویذ کے بجائے تم کسی ایسے استاد سے پڑھو۔ تمہیں درست سمت میں محنت کی ضرورت ہے۔ خوب دل لگا کر محنت کرو گی تو ضرور کامیاب ہو جاؤ گی۔ کثرت زب زب دلی عطا پڑھا کرو۔ یا وضو پا کر اور اللہ سے کامیابی کی دُعا کرو۔ انشاء اللہ ضرور کامیابی عطا ہوگی۔

□ مجاہدین۔ لاہور۔
□ بابا سائیں! میں صرف آپ کے کالم کی وجہ سے ”جی کائنات“ خریتا ہوں حالانکہ یہ امر ہمارے شہر میں بہت مشکل سے ملتا ہے۔ بابا سائیں! میرا مسئلہ بڑا عین ہے۔ کاروباری معاملات بہت خراب ہو رہے ہیں بہت نقصان اٹھا چکا ہوں۔ جس شخص کے ساتھ کاروبار کرتا ہوں وہ دھوکہ دیتا ہے۔ سوچ سوچ کر پریشان ہو گیا ہوں جتا ہے کیا کریں؟

☆ بنی مجاہد! اللہ تمہارے حق میں بہتر فیصلہ فرمائے۔ نماز کی پبندی رکھو اور درویش بہت

پڑھو۔ پریشان مت ہوا اللہ سب بہتر کرے گا۔ جب رزق میں بندش محسوس ہونے لگے تو اللہ کے بندوں کو اپنے ساتھ کھانے میں شامل کر لیا کرو اور رزق دائر ہو جائے گا۔ یہ انتہائی سہل طریقہ ہے اور اللہ کی نظر میں بہت محبوب بھی۔ تم کوشش کیا کرو کہ کثرت یاوالی کا اور دیکر کہ مدت 21 روز ہے۔

□ شائستہ زمان۔ پٹنہ۔
□ بابا بنی! میں بہت پریشان ہوں مجھے کسی نے آپ کا بتایا تو آپ کو کوٹوالہ بھی ہوں۔ اللہ کرے یہ آپ کو مل جائے۔ بابا بنی! میں اپنی شادی کے 2 ماہ بعد ہی بیوہ ہوئی۔ میرا خاندان کراچی میں گاؤں کا کام کرتا تھا کسی نے اس کو کوئی رادی۔ میں 6 ماہ بعد بہت تلاش کرنے کے بعد پڑ چلا کہ اس کو لاوارث۔ جان کر فتن بھی کر دیا۔ آپ مجھ کتنے ہوں کہ مجھ پر کیا کریں گی۔ میرے ساس سسر بہت بوڑھے ہیں۔ اس سے پہلے ان کا راز بھی کراچی میں بازار چا چکا تھا۔ یہی اپنے بھوپوں کے ساتھ رہ رہی اب بھوپوں بیوہ ہو گئی کوئی کسانے والا بھی نہیں۔ جب تک شوہر لا پڑے تا تک امید بھی کہ شاید واپس آ جائے مگر اب تو وہ بھی ختم ہوئی۔ بابا بنی! مجھ ایسا بڑھنے کو دیں جس کے پڑھنے سے بھوک نہ لگے۔ ہم کسی کے آگے ہاتھ نہیں پھیلا سکتے اور اب تو لوگ جب تک جنازہ دیں دھندھی نہیں کرتے۔ میرے ساس سسر بہت بڑے ہیں۔ میں انہی کے ساتھ رہتی ہوں۔ چھوڑ کر جا بھی نہیں سکتی۔ میرے شوہر کے والدین ہیں۔ کیسے چھوڑ دوں؟ آپ بہت نیک انسان ہیں۔ میرے لکھے کو کم جائیں اور میرے حال پر رحم فرمائیں۔

☆ بنی شائستہ! تمہارا خط پڑھ کر بہت دکھ ہوا۔ اللہ تمہارے شوہر کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے اور اس نامدانا کو میر جمل عطا فرمائے۔ بنی!

اللہ سے مدد مانگو وہ ہی اسباب پیدا کرتا ہے۔ یقین رکھو! اسباب کا پس ہمت اور مستقل مزاجی رکھو۔ نماز کی پابندی رکھو اور آہستہ کر کے کابہت ورد کیا کرو اول آن کر دو روضہ شریف کے ساتھ۔ مجھے حالات سے آگاہ رکھو۔

رانا کا مرن۔ جنگ۔

☆ بیٹے رانا! ہم بہت جلد بازی کا مظاہرہ کر رہے ہو نقصان اٹھاؤ گے۔ بحث برائے بحث نقصان دہ ہوتی ہے۔ تم بڑے بیٹے ہو مجھیں معلومت سے کام لینا ہوگا۔ اپنے اندر بردباری پیدا کرو۔ نماز کی پابندی رکھو اور روضہ شریف بہت پر محو۔ صحت استطاعت مقررہ خیرات بہت کیا کرو۔ استغفار بہت پر محو ضرور کر م ہوگا۔

□ فقہا۔ اسلام آباد۔

بابا جان! میری شادی کو 4 سال ہو گئے ہیں۔ ایک دفعہ مجی امید نہیں بندھی۔ سرال والوں نے میرا جینا سمجھ کر دیا ہے میرے شوہر تو سید سے منہ بات ہی نہیں کرتے۔ بابا جان! میں بہت پریشان ہوں۔ تندوں کے بیٹے جب آتے ہیں تو میں منہ چپانے پھرتی ہوں۔ زندگی بہت مشکل ہو رہی ہے۔ میری ہر اچھائی ان کی وجہ سے مفر ہو رہی ہے۔ میں ہر وقت سوچتی رہتی ہوں صحت بھی خراب ہو رہی ہے۔ اپنے گھر والوں کو سرال والوں کے رویے کے بارے میں بتا بھی نہیں سکتی۔ پلیز مجھے تعویذ دے دیں میں بہت پریشان ہوں۔

☆ بیٹی! فقہا! اللہ پر بھروسہ رکھو وہاں ہمت مہربان آقا ہے۔ میں نہیں ضرور کوئی دے دوں گا۔ مجھے تفصیل ارسال کرو۔ صرف ایک ایک کہوں گا کہ جب اللہ پاک تمہیں اولاد سے نواز دے تب ان تمام لوگوں کو معاف کر دینا جنہوں نے مشکل وقت میں تمہارا کیا تھا۔

□ رحمان سید۔ کرک۔

☆ بیٹے رحمان! مجھے تفصیل سے خط لکھو اور لال روشناسی سے مت لکھا کر مجھے پڑنے میں بہت تکلیف ہوتی ہے۔

☆ سلیٰ رضوان۔ بہاول پور۔

o بابا جان! میری عمر اس وقت 44 سال ہے ساری زندگی والدین کے گھر پر ہی ان کی خدمت کی ان کی ہر بات مانی، چھوٹے بہن بھائیوں کا بہت خیال رکھا، اپنی حیثیت کے مطابق ان کی شادیوں میں بھی ساتھ دیا۔ میرا کوئی اسکول میں پڑھائی ہوں لہذا جب جب گھر کو ضرورت ہوتی تو میں نے مادی مدد بھی کی لیکن رکھ اس بات کا ہے کہ جب سے گھر میں داماد اور بیوی آئی ہیں میری حیثیت میں بہت فرق آ گیا ہے۔ والدین بھی انہی کو بہت اہمیت دیتے ہیں۔ بعض اوقات زیادتی بھی کر جاتے ہیں۔ میں اب بہت افسردہ رہتی ہوں مجھے اپنا آپ بہت بے رحموں ہوتا ہے۔ دل ہر وقت رونے کو جاتا ہے کیا کروں؟

☆ بیٹی! سلیٰ! اللہ تمہیں ڈھیروں خوشیاں عطا فرمائے۔ والدین کی خدمت کی تو اس کا صلہ تمہیں اللہ دے گا۔ بندوں سے کیوں صلہ جاتی ہو؟ بہن بھائیوں سے شفقت کا رو رکھا اس کا اجر بھی اللہ سے آگے ہوگی مت ہو تم کو ٹھکر کی بیوی ہو مگر داماد رہو بیویاں ہر سے آتے ہیں ان کابہت خیال رکھنا ہوتا ہے۔ رشتہ رشتہ وہ بھی گھر کے فردن جاتے ہیں۔ ہر چیز کو وقت دینا چاہیے۔ تم نماز کی پابندی رکھو۔ روضہ شریف بہت پر محو۔ نماز فجر کے بعد ایک بار سورۃ کرم پر چھوڑ دو عاکرو۔ مدت ایک ماہ ہے۔

□ بیٹی۔ کراچی۔

☆ بیٹی! تمہارے حالات ایک عرصے سے دیکھ رہا ہوں۔ دو کا کہوں کہ اللہ شہب پر رحم کرے۔ پتہ

نہیں لوگ یہ کیوں نہیں سمجھتے کہ اسلئے سید سے ملیا کر کے دوسروں کو دینا میں تو تکلیف اور درد دے سکتے ہیں لیکن آخرت میں وہ کیا کریں گے کیا حشر ہوگا؟ یہ حال تم سورۃ ناس اور سورۃ قلقل بہت پڑھا کرو۔ کچھ نہ کچھ تم ضرور خیرات کیا کرو۔ دعا کیا کرو کہ اللہ تم سب کو شیطان اور شیطان جیسے لوگوں کے شر سے محفوظ کرے۔ (آمین)

□ راحت جہاں۔ ساہیوال۔

o بابا جان! بڑی مشکل سے آپ کو خط لکھتے ہیں پھر بے یقینی سے بچے کا انتظار کرتے ہیں اور اس وقت براؤدکھ ہوتا ہے جب رسالے میں جواب نہیں ہوتا۔ بابا جان! میری عمر ایک لوگ ہیں اس لیے آپ بھی دعا کریں پڑھائیں کہ جسے حالات خراب ہیں کہ بتا بھی نہیں سکتی۔ ایک وقت روکی روئی کھاتے ہیں۔ بچے ترستے رہتے ہیں۔ میرے شوہر کا تھکا راسٹین میں آ کر کٹ گیا! وہ بے روزگار ہے۔ بچے چھوٹے ہیں سمجھ نہیں آتا کیا کروں؟ میری بڑی بہن چوری چوری کچھ مدد کر دیتی ہے اس شوہر بڑا خراب ہے ہم سے ملنا چاہتا نہیں کرتا۔ غریب سے کوئی بھی ملنا پسند نہیں کرتا۔ بتائیں میں کیا کروں؟

☆ بیٹی! راحت! ہم نے کیسے سوچ لیا کہ میں تمہیں جواب دیتا نہیں چاہتا بیٹی! اچھا بعض اوقات مجھ تک پہنچتے ہیں نہیں۔ میری کوشش ہوتی ہے کہ زیادہ سے زیادہ غلطی کے جواب دے دوں۔ بہر حال ہمت رکھنا اللہ سے مدد کی طلب گار رہو وہ تمہاں مہربان آقا ہے۔ لوگوں سے کبھی امید مت رکھنا وہ اللہ کے بہت پسندیدہ بندے ہوتے ہیں جو جتنی کی مدد کرتے ہیں اور اس طرح کہ کسی کو بھی پتہ نہ چلے تم نماز پابندی سے ادا کیا کرو۔ ہر نماز کے بعد یا جامعہ کابہت ورد کیا کرو کوشش کرو کہ چڑیوں کو

باجہر ضرور ادا دیا کرو۔ میں بھی لکھ دے گا کہوں گا۔ مجھے حالات سے آگاہ رکھو۔ بچوں اور ہرے کو ہوا نماز و افق کار دیا کریں کر م ہوگا۔

□ فرزانہ۔ لاہور۔

o بابا جان! میری عمر سے پہلے آپ سے رابطہ ہوا تھا کچھ کھیلو مسائل تھے۔ اللہ کا شکر ہے وہ مل ہو گئے پھر میں اپنے شوہر کے ساتھ سعودی عرب چلی گئی۔ دو سال پہلے میں بچوں کے ساتھ واپس آئی۔ بچے یہاں پڑھائی کر رہے ہیں۔ چشموں میں ہم لوگ سعودی عرب چلے جاتے ہیں۔ بابا جان! مسئلہ یہ ہے کہ یہاں میرے کمرش میرے ساتھ میری والدہ راضی ہیں۔ مہمانوں کا آنا جانا ہوتا ہے۔ ہماری کاسب رشتے دار بھی ہیں۔ کچھ دن قبل میرے کمرے کی الماری سے میرا کپڑا ہماری ہوسنے کا سیٹ غائب ہو گیا۔ بہت تلاش کیا۔ جہاں سے زیور غائب ہوا وہاں پیسے بھی رکھے تھے وہ دے دیے ہی تھے بس سیٹ غائب تھا میں بہت پریشان ہوں شوہر کو بتاؤں گی تو وہ بہت ناراض ہوں گے۔ بابا جان! مجھے معلوم کر کے بتائیں کہ زیور کس نے غائب کیا ہے؟ ماسی سے میں اپنے سامنے کام ختم کروائی ہوں کسی پر بھی شک نہیں بہت پریشان ہوں۔

☆ بیٹی! فرزانہ! پہلے تو ابھی طرح تلاش کرو۔ اگر زور دیکھ میں کبھی ہو تو وہاں جا کر بھی دیکھو بعض اوقات انسان بھول جاتا ہے۔ اس کے علاوہ مجھے اپنے بچوں کی عمریں اور نام تحریر کرو۔ نے یہ بھی نہیں بتایا کہ زیور کسے روز پہلے غائب ہوا تھا؟ بکثرت پڑھو اناللہ وانا الیہ راجعون۔ انشاء اللہ ضرور کر م ہوگا۔

□ صوفی رحمان۔ Hyd۔

o بابا جان! اللہ آپ کو خوش رکھے۔ میرا مسئلہ بہت سنگین ہے۔ میں ایک لڑکے سے بیاہر گئی

خیال تواریح کی کہانیاں کے قارئین اور نگارین کی توجہ کو خلیل کا نگاہ بصورت تحریر

اللہ جانے

لمیہ میر

رات کے تقریباً 10 بج رہے تھے۔ میں اگلے دن ہونے والے پہلے کی تیاری میں مصروف تھی کہ چاکر میرے سوہاگل کی کچ توں بجی۔ کچ میری دوست کا تھا کہ لینڈ جلدی سے نوزخ چمک لگاؤ۔ میں نے ایک لمحہ ضائع کیے بغیر دی کھولا تو دیکھا وہی ہمارا دلدادہ لکھنؤ اور قاتل رنگ کی خیریں چل رہی تھیں جو میرا لکھنؤ بھیڑی ہوئے کا عندیہ دے رہی تھیں۔ یہ آج کل روز کا منظر تھا ہوا ہے۔ گزشتہ ایک ہفتے سے کراچی میں معمولات زندگی معطل رہے۔ ان ہی حادثات و واقعات کی بنا پر ایک سب سے دوبرے پستوی ہو گئے ہیں اور اب یہی سوج میری پریشانی میں اضافہ کر رہی تھی کہ کم لوگ سمت جا رہے ہیں؟ ہمارا ملک ایک اسلامی ملک ہے جسے ہم نے اسلام کے نام پر حاصل کیا ہے جہاں ہمیں نہ صرف مذہبی آزادی حاصل ہو بلکہ اللہ پروردگار ہمت کا فیصلہ کرنے کا بھی اختیار ہو۔ ہم پر سکون ماحول میں تعلیم حاصل کر سکیں۔ ہمیں حسبِ مشائش حاصل ہوا اور ہم مرضی کا طرز زندگی بسر کر سکیں گے کیا ہے؟ پاکستان اپنے قیام کے وقت سے بلکہ ہمارے پہلے ہی انتہائی پیچیدہ مسائل کا شکار رہا ہے۔ آج 64 برس کا پاکستان اپنے پیروں پر کھڑا ہے اور کسی سہارے کا منتظر ہے۔ بھیجی یہ امریکہ کی طرف دیکھتا ہے تو بھیجی چین کی طرف..... میں اللہ کی طرف نہیں دیکھتا جس کے نام پر بتا ہے۔ شروع سے لے کر آج تک پاکستان کے تمام حکمران مصلحت اور سمجھوتوں کا شکار رہے ہیں۔ یہی وہ سمجھوتے ہیں جو قوم کے وسیع تر مفاد کے نام پر قوم کا گلہ کھوٹنے جا رہے ہیں۔ کراچی ملحقین اور سمجھوتوں اور قوم کے وسیع تر مفاد کا سب سے بڑا شکار ہے۔ یہاں ہنسے والی محفل تو نہیں اپنے لیے کو مضبوط بنانا چاہتی ہیں اور یہی سیاسی منافات عوام کی بھڑکی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہیں۔ یہ ملکوں کے تعلیمی سال تباہ ہو رہے ہیں۔ آئے دن کے ہتھیاری انتقامات ظالموں کے مستقبل سے اپنی اس دے ہیں۔ اللہ جانے ہم اس بھنور سے کب نکلیں گے؟ کیا بھیجی ہم ہمارے نکلیں پر سکون پاکستان دیکھیں گی؟ اللہ جانے.....!

یقین اور امید

ملک مندر عباس اعوان خانواد

جس طرح موسم بدلنے کا ایک وقت مقرر ہوتا ہے اسی طرح وقت کے بدلنے کا بھی ایک موسم ہوتا ہے۔ حالات بدل رہے ہیں حالات کے ساتھ حالت بھی بدل جاتی ہے۔ رات آجائے تو نیند بھی نہیں سے آئی ہوتی ہے۔ وہ انسان کا سیاق ہوتا ہے جس نے انتہائی کاریگریوں میں امید کا چراغ روشن رکھا اور امید اس خوش کام ہے جس کے انتظار میں تم کے ایام بھی گت جاتے ہیں۔ امید کی واقعہ کام نہیں ہے تو صرف مزاج کی ایک بات ہے قدرت کے مہربان ہونے پر یقین کا نام امید ہے۔ بقول ناصر کاظمی

دستِ اجماعی آئے گا ناصر
غم نہ کر زندگی پڑی ہے امی

ہوں وہ ہماری برادری کا بھی ہے۔ میرے والدین اور بھائی اور لڑکے کے گھر والوں کو کوئی اعتراض نہیں۔ وہ نرم کرنا چاہتے ہیں میرے گھر سے بھولی اس رشتے کے خلاف ہیں حالانکہ وہ اس لڑکے کے اچھے دوستوں میں ہیں لیکن بہن کے ذریعے میرے والدین کو کھلوا دیا ہے کہ اگر شادی کی تو میں اپنی بیوی کو طلاق دے دوں گا۔ ہم سب لوگ بہت پریشان ہیں۔

☆ بی بی صوفی!

☆ بی بی نعیم.....! اللہ تمہیں کامیابی عطا فرمائے۔ نماز کی باندی رکھو اور درویشی بھرت پرھو۔ نماز فجر اور عشاء کے بعد 7-7 سجدہ زب۔ زندگی عسلی کا پرھو اور عمار کو بہار منہ دے۔ سات بار درمزد رکھ لیا کرو۔ مدت 40 روز ہے۔

○ جن دادو۔

○ بابائی! السلام علیکم! امید ہے کہ آپ میرے خرمیت سے ہوں گے۔ میرا ایک بہت بڑا مسئلہ ہے وہ یہ کہ میری بی بی ایک بچی کے سوا کوئی اولاد نہیں۔ میں بڑھا کھائیں ہوں اور یہی خطہ میں کسی دوسرے سے لکھو اور ہوں جب ناکہ آپ ”چچی کہانیاں“ میں لوگوں کے مسئلے کرتے ہیں تو سوچا میں بھی اپنا مسئلہ آپ کو بتا دوں۔ میری شادی کو بہت عرصہ ہو چکا ہے۔ آپ ہم پر احسان کر کے تعویذ دیں کہ بیٹا ہو جائے اور ہم کو یہ بھی بتائیں کہ آپ سے تعویذ کیسے حاصل کریں؟ ہم کو تو آپ کا ایڈریس بھی معلوم نہیں۔ میں آپ اپنے کرم سے ہمیں کوئی آسان وظیفہ بتائیں اور ایسی تعویذ بھی دیں کہ ہمارا مسئلہ ہو جائے۔ میں آپ کی بڑی مہربانی ہوگی۔ میں آپ کو ہمیشہ دعاؤں میں دیتا ہوں گا۔

☆ بی بی جن.....! اللہ تمہاری حاجت قبول فرمائے۔ تم مجھے جوانی لگانے پر واضح بات لکھ کر خط ارسال کرو تا کہ میں تمہیں تعویذ لینے کا طریقہ بتا سکوں۔ خط میں اپنا نام و والدہ اور بیوی کا بھی مل نام لکھو۔

☆ بی بی جن.....! اللہ تمہاری حاجت قبول فرمائے۔ تم مجھے جوانی لگانے پر واضح بات لکھ کر خط ارسال کرو تا کہ میں تمہیں تعویذ لینے کا طریقہ بتا سکوں۔ خط میں اپنا نام و والدہ اور بیوی کا بھی مل نام لکھو۔

○ بی بی نعیم! السلام علیکم! امید ہے کہ آپ

اس دنیا اور اس معاشرے میں کوئی چشمرات کرتا ہے تو لوگ کہتے ہیں۔ ”کے مال باپ ہیں جو یہ ورل کی ہے؟“ ماں کا پیلے آٹے ہانگل اسی طرح کوئی چٹا اگر اچھا کر جاتا ہے تو لوگ کہتے ہیں۔ ”کیا بیٹے مال باپ کی اولاد ہوگی۔“ ماں کا نام پیلے اور باپ کا نام بعد میں آتا ہے۔ میں نے اس بات پر بہت سوچا اور دیکھا کہ کیا بات ہے اولاد کی پرورش میں ماں اور باپ شانہ بہ شانہ ہوتے ہیں دونوں مل کر اولاد کو پروان چڑھاتے ہیں لیکن جب نمبر دینے کی باری آتی ہے تو اس کو ترجیح دی جاتی ہے اور بے پارے سے باپ کو دوسرے نمبر پر رکھا کر دیا جاتا ہے دیکھا جائے تو ماں کی عظمت کے مقابلے میں باپ بھی کچھ کم تر نہیں رکھتا۔ بچوں کی پرورش میں باپ ماں سے زیادہ محنت و مشقت کرتا ہے۔ صبح جگنے سے لے کر سوتے لگنے کے روز کی کالے کے لیے جا بے ہر

میں درد ہوا جسم تو رہا وہ بخار یا شہر کے حالات خراب ہوں یا ہوش و حواس کیسے ہی حالات کیوں نہ ہوں اس کا کام کرنا ہے۔ حم و دردی کے لیے لگتا ہے۔ وہ سارا دن کام و فوضے میں ڈھاک میں ڈھاک کرتا ہے کوئی کام لے جائے تاکہ میرے بچے بھوکے نہ سوئیں۔ صرف یہ ہی نہیں بچوں کے بہتر مستقبل کے لیے چوری کرتا ہے رشوت لینے پر گریں کرتا ہے پیرا پھری کرتا ہے شریک ہر چھاپا کر کا پی باری اولاد کے لیے کرتا ہے۔ اسے علم ہے کہ وہ جو برا کام کر رہا ہے وہ غلط اور گناہ ہے لیکن اولاد کی محبت میں یہ پاگل باپ گناہ کرنے سے بھی نہیں چونکا۔ اتنا سب کچھ کرنے کے بعد بھی محنت اور محبت سے پروان چڑھنے والے بچے وقت پڑنے پر ان کا غیبت ساتھ دیتے ہیں شوہر کی وجہ سے اپنی بیوی کو طلاق دیتا ہے تو اس وقت میں اس کا ساتھ دیتے ہیں۔ اسی طرح اگر بیوی طلع لیتی ہے تو بھی سچے اس کا ہی ساتھ دیتے ہیں۔ باپ اگر دوسری شادی کر لیتا ہے تو بھی اولاد کی مال کا ہی ساتھ دیتی ہے۔ اگر شوہر اور بیوی میں لڑائی ہو جائے اور بچوں کو ملوم بھی ہوتا ہے کہ کس میں غلطی کی مال کی ہے پھر بھی اس کی حمایت لیتے ہیں۔ ایسے تمام مواقع پر باپ کی شفقت کو قبول جاتے ہیں۔ کسی مقصد پر ہے کہ باپ کا بھی بھوت ہی اس مرد ہوتا ہے۔ ترب و ذوال لیل نے فرمایا کہ مال ہی طرف سے ملتا

تھوہ۔ ہاں کے قدموں سے جنت ہے لیکن اللہ پاک یہ بھی فرما رہا ہے کہ باپ کی ناراضگی اللہ تعالیٰ کی ناراضگی ہے۔ باپ کو احرام کا رعب عطا کیا گیا ہے۔ اگر مال اولاد کی خاطر اپنی راتوں کی تیندہ پر باکری ہے تو باپ اتنا دیا چھین اور کون غارت کرتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ مال گھر کی روٹی ہے تو اس گھر کا چھرا باپ ہے کسی نے کہا کہ مال شغل کا دلش پھول ہے تو میں کہتا ہوں پھول شغل جس شغل پر ہے وہ درخت باپ ہے۔ مال کی تخلیق میں محبت اور مہربانی کا خمیر شامل ہے تو باپ بہت شفقت اور محنت کا مجموعہ ہے۔ مال کا دل اتنا وسیع ہے کہ اس میں کائنات سما جاتی ہے۔ میں کہتا ہوں کہ باپ کا دل اتنا بڑا ہے کہ وہ کائنات کا ہر دکھ اور غم اپنے اندر سمیٹ لیتا ہے۔ میرے سامان چند الفاظ کا مقصد یہ ہے کہ میں آج تکوں کو والد کی کیا اہمیت ہے۔

کیا ہم نے بھی سوچا ہے کہ ہمارا فقی کون اور حقی خوشیاں کیوں درد چلی گی ہیں؟ ہمارے رزق میں ہر کم کیوں نہیں رہی؟ کیونکہ ہم نماز سے گریز ہیں۔ بہت معروف زندگی ہے ہماری انجیب ہے ہمارے پاس تو کے لیے وقت نہیں؟ تلاوت قرآن مجید کرنا ہم نے ترک کر دیا ہے۔ فضول شغل کے لڑچکر تو سارا دن پڑھتے رہتے

مل گھر قرآن مجید سے دور بھاگتے ہیں۔ والدین کا احرام نہیں کرتے۔ انہیں بوجھ سمجھتے ہیں۔ نافرمانی کو ہم نے مول بنا لیا ہے۔ بزرگ میں ملاوٹ یا پھر سبب ایمانی کرتے ہیں۔ دوسرے مسلمان ایمانی کو دھوکہ دینے کا سونپتے ہے ہیں اور لوگین فرصت میں یہ کام فرض سمجھ کر کرتے ہیں۔ اسلام سے دوری اللہ اور اس کے رسول کے فرمان سے دور گردانی کریں گے تو غم کس کس مصیبت اور پریشانی میں مبتلا نہ ہوں گے؟ آج بے بدلے خدا کے حضور ہر کم کے ستر سے ایمان واری اور فرض شامی سے زندگی گزارنے کا عہد کریں۔ دیکھو ہر ایمان کو چھوڑ کر مڑا ستریم جو میں تاکہ اللہ کی رحمت اور رحمت خدا کی دُعا عاقل سے کھل یاب ہوں پھر ہمارے پاس ناکی خوشیاں اور بل کھولنی زندگی کے لحاظ تھیں ہوں گے۔

اگرچہ ”دوست“ چار حرفوں کا مجموعہ ہے پر اس کی وسعت اور گہرائی کو جاننا ناممکن ہے کیونکہ اس کی گہرائی سمندر ہے اور اوپر آسمان کی عظمت آسمان سے بھی بلند ہوا ہے۔ رشتے تو سارے ہی عقلم ہوتے ہیں لیکن دوست کا شوق عقلم کے ساتھ ساتھ انسانی ناک و مکی ہوتا ہے جو بلکی کی جوت سے ریزہ ریزہ ہو جاتا ہے تو سترے وقت اس رشتے کا دل اجڑا نہیں نہیں۔ جب احساس ہوتا ہے اس وقت تک بہت دور ہو چکی ہوتی ہے ماری زندگی کا پچھتاوا بن جاتا ہے اور پھر آگے بڑھنے کی جوت میں جھٹکا ملتا لیکن ہو جاتا ہے۔ میں نے بھی بہت سے دوست بنائے تھے اس کے دوستوں کے پچھلے زندگی اور حرجی کے لطف سے بہت دوست بن گئے تھے۔ دوستوں کو وقت سے بدل دیا۔ میرے منہ کی کے ساتھ ساتھ، ہم پچھلے جنتی کے شب و روز گزرتے گئے۔ کچھ دوستوں کو وقت سے بدل دیا۔ میرے منہ کی اور کچھ دوستوں سے میری انانے لے کر دیاب میں سوچا ہوں جو میں نے دوستوں کے ساتھ وقت گزارا وہ فراموش نہ تھا۔ وہ پھر مسرت یا نہیں یاد آتی ہیں۔ اگرچہ آج ہم دونوں ایک دوسرے کی ناپس تو ہمارے پاس فطرت کا یہ قانون ہے کہ کوئی چیز ایک ہی جگہ قائم نہیں رہتی نہ جانی ہر ایک کے مقدر میں ہوتی ہے۔

زندگی کی مثال سڑکی طرح ہے۔ اس رشتہ پر ہر انسان ایک مسافر ہے یہ مسافر یا خوشحال و زاو ہے۔ ہر کے اپنے اختیار میں ہے کہ وہ زندگی کے اصول مسر کے لیے کوئی بھی راہ اختیار کرے۔ قلاخ کی وہ راہ جو سب میں نے دکھائی اس راہ پر مسر کرنے والے مسافروں کی آسانی کے لیے روٹ کتاب عطا فرمائی وہ وہاں خود ب جس کی حفاظت اس ذات باک کے ہاتھوں میں ہے جس سے بڑا محافظ کوئی نہیں۔ مسافروں کی تخریب و تاراج کے لیے اس رحمن و رحیم ترپ نے اپنی کتاب کا مکی نمونہ نبی اخرا لیا ہے۔ صورت میں دنیا کے لیے ہمارا کچھ بچا جا کر قلاخ کی راہ اختیار کرنے والے یہ مسافر مسر کے مشکل مرحلے میں آتے یہ رہنمائی حاصل میں اور اس مسر کی تمام منازل خوش اسلوبی سے لے کر کے مل منزل پر کار نامہ پچھیں۔ آج مسر کرے یہ اپنی منزل کو فراموش کر بیٹھے ہیں اس عارضی مسافر کا وہ مستقبل سمجھنے والے دان مسافر گہری تاری میں کی لیے آج بے کونی اور افرافریزی ہے یقیناً یہ ان فطری قوانین سے دوری کی وجہ سے ہے جو اللہ کی کتاب میں خود ہیں۔ ترب کائنات کی یہ مقدس کتاب ہمارے اس مسر کی آسانی اور کامیابی کے لیے نازل کی گئی ہے۔ مسر نے ہم یہ کتاب پڑھ ضرور دیں پڑھ جانتے ہیں نہیں ہم نے کیا پڑھا؟ کتاب نے کیا بتایا؟ بے شک

خواب کی موجودگی کا پورا یقین ہے اس کے یہاں کسی میلان یا رجحان کی کا ڈر نہائی نظر نہیں آتی لیکن غزل اپنے آداب و انداز اور اسلوب کے ساتھ جی ہے۔

یہیں خواب دیکھنے کا ہنر مستقل جاننے سے آیا ہے وادرات حسن و عشق، ہجر وصال کا دلگداز بیان اس کی غزل میں جا بجا نظر آتا ہے۔

تیری آواز سن کر سوچتے ہیں کبھی ہوتا تھا یہ لہجہ ہمارا

سادہ الفاظ و دلکش تشبیہات مانوس استعاروں میں زندگی سے جڑے تمام تر مسائل کا کشی نے تاثیر اور تاثر کی نقاشیں بیان کیا ہے۔ یہ نغفا قاری کو دیر تک اپنی گرفت میں رکھتی ہے۔ سوز و گداز سادگی و اثر آفرینی تازہ کاری فکری و نفسی میلانات کی نمائندہ اس کی غزل عہد موجود میں جتنی ہوئی انداز کی نو حد گیری کی خواہش کے تقاضوں پر مرکوز نظر آتی ہے۔ عصری حیاتی شعور نے اسے ایک اور قدم کدے سے وابستہ کر دیا ہے جس میں اس کو ہمانے کے ساتھ ساتھ اقتدار کے موتی رلنے کی زبان کا کاری کا احساس اس کی نازک خیالی کے آئینے کو چکنا چور کر رہا ہے۔

سڑکوں پہ جس کی عمر کتنی وہ بکھر گیا اچھا وہی رہا جو سرشام گھر گیا اس دُش کے طفیل ہی بھرتا ہے اپنا ہیٹ بھوکے ہی مر رہی ہیں گے جو یہ دُش بکھر گیا

کاشی کی غزلیات میں فنِ تغزل اور بیہودہ بات چندی کے ساتھ گلو اور گرا کاشی اظہار موجود ہے۔ روحانی کیفیات کے اظہار میں جو اشعار اس مجموعہ

کلام میں ملتے ہیں اُن میں سلاست، برکتی روانی اور تازگی ہے۔

ترے اطراف آوازیں ہیں تیری مرے اطراف سناٹا ہے مرا حال کیا پوچھتے ہو حال مرا میرے چہرے پہ یہ دُش ہے میاں

تم کسی بھول میں نہیں رہتا یہ کبھی دُش میرے اپنے تیں

روشن حسین صبح کی ایک شام ہونا چاہیے کچھ اور اسے عشق کا انجام ہونا چاہیے "اور تم" کی غزلیات میں زندگی اور محبت سے جڑے مسائل اور ان مسائل سے پیدا ہونے والے جذبات اور احساسات موجزن ملتے ہیں۔ کاشی چوہان کی غزل ایک شفاف آئینہ کی شکل ہے جس میں معاشرے اور زندگی کا کس صاف نظر آتا ہے۔ اُس نے کاشی شاعری نہیں کی بلکہ زندگی کو سمجھ کر اس کی تعمیر پیش کی ہے۔ ابہام سے اس کی شاعری کو سول دور ہے۔

راستوں کا نصیب ہوتے ہیں کچھ مسافر عجیب ہوتے ہیں جن سے ملتا نہیں ہے دل اپنا کیوں ہمارے قریب ہوتے ہیں؟ کاروبار میں فرصتوں کے بل کب کسی کو نصیب ہوتے ہیں "اور تم" کے مطالعے سے ایک بات تو واضح ہوگی کہ کاشی کی تمام شاعری ویدیکی اور ابہام سے

یاک ہے سادہ، سلیس اور عام فہم الفاظ کا استعمال کیا گیا ہے۔

کاشی کی غزل میں داستانِ حسن و عشق کے ساتھ ساتھ آشوب و زمانہ اور سیاسی و سماجی حالات کی شکست و ریخت بھی دیکھنے کو ملتی ہے۔ گہرے مشاہدات اور ذوقی تجربات کا کس اُس کی شاعری کا حسن ہے۔

اب اور کیا ہے مرے پاس جو تمہیں سوچوں تمہارے نام تو کر دی ہے ہر خوشی میں نے مری کتاب ہے کاشی کتاب اہل نظر ورق ورق پر بکھیری ہے روشنی میں نے کاشی کے اشعار میں تاثیر ہے اور یہ تاثیر چٹائی کے اظہار پر پیدا ہوئی ہے۔ بکھا وہ ہے کہ اس کی شاعری عام و خاص کے دل پر اثر انداز ہوئی ہے۔

سارے موسم اُسی کے موسم ہیں دھوپ اُسی کی سحر اسی کا ہے اب وہ دل میں رہے نہ رہے یہ ٹھکانہ گھر اُسی کا ہے

خامشی توڑنا ضروری ہے اب مرا بولنا ضروری ہے منز میں مل ہی جائیں گی کاشی پر کوئی راستہ ضروری ہے

کاشی کے لوازمات شاعری عام فہم اور اشعار اند حسن سے آراستہ ہیں۔ اُس کی شاعری میں زندگی متحرک نظر آتی ہے۔ اُس کی سوجھیں عصر حاضر کی آہ و ہوا میں پنپ رہی ہیں۔ وہ جس عہد میں سانس لے رہا ہے وہ اُس کے آئینہ شاعری میں بالکل واضح نظر آتا ہے۔ اُس کی شاعری وجدانی

شاعری ہے اور پوری طرح شعریت کے آب رنگ سے عزیں ہے۔

کفر کے شہر میں ایمان کبھی تم نے دیکھا بھی ہے انسان کبھی اس میں اب جان بھی جا سکتی ہے عشق ہوتا نہیں آسان کبھی

عصری زندگی کا نہایت ہی گہرا شعور زندگی کی ٹوٹ پھوٹ، ہزار ہا رنگوں کے باوجود یہ رنگی بستی زندگی کے اجڑنے کے کئی شیعہ کاشی کی شاعری میں کثیر اظہات انداز میں دکھائی دیتے ہیں۔ آزاد فضا میں سانس لینے کا جذبہ و احساس بھی مختلف انداز میں دیکھا اور محسوس کیا جاسکتا ہے۔

مری بستی میں اب انصاف ہوگا کہ ہاتھوں میں ترازو آگیا ہے اجالا سا یہاں دیکھا ہے ہم نے نظر میں جب وہ جھنڈا آگیا ہے

رہیں قید کب تک جو ٹھیک نہ گھرے تو مر جائیں گھٹ کر زمانے کے درے

وہ ہے وہ سایہ وہ چڑیاں کہاں ہیں؟ ہوا پوچھتی ہے یہ سوکے شجر سے کاشی چوہان کے ہاں ایک نیا منظر نما ایک خوبصورت شعری فضا اور ایک نئی قوت نموشعری کا نکتہ کو ترتیب دیتی ہے۔ اس پر اس کا غنائی لب و لہجہ اُس کے خوبصورت خیالات کو depict کرتا ہے۔ کاشی کی غزل خوشامت کا آئینہ ہے۔

پسند اپنی اپنی

قارئین کے پسند کردہ اشعار ادبی ذوق کے آئینہ دار

شاہن عباس..... غفران احمد سرسہ
عشق میں دہری شہقت کی ہے
حالت ہجر میں ہجرت کی ہے
افضل گوہر..... روینہ بیگم گوہر خان
سوجا کتاب کی بار کنارے پہ جاؤں گا
دریا بھی میرے ساتھ نہی ناؤں میں آ گیا
غنیہ شمس کاظمی..... عمار شہزاد کراچی
یاد کیا اس کی جلی کو رکھے
وہاں سے اپنا مکان جاتا ہے
اجمل سرانج..... رشوان کوثر لاہور
اجمل سرانج ہم آئے مجھ سے ہوتے تو ہیں
کیا چاہیے کیا کریں گے اگر یاد آ گیا
میر احمد لویہ..... غیاث الدین پشاور
اب تو کر کیجئے ساعت آپ قصہ عشق کا
آہ نکالے آئے ہیں ہم مقرر کرتے ہوئے
حسین جاوید..... علقمہ بصیر موات
کسی بھی دل میں ہمارے لیے جگہ نہ بنی
زمین اپنے لیے خاتمہ خدا نہ بنی
محسن اسرار..... شعیان کورہ کوئٹہ
عجیب شخص تھا لوٹ گیا میرا سب کچھ
معاوضہ نہ لیا دیکھ بھال کرنے کا
زرا سچائی..... سلمان بھائی سیال
میں یونہی ہاتھ بوجھا رکھوں
چاہے کچھ ہاتھ نہ آئے میرے
سید زاہد حیدر..... نواب علی محمد
دل ہیں جانے کتنے خواب
دل یا قبرستان ہے سائیں
محبتاں دروہان..... راحہ فیروز خان
بات دل کی کی دل سے ہوجاتی
سچ میں تم داغ لے آئے

نیل باغی..... ردواناب ساہیوال
گر بڑے تو اٹھا کے چوم لیا
میں نے لفتوں کا احترام کیا
تہذیب جانی..... ارتقاء علی بہلم
میری آنکھوں پر وہ مقدس ہاتھ
یہ اندر راہی روتی ہے مجھے
کاشف مجید..... لوبیہ خان ملتان
گلاب جس کے لیے ہیں اسے خبر کروں میں
وہ دل بھی آئے کہ اس کی طرف سرگروں میں
عمران پری..... سہیل گل پھر پور بن
کچھ کھل نہیں ہے دنیا میں
گویا یہ بات بھی ادھر کی ہے
فرخ اظہار..... معاذ خان انکب
زندگی کچھ دلوں کی ہے اور میں
کچھ دلوں سے بہت پریشان ہوں
تو قیصر..... فرزانہ شیر نورالائی
تو زرا دل پہ ہاتھ رکھ کے بتا
کیا میری بات میں اڑ نہیں کچھ
اکبر مصور..... منصور بلوچ دادو
نیند میں گنگنا رہا ہوں میں
خواب کی دمن بنانا ہوں میں
انعام منڈی..... فریحہ پارک پیکٹ
دے دے جلائے گئے یا دے دے بجائے گئے
ہر ایک رسم کا آغاز میرے گھر سے ہوا
وجہ ثانی..... فاطمہ بتول کراچی
یہ سوچ کر گھستتے ہم مسکرا دے
تاکامیوں نے جیت کے ستر کو سکھا دیئے
صغیر ملال..... آفتابا داود ہاڑی
لوگ اُس شہر کو خوشحال سمجھ لیتے ہیں
رات کے وقت بھی جو جاگ رہا ہوتا ہے

چڑھ گئی اس پہ نعل نفرت کی
وہ جو اک تھا ہجر محبت کا

دعا اس نے بھیجی ہے کچھ اس ادا سے
سدا خوش رہو تم ہماری بلا سے
کاشی کے ہاں مضمون آفرینی رفیع خیال
اسلوب بیان اور اس پر بلا کی سادگی پر کمال پر نظر
آتی ہے۔ وہ نہ صرف بات کرنے کے ہنر سے آشنا
ہے بلکہ اس کے پاس کہنے کے لیے باتیں اور
مقتضیات تازہ موجود ہیں۔ وہ معاشرے کا ایک ذمہ
دار فرد اور حساس تحقیق کار ہے۔
گھر لوں میں بیٹھے والوں کو کیا خبر ان کی
وہ تجربے جو میں رہگروں میں ہوتے ہیں
کاشی چوہان میرے بھائی نے پورے
چاند کی اس چمکتی رات کی مقدس و پاکیزہ
ساعتوں میں اپنی تھیلیوں پر دعاؤں کے چراغ
جلائے۔ خداوند کی بارگاہ میں درخواست گزار
ہوں کہ وہ تمہارے قلم کو مزید روانی، سوچ کو
وسعت اور تمہیں مزید علمی بصیرت سے
نوازے۔ تم جیہت جیو۔ (آمین!)

☆☆☆

کتاب تبصرہ

وہ شاعر حضرات جن کی خواہش ہے کہ
ان کی کتابوں پر بھی تبصرہ شائع کیا جائے
آپ کو کیا لگائی دین صاحب
ہم تو خود کو نظر نہیں آتے
کاشی کے دل میں دھل کا ٹکڑا ہوا گلاب ہو یا
پھر ہجر کا رخم اس کی شاعری ہر کیفیت اور ہر موسم کو
سیراب کرتی ہے۔

بات گرد آدی کی ہے یارو!
آدی روز و شب بدلتا ہے

اک اک پوچھتا ہے مرا حال شہر میں
بے کار ہے یہ حال مگر تم کو اس سے کیا
تو پھر کیسے میں گھر میں بیٹھ جاتا
مرے اندر کوئی بے گھر تھا ایسا
قرص کرتا ہے دروں دروں مجھ میں
جیسے جنگل میں مور ناچے ہے
اپنے پھولوں کو ٹمکتا دیکھوں
اس قدر تاب کہاں ہے مجھ میں
عجیب شخص تھا جو منکشف ہوا مجھ پر
مری نگاہ کو اک روز آنکھ کر کے
مجھ کو غم نے سنبھال رکھا تھا
خوش ہوا تو خوشی سے ٹوٹ گیا
کاشی چوہان مصعب غزل کا فطری رجز آشنا اس
کی مخصوص مزاحیہ کیفیت اور اس کے بنیادی دماغیات
سے پوری طرح باخبر ہے۔ اس کے کلام میں متعدد
ایسے اشعار نظر سے گزرتے ہیں جو اس کے غزل
شناس ہونے پر دلالت کرتے ہیں۔
آپ کو کیا لگائی دین صاحب
ہم تو خود کو نظر نہیں آتے
کاشی کے دل میں دھل کا ٹکڑا ہوا گلاب ہو یا
پھر ہجر کا رخم اس کی شاعری ہر کیفیت اور ہر موسم کو
سیراب کرتی ہے۔

علی زبیر..... اینٹہ مغل خاندان

ہے عجب عشق کا کیلنڈر بھی

مشغل ہجر کا سن آتا ہے

عباس تابش..... قصیرہ علی کراچی

پانی آنکھ میں بھر کر لایا جاسکتا ہے

اب بھی جلتا شہر بجایا جاسکتا ہے

کاشف خمیں غائر..... ایم سعید انور سعید لاہور

خیال و خواب میں آئے ہوئے سے لگتے ہیں

ہمیں یہ دن بھی پتائے ہوئے سے لگتے ہیں

ویسے ہوں پھول ہوں بادل ہوں یا پردے ہوں

یہ سب ہوا کے ستارے ہوئے سے لگتے ہیں

ذوالفقار عادل..... فہد بیک قادری ہزارہ

ہمارے دل میں حوالے ہیں ساری یادوں کے

ورق ورق اسی دفتر سے ہو کے جاتا ہے

حتا تیموری..... عاصم خان نیازی میانوالی

کہتے ہیں تجھ کو لوگ مسکا مگر یہاں

اک شخص مری گیا ہے تجھے دیکھنے کے بعد

کاشی چوہان..... تنویر فاطمہ ایبٹ آباد

چاند سے عشق کر لیا ہم نے

رات میں رنگ بھر لیا ہم نے

اس طرح بھی تمہاری لاج رکھی

ہر گناہ اپنے سر لیا ہم نے

لیاقت علی عاصم..... ملکانی راشدہ ٹنڈو محمد خان

بھری گلی سے گزرتے ہیں بے سرو سامان

ہمیں تو شرم ہی آتی ہے گھر بدلتے ہوئے

شاہین عباس..... صفیہ کریم چکوال

اک نقش ہو نہ پائے ادھر سے مرا ادھر

جیسا تمہیں ملا تھا میں ویسا جدا کرو

اکبر معصوم..... انزلہ تاج فیصل آباد

مجھ سے شکوہ تو ایسے کرتے ہو

جیسے میں زندگی بنانا ہوں

رومانہ روی..... عندلیب خان پشاور

عشق نے ایک عجب حال میں رکھا دل کو

ہم کو اپنی بھی نہ تھی کوئی خبر صحرا میں

یہ تو احساس کی ہے بات اسے کیسے کہوں؟

تکس قدر ہونا پڑا خاک بسر صحرا میں

عباس تابش..... نالکدا کبر چچہ وطنی

اسی لیے تو اندھیرے بھی کم نہیں ہوتے

کہ اپنے جسم چراغوں میں ضم نہیں ہوتے

اور اب ہے اس لیے افسوس اپنے ہونے کا

کسی کے ہو گئے ہوتے تو ہم نہیں ہوتے

اشرف جاوید..... زوہیب گل ہزارہ

ہوگا یہیں کہیں یہ پرندہ پڑا ہوا

پتوں کے ساتھ پر ہے اسی کا پڑا ہوا

دریا کی موج موج میں صحرا ہے گامزن

صحرا کی لہر لہر میں دریا پڑا ہوا

شا کرکندان..... نرمن خٹک جہلم

دیکھ، خلقت میں بہت حد سے زیادہ نہ گزر

یہ نہ ہو گونج اٹھے صوت سرائیل ابھی

شاہدہ حسن..... صولت مرزا واہ کینٹ

کھنکھڑی میں بھی کوئی نہ آس پاس ملا

صدائیں دے کے دل خوش گماں نے صبر کیا

رمزی آثم..... جہاں آراء لالہ موسیٰ

پردائے خاک نہیں آسمان ہے یہ بھی

کبھی کبھار تو ہوتا گمان ہے یہ بھی

میں اپنی ذات کے اندر بھی جھانک لیتا ہوں

کہ حیرتوں سے بھرا اک جہان ہے یہ بھی

نینا عادل..... اقراء قمر ملتان

وصل ہوتا ہے کیا ہجر کا آئینہ

میں تجھے ڈھونڈتی ہوں ترے روبرو

ان نگاہوں میں سمیٹیں اگر دو جہاں

ایک میں ہوں ادھر ہے ادھر ایک تو

نوٹ: شعر کے ساتھ شاعر کا نام ضرور لکھیں۔

شاعر کے نام کے بغیر شعر شامل اشاعت نہیں کیا

جائے گا۔ (انچارج) پسند اپنی اپنی

فاطمہ بیگم

جنگی کہانیاں میں خواب بے تھے

شاہد بخاری کا خیال

اب وہاں یادوں کا ٹکڑا ہوا لمحہ ہی تو ہے
جس جگہ شوق نے بنیاد رکھا رکھی تھی

جنگی کہانیاں کی معروف سینئر لکھاری کا دلچسپ و تھریلر سلسلہ قسط نمبر 5

خلاصہ: داؤد حرف ڈیوڈ کی ماں میری ایک انگریز عورت تھی جس نے ایک ایشیائی انتہا رال ملک نامی قحط سے شادی کی تھی۔ اس رشتے کی پاداش میں میری کے لرب چچی باپ لارڈ ڈوڈلی نے اسے جانبدار سے عاقی کر دیا تھا۔ اسی دوران حالات نے اسے اپنے شوہر سے جدا کر دیا۔ اس کے بعد میری نے اپنے بیٹے کے ساتھ لندن میں بہت مشکل زندگی گزار دی اور سرگرمی۔ لارڈ ڈوڈلی کی موت کے بعد یہ وصیت نامے آئی کر اس نے اپنی تمام جائیداد کا وارث میری کے بیٹے ڈیوڈ کو قرار دیا ہے لیکن داؤد حرف ڈیوڈ نے جائیداد قبول کرنے سے انکار کر دیا ہے جب کہ لارڈ ڈوڈلی کی اس جائیداد پر ایک یہودی گروپ کی بھی نظر ہے۔ لارڈ ڈوڈ کی اس گروپ سے ایک جھوپ بھی ہوئی ہے۔ لندن میں ہی بہن بھائی جیسے رشتوں سے محروم داؤد کی ایک پاکستانی ٹیلی سے ملاقات ہوئی ہے اور وہ اس ٹیلی کی ایک لڑکی کو بہن بنا لیتا ہے لیکن وہ لڑکی داؤد کو بھائی نہیں سمجھتی اور ایک ایسا قدم اٹھاتی ہے کہ داؤد کی عزت داؤد تک جاتی ہے۔ حالات کا مارا داؤد پاکستان اپنے باپ انتہا رال ملک کے پاس جانے کا فیصلہ کرتا ہے۔ جہاں وہ شادی کے بعد ایک یہودی لڑکی کے ساتھ رہ رہا ہے۔ جہاں میں سڑک کے دوران اس کی ملاقات فاطمہ کی ایک بھانجی سے ہوتی ہے جو اسے پاکستان میں لے کے لیے ورنیننگ کار ڈرو بھی دیتی ہے۔ داؤد پاکستان آتا ہے اسے باپ ہی نہیں اپنی سوتیلی ماں اور اس کی بیٹی لہجیدہ سے بہت پیار، محبت اور شفقت ملتی ہے۔ داؤد اپنی دولت کے دریہ ان لوگوں کی زندگی میں آسانی اور آسائش لانے کا فیصلہ کرتا ہے پاکستان میں داؤد کی اپنے باپ سے جڑے رشتے داروں سے ملاقات ہوتی ہے۔ انہی میں ایک بہت خوبصورت ڈچین اور حاضر جواب لڑکی جڑی ہے جو داؤد کو ابھی تک نہیں گئی ہے۔ اور ایک رشتے دار راتلی اختر سے بھی ملاقات ہوتی ہے جس نے پولیس آفیسر ہونے کے باوجود بدچل کافی ہے اور وہ خبیثات کا حامی بھی ہو چکا ہے۔ پاکستان میں داؤد کو اس لڑکی راجہ کا ایک طویل خط ملتا ہے، جسے داؤد نے بہن بھائی سمجھا ہوتا ہے لیکن وہ داؤد کو بھگت کر اس کی بدنامی کا باعث بن گئی تھی یہ خوار راجہ نے سرنے سے پہلے تحریر کیا ہے۔ اور اب آگے بڑھتے:

میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ امی مجھ سے میری بہن کی شادی کیوں کرانا چاہتی ہیں، کیا فہمیدہ میری بہن نہیں ہے؟ کیا وہ ابوی کی بیٹی نہیں ہے؟ اس کا جواب میرے فیصلے سے سکتا ہے۔ اسی سوچ کے تحت میں نے اس سے کہا "اگر مناسب سمجھیں تو میرے ساتھ چل کر ایک کپ چائے پی لیں۔"

گھرانے کی ہے۔ اس کے کپڑے بھی میرے خیال کی تائید کر رہے تھے۔ ایسے جدید تراش کے کپڑے اس
گلی میں شاید یہ کوئی پہنا ہوا۔ ان کپڑوں کی وجہ سے اس کا حسن عمل اٹھ اٹھا۔ اس نے ایک پل کے لئے
میرے طرف دیکھا اور یہ لمحہ مجھ پر بجلی بن کر گر اٹھا۔ دل بڑے زور سے دھڑکا تھا اور پہلی بار کسی میں دلچسپی
لینے کے لئے جھلا تھا۔

”آں شادی کے لئے؟“ میرے لہجے میں حیرت تھی۔
 ”جی ہاں۔ ہم یہ تانا چاہتے ہیں کہ عورتیں کسی سے پیچھے نہیں ہیں وہ ہر کام کر سکتی ہیں جس پر تم مردوں کی اجارہ داری ہے۔“

”یہ تو سراغِ شر ہو گروی ہے۔“
 ”اں ہاں یہ غنڈہ ہو گروی ہے یہی لیکن ہر کھل کر تو سامنے آئے ہیں۔ تم مردوں کی طرح شیشی جھری ہے تو ذہن نہیں کرتے۔“ اس نے ایک بات کو چاچا کر کہا۔

میں نے لڑکی کے چہرے پر نظر ڈالی۔ جوش و خروش بات سے لڑکی کا چہرہ تھما اٹھا تھا۔ گورے کھڑے پر جوش کی لالی نے حسن کو دوبالا کر دیا تھا۔ پیشانی پر پڑے بالوں نے بھوکوں کو کڑوئی کمان بنادیا تھا۔ تراشیدہ ہونٹ کے کنارے پھڑک رہے تھے۔ وہ تقریباً بیچنے کے انداز میں بول رہی تھی۔ ”تم مردوں نے الفاظ کے تھے سے عورت کو باغ و بستان کھا ہے۔ ہر درد میں عورت اسی ہتھیار سے شکار ہوئی ہے۔ بیاد کی زنجیر پھرتا کر انہیں قیدی بنایا گیا ہے۔ قیدیوں کو کھنکھڑی بھیری پہنائی جاتی ہے کہ میں رس پا دھا جاتا ہے۔ انکی چیزوں کو خوبصورت بنا کر کر کے پائے اور چوڑیوں کا نام دیا گیا ہے۔ بیڑی کی جگہ بالکل پائے کا نام دیا گیا ہے۔ بھانڈے کو توڑا کر رے کی جگہ کر کے بنڈ کر زیب۔ جوشن یا پکا پتا دیا جاتا ہے۔ کیا یہ غلامی کی نشانی نہیں ہیں؟“

”یہ سارے زیور تو سہاگ کی نشانی ہیں اور سہاگ بنانے کے لئے عورت کی رضامندی لازمی ہے اسی لئے اسلام نے عورت کی رضامندی لینے کا حکم دیا ہے۔“

”عورت نے ہم سے پہلی کی اور تم مردوں نے اسے رضامندی کہہ دیا۔ کہی کسی عورت کے دل میں جھانک کر دیکھا ہے کہ وہ راضی ہے یا نہیں؟ اس کے بھی تو خواب ہوتے ہیں۔“

”مختصر ماریا شاد و داری ہوتا ہے۔“ میں نے باتوں میں جھنسا کر دھکی کرنا چاہی۔

”لیکن عورت کی چھوٹی سی ٹھٹکی کو شاد و داری نہ صاف کیا جاتا ہے۔ اگر بلی کی مغز خوش ہو جائے تو فوراً لات روری جاتی ہے۔ ذرا سی شکل میں نقص دیکھا اور انکار کر دیا۔ میں پوچھتی ہوں یہ دن زرد لڑکے کس منہ سے خوبصورت لڑکیوں کی انگلی کر رہے ہیں۔ میری ٹھٹکی جھیلے کا جزم بھی ہے کہ وہ کالی ہے اس کو لڑکی رشتہ بھی نہیں سمجھتا۔ اس سے تم شادی کرو گے تم۔“ لڑکی نے میرے سینے کی جانب اشارہ کیا۔ ”دو تھماری زندگی تمہاری اس شرت کی طرح کالی بنا دوی گی“ لڑکی نے میری شرت کو اٹھا کر دکھایا۔ ”یہ تو تمہیں ڈکی میں ٹھونسنے کی وجہ سے کالی ہوئی ہے کہ تمہاری زندگی میرے ہاتھوں کالی ہو جائے گی۔“

لڑکی کے تہہ بہ تہہ ہاتھوں سے کہہ رہی تھی کہ گزرنے کے لئے تیار ہے۔ اور میں سوچ رہا تھا کہ کیا کروں؟ کیسے اس بالکل لڑکی کے چنگل سے آزادی حاصل کروں۔ بھی دروازے کا پٹ کھلا اور ایک سانو لی لڑکی اندر داخل ہوئی۔ اکبر سے دن کی اس لڑکی کے لباس کو دیکھ کر میں نے پہچان لیا۔ یہ وہی لڑکی تھی جسے میں بلی میں کار کے اندر بیٹھے دیکھا تھا۔ اس کے ساتھ ایک اور لڑکی تھی۔ وہ کچھ زیادہ ہی تندرست تھی۔ فٹ بال کی طرح لڑھکی ہوئی داخل ہوئی تھی۔ اور اندر آئے ہی خسار کار کر زمین پر بیٹھ گئی تھی۔

”ارے۔ جیلز زبانی تو پلانا۔“ گلاسٹون لگے گئے۔
 ”موٹی تجھے کھانے پینے کے علاوہ کچھ آتا ہے؟“ اسی لڑکی نے طنز یہ کیا۔

”تو چپ رہو صفی بچی؟“ موٹی نے جھنجھالے ہوئے لہجے میں کہا۔
 ”خدا کے لئے آصف اب کچھ نہ کہتا رہو خود خواہ یہ کہ مریدان جنگ بن جائے گا۔“ ہیلہ نے مجھ سے سوال جواب کرنے والی لڑکی سے کہا۔

”تم جس کام کے لئے لے آئیں؟“ مولوی کولائی ہو؟“ آصف نے جھیلے سے پوچھا۔
 ”نہیں۔“
 ”کیوں؟“

”کیوں کہ بے جاہ مظلوم ہے۔“ اس نے میری جانب اشارہ کیا۔
 اس کی بات پر میں چونک گیا اور جھیلہ کے چہرے کو سوالیہ انداز میں گھورنے لگا۔
 ”مگر یہی مظلوم نہیں ہوتے۔“ آصف غرائی۔

”مگر یہ مظلوم ہے۔“ ہیلہ بولی۔ ”تم بھی اس مظلوم کی اس خوبی سے آگاہ ہو کہ وہ ہر کسی کے پیٹ کی بات معلوم کر سکتی ہے۔ مظلوم کے مطابق جب ہم اس کے محلے میں معلومات حاصل کرنے پہنچے تو پتا چلا کہ یہ شفاعت کا پتا نہیں ہے۔“

میں اچھل پڑا۔ یہ اطلاع میرے لئے بالکل نئی تھی۔ بچپن سے جسے میں اپنا باپ سمجھتا آیا تھا۔ جس کی کو دھیں دیکھتے ہوئے میرا بچپن گزرا۔ جس نے اپنے خون پسینے کی کمانی سے مجھے افسر بنایا وہ میرا باپ نہیں ہے۔ یہ اطلاع بالکل عجیب سی تھی۔

”اس کا باپ کون ہے؟“ آصف نے پوچھا۔

”نہ کہہ اس کے باپ کا نام نہ دے۔ اور وہ رکی میں رہتا ہے۔ دس سال سے وہ ہیں ہے۔“

”اور ماں؟ کیا وہ عورت جو شفاعت کے ساتھ روتی رہی وہ بھی اس کی ماں نہیں ہے؟“

”ہاں! ارا تھل کی ماں کو کونہ میں ہے۔“

”بات بٹھنے نہیں پڑی۔“ آصف نے کہا۔

”مصادقہ نے ایک ایک جو مصلحتی بی بی کی ہیں اس کے مطابق ارا تھل کی ماں کا نام نوران ہے۔ وہ لاہور کے موچی دروازے کے رہنے والی ہے۔ شفاعت کی بیوی بھی اسی محلے کی ہے۔ دونوں میں بڑی دوستی تھی۔ شادی کے بعد دونوں سہیلیاں بچھڑ گئیں۔ شادی کے بعد وہ اپنے شوہر کے ساتھ ملتان چلی گئی۔ اسی دوران میں نوران کا نکاح بھی ہو گیا۔ عمر عمرانی لڑکے سے اسے منسوب کیا گیا تھا۔ عمر کراچی میں رہتا تھا۔ نوکر پیشہ تھا۔ سال میں دو تین بار بھی آکر آتا تھا۔ ایک بار وہ لاہور آیا تو اسے سسر سے ملے ان کے ان کے گھر بھی پہنچا۔ مگر وہ گھر میں نہیں تھے۔ اور نوران اکیللی تھی۔ اکیللہ کراہتا تھا۔ نوران نے شوہر کی مرضی کے آگے سر جھکا دیا۔ اس کے ہیر بھاری ہو گئے تھے۔ یہ بیڑ جب نوران کے سسرال پہنچی تو ان لوگوں نے آسمان سر پہ اٹھالیا۔ ان لوگوں کا کہنا تھا کہ نوران بد کردار ہے۔ کسی اور کا گناہ عمر کے سر پہ رہی ہے۔ عمر باپ کے غصے کو جانتا تھا۔ اس نے باپ کے حکم پر نوران کو طلاق بھیج دی۔ دقت کالی گزر کر تھا تھا۔ ڈاکروں نے بہت اصرار کے باوجود خطرہ مول لینے سے انکار کر دیا۔ مجبوراً وہ اس مصلحتی کا انتظار کرنے لگی۔ لیکن پریشان بھی تھی۔ بچہ کا کیا ہوگا؟ اس خیال سے نوران ہر دقت روتی رہتی۔ اسی دوران میں

شفاقت کی بیوی کو ڈاکٹروں نے بتایا کہ وہ کبھی ہاں نہیں بن سکے گی۔ اس مسئلے کا حل اس نے یہ نکالا کہ اس بچے کو گولے لیا۔ رات بیل ہی وہ بچہ ہے۔“
میرے ذہن کو جھٹکا سا تھا۔ مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کہ ایسا بھی ہو سکتا ہے۔ اپنی کہانی سے میں خود ہی بے خبر تھا۔ جسے انتہا سب کچھ بھیجے بیٹھا تھا وہ میرے کچھ بھی نہ تھے۔ ابھی خیالات کے گرد اب چکر ہی دے رہے تھے کہ مضمک کی آواز نے چونکا دیا۔ وہ جیل سے مخاطب تھی۔ ”اگر یہ مظلوم ہے تو اس کی مدد فرم ہے فوراً مولوی کو بلاؤ۔“

”کیوں؟“ جیل سے پوچھا۔
”تم سے نکاح پڑھایا جائے تاکہ تم اس کے زخم پر پھیا کر لکھ کر۔“
”اے میرے ہر درد خوب ہمدردی جتار ہی ہو۔ ایسے لڑکے کو بے چارہ جیل کے گلے منڈ رہی ہو جس کے باپ کا ہی پتا نہیں۔“ صادق نے ہاتھ نہا کر کہا۔
”تو جب مولوی کیا نازار چھپانے کے لئے جیل کے آگے کبھی نہیں اٹھائے گا۔“
”متعلق کی دم تو خود کر لے“ مجھے ایسا ہر مبارک۔“
دونوں عورت تھیں۔ ان کی جہلت عود آتی تھی۔ ساری ڈگریاں دھری رہ گئی تھیں۔ مردانہ پن کے دھوے ہوا ہو گئے تھے۔ اور ایک دوسرے کو نیچا لکھانے کے لئے وہ جھجھکوں کی طرح لڑے جاتی تھیں۔
”خدا کے لئے خاموش ہو جاؤ۔“ جیل نے کہا۔
”اسے خاموش کر۔ اس مولوی کو چپ کر۔“ آصف کرچی۔
”خدا کے لئے صادق چپ ہو جاؤ۔“ جیل نے ہاتھ جوڑ دیئے۔
”ٹھیک ہے میں چپ ہو جاتی ہوں مگر اسے شادی کرنی ہوگی۔“
”ہاں ہاں میں شادی کروں گی۔“ بلاؤ مولوی کو۔“ آصف کرچی۔
”میں اچھی لکرائی ہوں۔ گردن سے پکڑ کر لاؤں گی۔“ صادق جھکے سے کھڑی ہوئی۔
”تم کو گوارہ بنا جیلا اگر اس نے نہ کیا تو اس کی گردن تو دوں گی۔“ بکتے جھکتے صادق ہاں ہٹ گئی۔
وہ کچھ رو بعد تو اس کے ساتھ ایک مولانا تھے۔ سیاہ روائی، دوپٹی ٹوٹی، بغل میں رجسٹر ہونٹ پان کی لالی سے سرخ، اندر داخل ہوتے ہی ٹھٹھک گئے۔ انھوں نے ایک نظر لڑکی پر ڈالی اور پھر راتیل کی طرف متوجہ ہو گئے۔ ”اے میاں کیوں ہی شرافت ہے لڑکیوں کے سامنے بٹکتے بیٹھے ہو۔“
”اے بڑھے یہ کیا کہیں جاسے گری نگہ دہی ہے اس لیے شرف اتار دی۔“ صادق نے کہا۔
”کیا گری سر پر بھی چڑھتی ہے جو اس کے پیچ بندھے ہیں۔“ مولانا نے طنز کیا۔
”اے مولانا زیادہ ماتیں نہیں، نکاح شروع کرو۔“ آصف نے جھڑکا۔
”اے کہے پڑھا دو؟ آں۔ نکاح ہے کیوں کیل نہیں۔ گواہ لاؤ، دھن دو لھے کولاؤ۔“ مولانا بولے۔
”گواہ یہ دونوں ہیں۔“ آصف نے جیل اور صادق کی جانب اشارہ کیا۔
”آں یہ گواہ ہیں؟ اے میرے دونوں عورت کی گواہی آدمی ہوتی ہے۔“ مرد گواہ لاؤ۔“
”صادق! دو بندے پکڑ لاؤ۔“ آصف نے حکم دیا۔

”ابھی لائی۔“ وہ جاہر نکل گئی۔
”دھن دکھاؤ تم سب خطر کا نظر آ رہی ہو کہیں کسی کو اغوا کر کے تو نہیں لے آئیں۔“
”دھن میں خود ہوں۔“ آصف نے کہا۔
”آں!“ مولانا اچھل پڑے۔ ”اور دو لھاؤ۔“
”دو لھاہے بندھا بیٹھا ہے۔“ آصف نے اشارہ کیا۔ ”تم نے مجھے سمجھا ہے ہم اسے اغوا کر کے لائے ہیں۔“
”یا اللہ! کیا یہ آخری وقت ہے قیامت آنے والی ہے کیا؟“ مولانا نے پھت کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔
”جو لڑائی لڑ کے کو اغوا کر لیں۔“
”جیل سے قاصر تھا۔“ بھی آصف بولی۔ ”اے مولانا خطر خبر کر دو گواہ آتے ہوں گے۔“
”جرم یہ نکاح پڑھا نا جرم ہے۔“ مولانا بولے۔
”جرم کے بچے ہیں ابھی مجھے جرم بتائی ہوئے۔“ آصف اچھل چلا ہوا میں قلابازی کھاتے ہوئے اس کے پیچھے پہنچی اور ایک زوردار لٹ اس کے گولے پر باری۔ مولانا قلابازی کھا کر دوڑ جا کر۔
”سن اوئے مولانا میں کرائے میں بلیک بیٹک ہوں۔ زیادہ چوں چرائی تو پیچ تو ذکر ہاتھ میں دوے دوں گی۔“
مولانا کا رنگ فق ہو گیا۔ چہرہ خون کا آئینہ بن گیا تھا جسم تھر تھکا پھٹنے لگا تھا۔ وہ ایسے حالات کب دو چار ہوتے تھے۔ وہ ہم کران لڑکیوں کے اشاروں پر معمول کی طرح کل کرنے لگے۔ ”لو گواہی آگئے۔“ صادق کرے میں داخل ہوئی۔ اس کے ساتھ دو آدمی تھے۔ چہرے سے وہ مزدور لگ رہے تھے۔ ”مرست کی زندہ تصویر تھے۔“
”نومولا نا گواہ لے آئی۔“ صادق نے ایک کی گردن پر ہاتھ رکھ کر آگے دھکیلا۔
”گواہ! لیکن مجھے تم مزدوری کے لئے لائی ہیں۔“ ایک نے کھڑکے میں کہا۔
”گواہی تو تیرا باپ بھی دے گا۔“ صادق نے اس کی پیٹ پر چھل جھلیا۔ اس وقت پتا ہی نہیں چل رہا تھا کہ یہی وہ مولی ہے جو گوشت کا پہاڑ بن کر سرت پڑی رہتی تھی۔ اس وقت اس کی بھرتی دیدنی تھی۔ سختی خواہن کا زخماں کے پکڑے تھوڑ اور مولانا کے چہرے پر اڑی ہوئیاں دونوں مزدوروں کا حوصلہ پست ہو گیا۔ انھوں نے جھپٹا زوال دیا۔
مولانا نے خطبہ پڑھا اور نکاح ہو گیا۔ اس پورے ڈرامے میں میرا کردار بات کار ہا۔ میں خاموش بیٹھا دیکھتا رہا۔ تیسری بار پوچھنے پر میں نے ”قبول ہے۔“ کہا تھا۔
نکاح کے فوراً بعد گواہان اور مولانا کو بیٹھے دے کر بھگا دیا گیا۔
”اے تمہیں قیامت دھن ہو شو میرے ہاں کرنا۔“ صادق نے چھیڑا۔
”سنو سنو راتیل اب تم میرے شو ہو میرے مجازی خدا مگر صرف نام کے۔ میرے مزاج کے غلا کچھ بھی نہیں کر دو گے۔ مجھے سے پوچھتے بغیر ڈیوٹی پر بھی نہیں جاتاؤ گے۔ جب تک میری مرضی نہ ہو میرے قریب بھی نہ آؤ گے۔ اب تم جاکتے ہو۔“

آزادی کی لودی بھی میرے حواسوں کو لوٹا نہ سکی۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ میری کہانی اتنی پرورد ہوگی میں ساحر سے کے لئے گالی ہوں۔

”مسٹر راتل! آپ کو شاید میری باتوں سے رکھ پکھ ہے۔“ گیارے میں روک کر صادق نے کہا۔

”اس!“ میں نے چونک کر کندھے سے اس کا ہاتھ ہٹایا۔

”کب سے فکر ہیں۔ میں جو جا رہی تھی وہ ہو گیا۔ میں آصف کے عہد کو توڑنا چاہتی تھی۔ سو توڑ دیا۔ اس نے قسم کھائی تھی کہ وہ شادی نہیں کرے گی مگر میں نے اسے مجبور کر دیا۔ میں نے جیل کے ساتھ مل کر جو منصوبہ بنایا تھا وہ کامیاب رہا۔ ابھی ہم نے آپ کے منتقلی جو کہانی سنائی تھی وہ صد فیصد جھوٹ تھی۔ صرف آصف کو کسانے کے لئے بنائی تھی۔ آپ شافعی صاحب سے بیٹے ہیں۔“

”کیا؟“ آصف اچھل پڑی۔

”ہاں وہ کہانی جھوٹی تھی۔۔۔۔۔۔ صرف تجھے قتلے فلا نے کے لئے لکھی تھی تاکہ جوڑ میں آجائے۔“

میرے چہرے پر شادی پاٹ آئی۔ ”اچھا۔۔۔۔۔۔ میں تو یہی طرح ڈنک چکا تھا۔ کون مرادیں گالی سے گا۔“

”ہاں ہاں یہ گالی بھی تو عورت کے لئے منسوب ہے۔ فعل بد خود کریں لغت کریں شیطان پر۔“ آصف سہرا اٹھی۔

”تمہاری یہی بات غلط ہے۔ ہر معاملے کو تم عورت کی مظلومی کے چشمے سے دیکھتی ہو۔“ جیلر نے سمجھا نا چاہا۔

”اور کیا؟ سارا ہی قصور مردوں کا ہوتا ہے عورت مظلوم ہے اس لئے اس پر الزام دھردیتے ہیں۔ دیکھ لینا میں اسے کس طرح غلط ثابت کرتی ہوں۔ راتل کی زندگی اخیر نا کردی تو کہنا۔“

”بی بی! تم بھول رہی ہو مرد جب چاہے عورت کو طلاق دے۔“

”ہاں ہاں اس کے علاوہ اور کتنی کیا سکتے ہو جب دل بھر جائے طلاق دے دو۔ غلطی کا احساس ہو جائے تو بلا کو مگرال کر اور طلاق عورت کو ہی کرنا پڑتا ہے۔“

”طلاق اس لئے کرانے کا حکم ہے کہ ان کی بھر مرد پشیمان رہے کہ اس کی بیوی کچھ دنوں کے لئے کسی دوسرے کی بھی ہو گئی تھی۔“ میں نے سمجھا نا چاہا۔

”میرا دماغ مت چاؤ۔ اب جاؤ جب میرا دل ہوگا بالوں کی۔“ آصف نے جھڑکا۔

جیلر اور صادق نے آصف کی تائید کی تھی۔ مجبوراً میں باہر نکل آئی۔ نکلے کے بعد باہر رک کر اس مکان کو بغور دیکھا تھا۔ اس مکان کو ابھی طرح وہی نقش نگار دیکھنا چاہتا تھا۔

اس رات میں کافی دیر تک جاگتا رہا۔ سوچتا رہا کہ ان نفسیاتی مربیوں کو کیسے راہ راست پر لاؤں۔ ان کے خود پسندی کے خول کو کیسے توڑیں کیونکہ آصف کھیلنے بھلنے کی وہ ایک کمیل ہو کر میرے لئے احکام شہر تھا ہاں شاید نکاح تھا۔ وہ میری بیوی بن چکی تھی۔ اسے راہ راست پر لا تا میرا فرض تھا۔

میں ایک ہفتے سے آصف کو تلاش کر رہا تھا۔ اس مکان پر بھی کیا تھا جہاں مجھے لے جایا گیا تھا مگر وہ مکان خالی ملا تھا۔ لڑکیوں نے اسے کرائے پر حاصل کیا تھا۔ ایک انٹیلیجنٹ شخصیت والے نے مکان دلویا تھا سی لئے مکان مالک بھی لڑکیوں کا پتا نہ بتا سکا۔

اس دن بھی میں تھانے میں بیٹھا آصف کے بارے میں سوچ رہا تھا کہ فون کی کھنٹی بج اٹھی۔

”ہیلو!“ میں نے ریسپونڈ کیا تھا۔

”میں لگ گیا۔ جلدی آؤ۔ پورے بارہ لاکھ لوٹ لئے۔“ دوسری جانب سے گھبراہٹ ہوئی آواز سنائی دی۔

”آپ کہاں سے بول رہے ہیں۔“

”میں ابراہیم شاہ ہوں۔“ ابراہیم شاہ۔ جس اینڈ جیلری کا مالک۔ ”وہ بے ربط انداز میں بولا۔

”آپ فکریں میں فون پر ابھڑ رہا ہوں۔“ میں نے جس اینڈ جیلری کی نامی دیکھی تھی۔ ”کانی بوی“

”کان تھی۔ یہ زیورات ان کی جینی دکا نوں میں سے ایک تھی جس کے زیورات غیر ممالک میں بھی پسند کئے جاتے تھے۔ آؤ زیورات بنانے میں اس کا کافی وقت تھا۔ پچھلے دنوں اخباروں میں پڑھا تھا کہ عرب کے ایک شخص نے پچیس لاکھ روپے کی منتقلی کرسی بنوائی تھی۔ ایسی تجو بہ روزگار کرسی تھی کہ لوگوں نے دانتوں تلے اٹھیاں دہائی تھیں۔“

اس مشہور کان میں پہنچا تو وہاں پہلے سے ہی اٹلی جنس کے کئی اضافے تھے۔ ان کے سامنے زمین پر دس لاکھ بیٹھے تھے۔ لڑکوں کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ ان کے ہٹائے جانے سے میں نے اندازہ لگایا کہ یقیناً اٹلی جنس والے محرم پر ہی ہاتھ ڈالنے ہیں خاص کر خطرناک بھرموں پر۔ یہ بھی خطرناک ہوں گے۔

میں نے خطرناک کئے دیکھے تھے۔ جب تک وہ آزاد رہتے ہیں خطرہ ہی خطرہ رہتا ہے مگر گلے میں چاڑھنے ہی ایسے خاموش ہو جاتے ہیں کو یا زل کے شریف ہوں۔ لڑکوں کے چہرے بھی مصیبت کا پرتو تھے مگر مجھے ان پر رحم نہ آیا۔ میں نے سیمہ سے پوچھا۔ ”کیا بات تھی؟“

”ان لوگوں نے ہمارے نام پر نہیں دیکھا دیا ہے۔“ اٹلی جنس کے انصر نے کہا۔

میں نے مڑ کر لڑکوں کی جانب دیکھا پھر ابراہیم شاہ سے بولا۔ ”آپ دانتہ تھائیے۔“

ابراہیم شاہ نے تانا شروع کیا۔ ”آج صبح جب میں دکان پر پہنچا تو یہ لڑکے آئے۔ ان کے ساتھ تین لڑکیاں بھی تھیں۔ ایک تو بہت خوبصورت تھی۔ گوری رنگت اور اونچا پورا قد۔ کھنٹے بال سفید شلوار قمیض پہنتی تھی اور بالوں میں کلپ لگائے ہوئے تھی۔“

میں نے دل ہی دل میں سوچا۔ ”میاں تم جا رہو یا ورزی جو تو فون کو بغور دیکھ کر پورا پورا پاپ لیتے ہو۔“

ابراہیم شاہ بولے جا رہا تھا۔ ”اور دوسری لڑکی اکبر سے بدن کی تھی۔ رنگت سائوٹی تھی۔ بڑی بڑی آنکھیں تھیں۔ اس نے شلوار قمیض پہن کر تھی کہ کپڑوں کا رنگ گلابی تھا۔ اس نے ہائی بل کی سیڈل پہن کر تھی۔ اور تیسری لڑکی ہماری بدن کی تھی۔ بہت بول رہی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا اس کے منہ میں لالہ ڈاؤنٹیکرٹ ہو۔ بڑی پاپ دار آواز تھی۔“

میں چونک گیا اور جلدی سے بولا۔ ”کیا اس کی ناک پر چھوٹا سا ساقا تھا؟“

”جی ہاں ہاں ساقا۔“ ابراہیم شاہ نے جواب دیا۔

”آپ سے بچاتے ہیں؟“ اٹلی جنس افسر نے پوچھا۔
میرا دل کانپ اٹھا۔ اٹلی جنس والے جس کے پیچھے بڑھا گئے اسے پاتال سے بھی کھینچ لاتے ہیں۔ یقیناً یہ
آصف صادق اور ریل کوئٹہ جنس کے کوئی گہرا معاملہ ہے بھی آئے ہیں۔

کمال متقی روزانے میں کراچی پر پڑتا تھا اس کے ذریعے میں نے کئی محرموں کو ان کی پناہ گاہوں سے باہر نکالا
تھا۔ اس بار بھی میں نے اس کے ساتھ مل کر ایک ڈراما کرنا چاہا اور اسے سن کر کنگنا گال گال ہو گئیں تو کاشی ناتھ
نورانی تھانے کچھ لکھا۔ میں نے اسے منصوبہ سمجھا کر وعدہ لے لیا کہ جتنی جلدی ممکن ہو اس جرم کو سمجھا دے۔
اسی دن میری ٹیلی ہوئی۔ افسران بالانے مجھے چوبیس گھنٹے کا وقت دیا کہ ان لڑکیوں کو گرفتار کرنے کے
آؤں۔ میں نے اپنے منصوبے سے انھیں آگاہ کر دیا۔ منصوبہ اتنا جامع تھا کہ افسران بالانے بھی اپنی
منصوبے کی توثیق کر دی۔

اگلے دن کے اخبار میں جرحی ”جس اینڈ جوئری میں لگے ہوئے خود کار کمرے نے دھوکے باز حسیناؤں
کی تصویر اتار لی ہے۔ وہ تصویر اس وقت انپکچر راتیل کے پاس ہے مگر انھوں نے ابھی تک کسی کو دکھانی نہیں
ہے۔ اپنے افسران کو اس کی اہا لگتے نہیں دی ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ وہ مجرموں کو بھانا چاہتے ہیں۔“
میں جانتا تھا کہ ریجر آصفی قتل کو مات دے دی کہ اسی لئے میں تھانے میں گیا تھا۔ اپنے بچنے کے
آدمے میں جانتا تھا کہ آصف مجرم ہے۔ اور مجرم کو مات دے دی کہ اسی لئے میں جانتا تھا کہ ریجر آصفی قتل کو مات دے دی کہ اسی لئے میں جانتا تھا کہ
تو میرے گھر آئے گی۔ اس وقت میں اسی کا انتظار کر رہا تھا کہ میری نظر سڑک کے کنارے کھڑے ایک شخص پر
پڑی۔ وہ میرے بچنے کی جانب دیکھ رہا تھا۔ کچھ مشکوک سا لگا کہ وہ میرے کیا آدمہ کا بندہ ہے؟ ابھی میں سوچ رہا تھا کہ

”ان لڑکیوں نے نہیں بتایا کہ وہ کہاں گئی؟“ میں نے پوچھا۔
”یہ سب بدعاش ہیں۔“ جوش میں اس نے ایک لڑکے پر پھڑپھڑایا۔
”آرام سے آرام سے“ اٹلی جنس افسر نے روکا مگر میری جانب دیکھتے ہوئے بولا۔ ”ان لڑکیوں نے
اپنے بیان میں بتایا ہے کہ کچھ دنوں پہلے انھوں نے اخبار میں اشتہار پڑھا تھا کہ ملک دو کم قیمت کے لئے
جب دھن سے سرشار ہو جان کی ضرورت ہے، انھیں جب خرچ بھی لگے گا۔ یہ لڑکے بے کاری میں وقت گزار
رہے تھے اشتہار پڑھ کر ہنسنے لگے۔ انھیں لڑکیوں نے بتایا کہ ان کا قتل اٹلی جنس سے ہے اور وہ ادھر والے سے کم
سے ایک گارڈ بن رہی ہیں۔ اس جاننا ز گروپ میں سے افسروں کا تقرر ہوگا۔ ایسے خفیہ کام کے لئے کمال
اشتہار دیا نہیں جاسکا اس لئے بندہ الفاظ کا اشتہار دیا کیا ہے اگر آپ نے حکومت کو مطمئن کر دیا تو آپ کی خواہ
تیں ہزار روپے بلانہ ہوگی۔ لڑکے خوش ہو گئے۔ انھوں نے کھر بھی میں کچھ بتایا کیوں کہ راز داری شرط
تھی۔ تمام ہزارینک کے تمام پر کچھ دنوں ان سے چھل کو کر دیا اور آج یہ لڑکا ڈالنے بیٹھ گئے۔“
میں نے دل ہی دل میں آصف کی عقل کو داد دی۔ کتنی آسانی سے اس نے بارہ لاکھ کے ہیرے اٹھا لے لیکن
میں نے بھی عہد کر لیا کہ آصف کو ہیرے سے ہم کرنے دندوں گا۔ اگر وہ پاتال میں بھی مچھی ہوگی تو میں اسے باہر نکال
لاؤں گا لیکن کسے؟ ابھی سوچ رہا تھا۔

”آپ انھیں لے جائیں لیکن ہمیں بھی کچھ سوالات کرنے ہیں اس لیے ہم انھیں واپس لے لیں
گے۔“ اٹلی جنس افسر کے کہنے پر میرے خیالات ٹھہر گئے۔
”جی ہاں ہے۔“ میں انھیں لے کر تھانے آ گیا۔

ڈاکٹر غنیمت نسیم کے افسانوں کا دور انجمنوعہ

مٹی کا سفر

شائع ہو گیا ہے

ایک ایسی مضبوط جویماجھی سے اور تخلیق کار مجھی.....

دیارِ غیر میں رہ کر بھی اپنی مٹی کی

سونہی سوندھی خوشبو سے آباد

افسانے جوانی مثال آپ ہیں۔



درجہ ماسٹر۔ پریس مارکٹ۔ امین پور بازار، فیصل آباد
(Contact No. 0300-6668284)

کتاب ملنے کا پتہ
مثال پبلشرز

رہا تھا، کرفوں کا ہر چنچ اٹھا۔ میں نے اٹھ کرفوں ریسیو کیا۔ دوسری جانب سے کمال کی جانی پہچانی آواز آئی۔ ”تصور تمہارے پاس ہے؟“

”جی ہاں ہوتو دکھاؤں؟“

”نیشنل ایئر لایڈ میری کمانڈر کا رہا ہے کہ جمیوٹی خبر کیوں لگا دی۔“

”مجھے اسے سمجھاؤ کہ افسران بالاکو فٹا کیوں ہے۔“

”اس کا کہنا ہے کہ عوام کو دھوکا دینا ٹھیک نہیں ہے۔ اخبار سچی خبروں کے لئے ہوتا ہے۔“

”اسے ایک روز سنبھال لو۔“ میں نے فوراً لان کاٹ دی۔ اگلی سڑا ہی تھا کہ زبرد پھر چنچا۔ میں نے جھٹکے سے

ریسیور اٹھا کر کہا۔ ”اب کیا ہے؟“

”تصور تمہارے پاس ہے؟“ میری مطلوبہ آواز آئی۔

”کیونکہ دکھاؤں۔“ میں نے کہا۔

”تم کہہ رہے ہیں بچے پر یقین رہتا۔“

”مجھے یہ بھی خوب دہی۔ دلہن خود چل کر دھاکے گھر آئے۔“

”بکواس نہیں۔“ دوسری جانب سے سلسلہ قطع ہو گیا۔

میں پھر کراہی کراہی کر بیٹھ گیا۔ مجھ پر بعد ایک کارٹر کرگٹ پر دی کہ میں نے جا کر گیت کھول دیا۔ کارنامہ داخل ہوئی اور پورچ میں پہنچ کر گٹ۔ پہلے آصف تراتری پھر جیلہ اور صادق۔

”آئے اندر چل کر بیٹھے ہیں۔“

آصف بولی۔ ”وقت نہیں ہے۔“

”دن آتے تو دھاکے گھر اور کہے وقت نہیں۔ یہ تو عجیب سی بات ہے۔“ میں نے معنوی بیار میرے لہجہ میں کہا۔

”نفاق نہیں۔“ آصف نے پھر کہا۔

”مذاق کون بہت کر رہا ہے۔ ہم تو عیون ساتھی ہیں۔ جنم جنم کا رشتہ ہے۔ تم چور ہو میں سپاہی۔ تم قانون

سنگن ہوا رہی میں قانون کا محافظ۔ اسی لئے تو مولانا نے ہم دونوں کو ایک دھور میں باغ عا ہے۔“

”چیل چیل اوروں کی۔“ آصف نے اتنا ہی کہا تھا کہ اچھل پڑی اگر میں اسے سنبھال نہ لیتا تو گھر دو

پڑتی۔ پوتول کے دھماکے نے اسے بولکا دیا تھا۔

”سنو مسٹر راتیل میرے آدمیوں نے اس بچے کو گھر لیا ہے فوراً ان لڑکیوں کو میرے حوالے کر دو۔“ پوتول

تھا ہے ہوئے ایک شخص نے کہا۔

”کیوں بھائی۔ میری تو بوی ہے تمہاری کون ہے؟“ میں نے کمال الطیمان سے کہا۔

اس شخص نے دوسرا فرمایا کہ اس بار بھی نشانہ ہمارے سر پر لٹکا ہوا فالوس تھا۔

”میرے بھائی خواہ خواہ کیوں میرے بیٹی فالوس کے دشمن ہو گئے ہو۔ تمہیں دھماکے کی آواز پر کوئی آنہ

جائے۔“

”مڑک کے دھولوں سے میرے پر میرے آدمی تعینات ہیں۔ رہا پڑوسیوں کا سوال تو جناب یہاں کوئی کسی کے

پھندے میں نہیں پڑتا۔“ آخرت بھائی چارے کا زمانہ کب کا لگ گیا۔

”ایسی بات ہے تو یہ لو۔“ کہتے ہوئے میں نے کمال پھرتی سے آصف کو کمرے میں دھکا دیا اور خود کو گراتے ہوئے لوٹ لگا چلا گیا۔ ”میں گرتے دیکھ کر آصف اور جیلہ نے بھی ہلڑ کے آؤ کی سی۔ پوتول بلاتا ہوا وہ شخص برآمدے کی جانب دوڑا تھا کہ میں نے سٹیج بھادی لان کی جھڑیوں کے پیچھے سے کوئیس والے نکل آئے۔

”خبردار پوتول پینک دو درہ کو لی ماروں گے۔“ ایک پانی نے لگا کر۔ اس شخص نے گھر کا پیچھے دیکھا

اور اس پر سنسنہ سا چھا گیا۔ آٹھ ٹائیں اس کی جانب اٹھی ہوئی تھیں۔

”اسے بھڑکی لگا کر اندر لاؤ۔“ میں نے ایک پانی سے کہا۔

”میں..... ہم چارے ہیں۔“ آصف نے کہا۔

”میری جان! تم کہاں تھیں؟ کیا یہاں کا تعیناتی تمہارے لیے تو تھی۔“ میں نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

پھر پڑ بولنے والی صادق نے مجھے یوں دیکھا کہ باسر دلش کرنا ہتی ہوئیں کچھ ہی نہیں۔ جیلہ بھی خاموش تھی۔

”چلو۔“ میں نے اسے اندر دھکیلا۔ جیلہ اور صادق بھی ساتھ آگئیں۔ میں نے فریج سے مٹھائی نکالی۔ ان

کے سامنے رکھی اور بولا۔ ”مٹھانے چھڑا کر دیکھو کہ میں ایک لڑکی خبر سناؤں۔“ تینوں نے چونک کر مجھے دیکھا۔

”کھاؤ؟“ میں دباؤ۔ ”اس دن تم کو چلا رہی تھیں آج میرا حکم مانو۔“

تینوں کا ہاتھ پٹنے لگے۔ مٹھائی ختم ہوئے ہی میں نے کہا۔ ”میری بیگم جان! اب بھڑکی بھین لو۔“ پھر میں

نے سرعت سے پوتول کو لگایا اور زور سے نکارا۔ ”گل خان! انھیں گرفتار کرو۔“

دروازے پر کھڑے پوتول والوں نے اندر داخل ہو کر لڑکیوں کے ہاتھوں میں بھڑکی لگا دی۔

تھانے کی ایک لاک میں وہ شخص بند تھا جس نے مجھ پر فائر کے قبا جیکہ تینوں لڑکیاں ایک دوسرے

کمرے میں کمری میں اس لڑکیوں کو بیکھنے کی افران آج گئے تھے۔ یہ معمولی لڑکیاں ایسا مصوم چہرہ اور کوت

ایے قابل غفلت! انھیں سب ہی ملامت سے دیکھتے تھے۔ کئی افسروں نے لڑکیوں سے بہرہ دے کے بارے میں

پوچھا اس دوسرے قیدی کے بارے میں پوچھا لیکن انھوں نے اس بات سے لاعلمی ظاہر کی۔ اس شخص کے

بارے میں تو خود مجھے بھی جس تھا کہ وہ کون ہے اور انھیں ساتھ کیوں لے جانا چاہتا تھا۔ میں نے یہی سوال اس

فحش سے بھی کیا تھا لیکن اس نے تو خاموش رہنے کی قسم کھائی تھی۔

اس وقت بھی میں اس کے سامنے کھڑا پوچھ رہا تھا کہ کس لئے لڑکی کو لے جانا چاہتے تھے۔ تبھی اہلیاں

بیتنے کی آواز سنائی دی۔ سلوٹ کی آواز سننے ہی میں نے مڑ کر دیکھا۔ آئی جی سلطان خان کے ساتھ ایک بھاری

بدن کا شخص تھا، وہ دونوں اندر داخل ہو رہے تھے۔ میں نے بھی سلوٹ کیا۔ وہ جا کر کرسی پر بیٹھ گئے۔

”کیسا کچھ تینوں لڑکیاں ہیں؟“ آئی جی صاحب نے پوچھا۔

”جی ہاں!“ میں نے جواب دیا۔ ساتھ والا شخص بڑی دھپسی سے لڑکیوں کو دیکھ رہا تھا۔

اسی وقت فون کی گھنٹی بجی۔ میں نے آگے بڑھ کر بیٹور اٹھایا۔ دوسری جانب سے بولنے والے کا نام سننے

ہی اچھل پڑا۔ ”کیسا..... تم..... شیر خان“

شیر خان کا نام سننے ہی آئی جی بھی چونک گئے۔ شیر خان ایک ایسا نام تھا جس سے پورے ملک کی پولیس

واقف تھی۔ وہ مفیات کی دنیا کا تاج بادشاہ تھا۔

شیر خان پورے ملک کی پولیس کو طلب تھا۔ آئی جی نے ہاتھ بڑھا کر یہ بدو تمام لیا اور بولے۔ ”مکون ہو تم؟“

”میں شیرخان بول رہا ہوں۔ چودھری کو رہا کر دو۔“

”تم جھوٹے ہو۔ شیرخان کا نام لے کر بھی تم کامیاب نہیں ہو سکتے۔“

”مگر تم نہیں چھوڑو گے تو ہم خود ہرا کر لیں گے۔ ابھی ایک نوجوان لڑکی آئی ہے۔ وہ آکر اسے چھڑا لے جائے گی۔“ دوسرے جانب سے ریسپورڈر کھڑکیا گیا۔

”کھانے کے مذاق کیا ہے۔“ کہتے ہوئے آنی جی صاحب باہر نکلے۔ جاتے جاتے اپنے دوست سے کہہ گئے تھے کہ وہ بیٹھے راز دھنکا کر اسے جانتے جاں گئے۔ ہم بھی اسی فن کا لکھنا تھا۔ کھانا کھا کر تھے کہ وہ لڑکی بیٹھنے لگی۔ وہ آنی جی صاحب کے ساتھ اسے والے شخص کی بیٹی ٹھنکے تھی۔ اس نے آتے ہی کہا۔ ”بیٹی کی جو دھڑکی کچھ بڑبڑاتی ہے۔“

“تمہارا بیٹا ہے”

”جی ہاں! میں بوش ڈھواں کھڑکی میں چوڑھی کو چھوڑ دیتے ہیں۔ نہ میں پیچھے دھڑک مار کر بلب توڑ دوں گی۔“

”نہیں کیوں اس نے کئی بات کا گہرا اثر ہوا۔ آئی جی صاحب کے دوست کا چہرہ تاریک ہو گیا۔ انھوں نے پھنسی آواز میں کہا: ”اے چھوڑ دو۔“

آئی جی صاحب کے دوست کا حکم - اسے لانے کی کس میں ہمت تھی پھر بھی قانون روک رہا تھا۔ ہمیں پس و پیش کرنا پڑا کیونکہ آئی جی کے دوست نے پستول نکال لیا۔ ہم تیار نہ تھے اس نے چودھری کو آڑا کر لیا۔ چودھری کو گتھفتہ اسے ساتھ لے گئے۔

وہ مجرم کی مدد کرنا جرم ہے۔ مجرم کو تباہی دہانے والے انفریکشن نہ ہو۔ قانون اسے معاف نہیں کر سکتا۔ یہی صاحب کے دوست عثمان پر مقدمہ قائم کیا اور وہ گرفتار ہو گئے۔ انھیں شاد پور چار کے گرفتار کیا گیا تھا۔ وہاں ہاکر وہاں پیچھے ہوئے تھے۔ ان کے کیل جانے سے مجھ پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ میں تو اپنی تین رشاہاں تھا۔ مجھے جو کامیابی ملی وہ معمولی تھی۔ اتنی بڑی واردات کے مجرموں کو گرفتار کر کے شہرت حاصل کی تھی۔ اخبارات نے پہلے صفحہ پر تقریف لکھی تھی، پھر تھانے کے جہن پولیس انفریکشن کا تھانے میں اسے جہن کی تھی کہ کچھ نہیں پایا تھا۔ میرے سامنے عثمان صاحب کا فضل سوائے نشان نہ ہوا تھا۔ یہ بات بھی کہ وہ اپنی بیوی کو دل دیا جس سے عزیز رہتے تھے لیکن اس کی ایک چھوٹی بات کہ قانون کی کٹی کر بیٹھے یہ بات مجھ سے برے تھی۔ پھر گفتگی کی بات بھل تھی۔ وہ ایک فضول سا جملہ تھا کہ بلب تو دووں گے اس کی جگہ سے ایسی کوئی بات تھی۔ جس نے انھیں اتنا بزدل اندم اٹھانے پر مجبور کر دیا تھا۔ اس راز کو کھینچنے کے لئے میں ایک دن چل چکا تھا۔ وہ لی کلاس کے قیدی تھے۔ انھیں تمام آسٹریٹر ہسپتال سے ان سے ملاقات دینے کے لئے تھیلے نے ان لوگوں کے کا انتظام کر دیا۔ میں نے بسلاوا کر لیا۔

اس میں یہ ہیں۔ ان سے ملاقات ہونے کے لیے اس کے کمرے کا دروازہ کھول کر دیکھا۔ کسی کو نہ دیکھا۔
 "انکل! آپ میرے اس فریڈم سے دوست ہیں۔" میں کچھ دیر کے لیے رکا دیا اس کے لیے کہ بولا۔ "کسی کو نہ دیکھا۔"
 بات ہے جس نے آپ کو اتنا برا اقدام اٹھانے پر مجبور کر دیا تھا۔ مختلف کے جملے میں کسی کو نہ دیکھا بات پوشیدہ کی جس نے
 نے آپ کو ملا دیا تھا۔

عثمان صاحب خاموش تھے۔ ان کا جہرہ تاریک ہو گیا تھا۔ وہ سر جھکائے کچھ سوچ رہے تھے۔

عثمانی صاحب خاموش تھے۔ ان کا پہرہ تاریک ہوتا تھا۔ وہ سر ہٹاتے چلے۔

”میری زندگی اور موت کا سوال ہے بیٹے اس زخم کو مت کریدو۔ میرے ساتھ تم بھی رو پڑو گے۔ اس جملے

میں ہم دونوں کے لئے دمکی تھی۔ میرے ساتھ تم بھی تباہ ہو جاتے۔"

”میں..... میری تباہی؟“ میں نے حیرت سے پوچھا۔

”ہاں..... میں نے تمہیں بہت پہلے پہچان لیا تھا۔ اس لیے انا قریب آ گیا تھا۔ میرے غریب عزیز دوست کے بیٹے ہو۔ میں نہیں جانتا تھا کہ شگفتہ اور تم چھائی رہ لکھا ہے جاؤ۔ اگر اس کی بات نہ مانتا پھر بھی میں مجرم ٹھہرا دیا جاتا۔ کھر ایسے جی تباہ ہوتا ہے بھی۔ اس لیے میں نے آسان تباہی کا راستہ ڈھونڈ لیا۔“ پھر انھوں نے آہستہ آہستہ ہرے ہونے لگے۔ میں میری اپنی داستان سناؤ۔

میں خود بھی جانتا تھا کہ میرا اہل خانہ سے رنگا ہوا ہے۔ میں تو جیسے بیابانِ حرم کا ارکٹاب کہہ جاؤں۔ پہلے ہی قانون کی نظروں سے بچا ہوا ہرگز میری کی عدالت کو معاف نہیں کریگی۔ اسی خیال نے مجھے بے چین کر دیا تھا اور مجھے شکنتہ سے انسیت کی ہو گئی تھی۔ یوں بھی میرے بیان نے اے بجایا تھا۔ دادا نکلی میں لکھی رپورٹ نے ہی اے بجایا تھا۔ میں نے رپورٹ میں شکنتہ کا نام نہیں دیا تھا صرف اتنا لکھا تھا کہ اسی کی دوست عثمانی نے اے بجز کو فرار کر دیا تھا یہی وجہ کہ پولیس نے اسے گرفتار نہیں کیا تھا۔ لیکن اب مجھے اپنے افضل پر پندارت نہیں تھی۔ بلکہ شکنتہ پر پکارا ہوا تھا۔ اسی کی وجہ سے مجھے ایک نئی بات معلوم ہو گئی تھی۔ اب میں اپنے طور پر شکنتہ کے بارے میں تحقیق کر رہا تھا کہ وہ کس کے کہنے پر تھا۔ یہ تحقیق میری مہم چوری سے اس کا کیا کرتے تھا اب مجھے معلوم ہوا کہ وہ فحشا کی عادی ہے۔ یقیناً اسی کی اس زوروری کا بجز نے فائدہ اٹھایا تھا۔ چوری کا تعلق بھی فحشا فرشتی کے گرد سے ہے۔ اس کا اقرار شیر خان نے بھی کیا تھا اور شیر خان کے ہاتھ لگے ہیں۔ یہاں بات یہ معلوم بھی۔ اسی بد بخت کے بچے سے شکنتہ کو بھی نکالا جا سکتا تھا۔ جب وہ اسات سے بھاگتا رہا۔

کائی دیوگر کرنے کے بعد میں نے عثمانی صاحب سے کہا: ”آپ کو معلوم ہے قلعہ شیرخان کے گرد سے راستہ ہے؟“

”نہیں، غلط ہے۔ کسی اور نے شیر خان کے نام کا فائدہ اٹھایا ہو گا۔“

”آپ کو کسے ملے؟“

”مجھے؟“ وہ گھبرا گئے لیکن فوراً ہی انھوں نے اپنے آپ کو سنبھال لیا اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولے۔

میں ہر بات پر نظر رکھتا ہوں۔“

”کیا اس بات پر بھی آپ کی نظر ہے

”آں! وہ منشات کی عادی ہے؟“

”ہاں! اسے یات کان سے ملے گی۔ اسی نے اسے شیرخان کی بات ماننے پر مجبور کیا تھا۔“
”اسے کی طرح بچا لو۔ اگر وہ مرگئی تو میں بھی نہیں بچاؤں گا۔ اسے بدنامی سے بچانے کے لئے ہی میں نے
انتظار اقدم اٹھایا ہے۔“

”آپ مطمئن رہیں۔ میں اس کا علاج کراؤں گا۔“ کہتے ہوئے میں اٹھ گیا۔

اب سن رہیں۔ میں اس اعلانِ مراوں کا۔ ہے ہوئے میں اٹھ گیا۔
 اسی میں شگفتہ کو لے کر راجیل کلینک پہنچا۔ ڈاکٹر راجیل کا ہارملک کے معروف نفسیاتی معالج میں ہوتا تھا
 مجھے یقین تھا کہ وہ اس سخت سے چھٹکارا دلادے گا۔

گفتہ کو ان کے اسپتال میں داخل کرانے کے بعد میں پھر نشیات فروشوں پر ٹوٹ پڑا۔ اس بار میرا اعزاز جارا نہ تھا۔ میں نے ایک ہفتے کے اندر اپنے علاقے سے نشیات فروشوں کا نام و نشان مٹا دیا۔ میری کارروائی سے نشیات فروشوں میں افراتفری مچ گئی تھی۔ میرے اس اقدام سے میرے ہی ڈپارٹمنٹ کے کئی افسران ناراض ہو گئے تھے۔ یہ روایتیں کئی کئی ذرا بعد تر افسران نے میری شاباشی دے رہے تھے۔

☆.....☆

اس روز بھی میں ایک بڑی چٹلی پر ہاتھ ڈال کر لوٹا تھا کہ ڈاکٹر ڈارنیل گھبراہٹ ہوئے آئے۔ "میری پوتی" ہائے میری پوتی۔ "وہ رہا الغلط نہیں ہوئے۔"
 "کیا ہوا آپ کی پوتی کو؟" میں نے پوچھا۔
 "اسے کئی آنوا کر لیا ہائے میری پوتی۔"
 "ڈاکٹر صاحبہ پر کراچی ہے یا لاہور؟ وہ تو عام بات ہو گئی ہے۔ جب لوگ بارہ پرست بنیں گے تو یہی ہوگا۔"
 "دو سو نو واے تلاش کرو" وہ کراہے۔
 "عمر کیا ہو گی؟"

"تیرہ سال۔ میرے مرحوم بھائی کے بیٹے ہیں وہی تو ایک نشانی ہے۔"
 "اللہ پر ہر دوسرے میں انہی سارے قانون کو لارٹ کرتا ہوں۔ تاہم کیا تھا؟"
 "فہمیدہ نازی۔" کیا پاپا کا فرحت حسین اور..... اور وہ پچھلوں کی نازک ہے ہائے میری پوتی۔
 میں نے ساسی کو اس بانی پلانے کا حکم دیا اور افسران بالا سے رابطہ کرنے لگا۔ میرا دل کہہ رہا تھا کہ اس کے پیچھے شہر خان کا ہاتھ ہوگا۔ اسے خبر ملی ہو گی کہ گفتہ اسی ٹیکٹ میں ہے وہ ڈاکٹر کے ذریعے اسے آنوا کر لیا جاتا ہوگا تا کہ کچھ پر بابا ڈال سکے۔ میں نے کاشیوں کو اس کے اسپتال پہنچ دیا۔ ڈاکٹر کو بھی کئی کئی کے بعد واپس بھیج دیا۔

دس دن گزر چکے تھے نازی کا پتا نہ چلا۔ وہ کہاں ہے کس کے قفسے میں ہے اس کی خبر نہ ملی۔ میں نے ڈاکٹر سے بھی رابطہ کیا مگر وہ خاموش رہے۔ اسی ان کے چہرے کا مزین بن چکی تھی وہ سکرانا بھول گئے تھے مگر اب وہ مجھ سے پوتی کے بارے میں سوال نہیں کرتے تھے۔ ایسا لگتا تھا انہیں تو ارا پچانے۔ گفتہ کی حالت بھی اب سدھرنے لگی تھی۔ وہ پہلے ایسی ڈبی۔ ایک بجلی کا تھیں بھی نہیں کرتی تھی۔ جب بھی جاتا وہ پر سکون لگتی۔ پہلے نئے کی طلب اسے پہنچن کیے رہتی۔ وہ رات میں بھی جاگتی رہتی تھی اب اسے نیند آنے لگی تھی۔
 اس دن جب میں پہنچا تو وہ دوسری تھی۔ میرے پکانے پر وہ آنکھیں میاں کی اس کے آنکھیں نیند سے بوجھل جس مگر مجھ سے کہتے ہی وہ ہنسنے لگی اور بولی۔ "رائل ایک سکرےٹ ہاؤس کے" نئے کی طلب پہنچن کیے دوسری ہے۔
 میں نے سکرےٹ کال کر بڑھا دی۔ اس نے ایک سکرےٹ کال کر سلا کیا اور ڈبئی کو تھیل پر رکھتے ہوئے بولی۔
 "سارے سکرےٹ میں سرہ کیا ہیں مگر کچھ راز تھے۔"

تھیل پر دو کی شیشی اٹھائی پڑی تھی وہ ابھر کر سکرےٹ تک پہنچ رہی تھی کہ میں نے جلدی سے اسے اٹھا لیا۔ مجھے سکرےٹ اٹھانے کے بعد کہہ دی۔ "پلیز ایک اور سکرےٹ"
 میں نے ڈبئی بڑھا دی۔ اس نے سکرےٹ لیتے ہوئے کہا۔ "پلیز رائیل مجھے ایک ٹھنڈی بوتل لا دو۔"

میں اٹھ کر باہر نکل گیا۔ کچھ دیر بعد لوٹا تو وہ خستہ ٹھنڈی تھی۔ میرے ہاتھ سے بوتل لے کر چٹکیاں لینے لگی۔ مجھے تھانے پہنچنا تھا۔ اس لیے اٹھ گیا۔ باہر آکر بائیک اسٹارٹ کی اور تھانے کی جانب چل پڑا۔ کچھ ہی دور گیا تھا کہ میری بائیک کے سامنے ایک ہیرو چلی آگیا۔ اسے تھانے کے لئے میں نے پوری کوشش کی اس کوشش میں بائیک قبرستان کے گیٹ سے ٹکراتے ٹکراتے چلی۔ غصے میں ابلتا ہوا میں مڑا لیکن وہ ہیرو کچھ عتاب بھی نہ کر گی میرے ہاتھ سے ٹکرائے تو میں نہیں تھا وہ نہ ہی ہیرو نہ ہی کو اس طرح جمع ہونے نہ دیتا۔

کبھی کبھی تو مجھے حیرت ہوتی تھی غریب آباد پہلے سے حسن اسکو اتر تک ہیرو کچھوں کی جنت نظر آتی تھی۔ سیکڑوں کی تعداد میں ہر وقت جمع نظر آتے تھے۔ چہرے بھی نظر آتے تھے چار پانچ کی ٹولی میں بیٹھے نظر آتے۔ سب کا چہرہ ایک چادر سے ڈھکا ہوتا۔ ایک ہیرو کچھ پیتا پانی اس کے دھوئے سے لطف لیتے۔ یہ نظارہ میری طرح افسران بالا بھی دیکھتے ہوں۔ برابر میں ہی رہائشی رہنبر کا ہیڈ کوارٹر ہے ان جانا زوں پر اس کا اثر کیا پڑے گا کبھی کسی نے سوچنے کی زحمت نہ کی ہوگی۔ مگر اس دن میں باگل ہوا تھا۔ دودی میرے جسم پر تھی۔ وہی دودی جسے زہر بے تہ کرتے وقت ہم کھاتے ہیں کہ چم کا نام و نشان مٹا دیں گے۔ اس دودی کی لالچ رکنا ضروری تھی۔ میں نے قبرستان کے گیٹ پر پنی مارشل والی دکان سے ایک ڈیڑھا ڈیڑھا اور ان بد بختوں پر پل پڑا۔ دو جاکو ڈکڑے پڑے تو پانی نہ لگتے ہوئے سکرےٹ کو اٹھا کر دیکھا اور پھر وہ سب ایسے بھاگے گویا بھوت دیکھ لیا ہو۔ جھگڑا دیکھ کر سنار کی فرٹ کے آفس سے کچھ لوگ نکل آئے۔ میں نے انہیں اشارے سے بلایا۔ وہ زہر دیکھ کر کھڑے ہو گئے۔

"کیا نام ہے؟" میں نے ایک سے پوچھا۔
 "دوایہ سنگ۔"

"جسٹس شرم نہیں آتی تھارے علاقے میں یہ گندگی پھیلی ہے۔"
 "سر ہم تو خود پریشان ہیں لیکن کیا کریں آپ لوگوں نے ہی انہیں چھوٹ دے رکھی ہے۔" مانگل صاحب نے کئی بار حکام بالا سے شکایت کی اور میرے دوڑی آکر مکران ستارے۔

"نکل سے یہاں کوئی نہ پھنسے۔" میں نے بائیک پر بیٹھتے ہوئے کہا۔
 میں جاتا تھا کیا کیا چٹا بھائی ہیں جو تک سکا۔ وہ بے چارے کچھ بھی نہیں کر سکتے یہ لعنت اتنی آسانی سے تو ختم نہ ہو گی۔

تھانے پہنچ کر میں نے ڈبئی سے سکرےٹ نکالی اور ہونڈوں میں پھنسا کر تیلی جلائی۔ دو چار ش لیتے ہی منہ کا مزہ و جب ہو گیا۔ ایسا لگتا تھا کہ دو کا اثر سکرےٹ میں بھی آگیا ہے۔ اگلے سکرےٹ تھا جبوری میں اسے ہی پیتا پڑا۔ سکرےٹ ختم ہوتے ہی میرا سر پکڑنے لگا۔ آنکھوں کے سامنے نیلے نیلے دائرے ناچنے لگے اور میں نے تھیل پر سر رکھ دیا۔

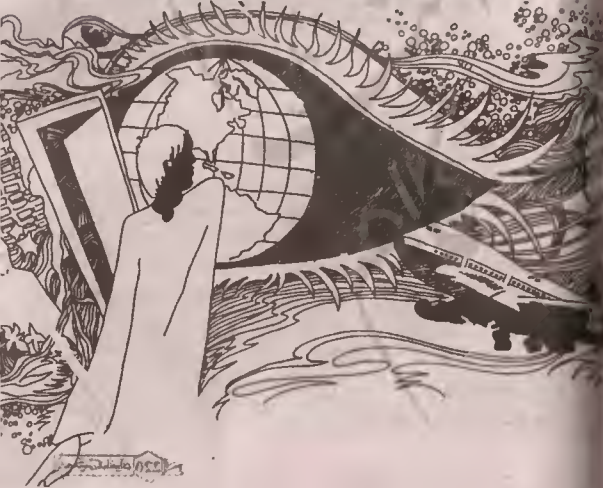
"ہی سسر اوشو۔" چھڑی کی جھنچھن نے مجھے سر اٹھانے پر مجبور کر دیا اور سامنے کھڑے شخص کو دیکھتے ہی میں گھبرا گیا۔ اس نے پی عارف مین کھڑے تھے۔
 میں نے کھڑے ہونے کی کوشش کی تو ایسا لگتا کہ میرے پیروں میں جان نہیں ہے میں لڑکھڑا گیا اور کرسی کے ساتھ فرش پر گر گیا اور پھر جب مجھے ہوش آیا تو میں اسپتال میں تھا۔ میرے بید کے نزدیک ایک پسلی بیٹھا تھا۔

شازی سعید منغل

تاشقین

حزینہ مدنی کا خیال
عالم رنگ و تماشا سے کُڑ
کوئی قیمت نہیں بیانی کی

حیرت، تجسس، ہمارا اور ستاروں سے جڑے بہت خاص طیلے کی مایوس گڑی



”مجھے کیا ہو گیا تھا؟“ میں نے پوچھا۔
”آپ نے ہیر دکن بی رہی تھی۔ جس کے لئے شام میں آپ نے عسی عکری میں مار پیٹ بھی کی تھی۔ اب آپ لائن حاضر ہیں۔“
”میں۔ میں نے ہیر دکن بی چھی؟“
”ہاں آپ نے“ ایس بی صاحب نے خود پکڑا ہے۔ ڈاکٹر نے بھی تصدیق کر دی ہے۔ میرا دماغ ہوا میں معلق ہو گیا تھا۔ میں ایسی غلطی شے کو ہاتھ لگا کر نہیں سکتا تھا میرا یہاں کیوں ہوا؟ میں نے تو دوا میں ہیکس سگریٹ پی تھی اور وہ دوا ڈاکٹر بنی پکلیس کی ضرورت ڈاکٹر کو دھوکا دیا ہے۔
میں نے باکٹ میں ہاتھ ڈالا۔ سگریٹ کی طلب ہو رہی تھی مگر سگریٹ ندھی میں نے سپاہی سے کہا: ”بھاک کر ایک پکٹ سگریٹ لے لو۔“
”لے لیتے ہیں۔“ اس نے سگریٹ نکال کر بڑھائی۔ میں نے سگریٹ تمام پی پھلاش لیتے ہی مجھے بالکل دیا ہی حزمہ لگا جیسے میں وہاں بی پکلیس میں بیٹھا سگریٹ پی رہا ہوں۔ میں نے حیرت سے سگریٹ کو دیکھا۔ وہی میرا براڑ تھا۔ میں سوچنے لگا پھر مزہ کیوں بدلا بدلا سا ہے۔ لگتا ہے منہ میں دوا کا ذائقہ باقی ہے۔ سگریٹ پی کر میں لیٹ گیا۔ مجھ پر غنودگی چھا رہی تھی۔ آہستہ آہستہ میں دنیا وافیہا سے بے خبر ہونے لگا۔
میری آنکھ رات کے دس بجے کھلی۔ بھوک پیاس مچ چکی تھی۔ صرف سگریٹ کی طلب تھی۔ میں نے اسٹول کی جانب دیکھا۔ وہاں ہنوز بیٹھا تھا۔ میں نے بھرا ایک سگریٹ طلب کی جو اس نے فوراً پیش کر دی۔ مجھے پھر دیا ہی حزمہ ملا لیکن اس بار وہ مزہ نہیں تھا۔ عجیب سے سرور کا احساس ہوا۔ میں پھر سو گیا۔ صبح اٹھا تو پھر سگریٹ کی طلب ہوئی۔ میں اس سپاہی کو تلاش ہی کر رہا تھا کہ میرے قاتلے کا ایس آئی تو قیق آ گیا۔ اس نے خلافتِ توغ سلام تک نہ کیا۔ میں جانتا تھا وہ مجھ سے حسد کرتا ہے میں نے اسے کئی بار لائن حاضر کر دیا تھا۔ اس بار مجھے لائن حاضر کیا گیا تو وہ پہنچ گیا۔ سرور میرا ذاق اڑائے آیا ہوگا۔
”کوہ ستر اہل کسی طبیعت ہے۔ مجھ تو خبر ہی ندھی کشمکش کے خلاف ہم چلانے والا ہی نشات کا کاما ہے۔“ اس کی زہریلی باتوں نے میرے تن بدن میں آگ لگادی پھر بھی میں نے جواب نہیں دیا۔ ڈال سے چٹا کر جائے تو حقیقت ٹھوکتا ہے۔ میں اس وقت زبرد تھا۔ اس لئے بھی خاموش رہ گیا۔
مجھے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے اس نے پوچھا: ”کسے تلاش کر رہے ہو؟“
”آگ مار ڈالتا۔“ میں نے دھیسے لکھ میں کہا۔
”گارڈ؟ تم کیا وی آئی ہو جو تمہیں گارڈ لے گا۔ شکر کرو کہ ایس بی صاحب کو رحم آ گیا اور تمہوں نے جہیں اسپتال پہنچ دیا مجھے حکم ملا ہے کہ تمہیں مگر پہنچا دوں۔“
”مگر وہ کیا؟“
”تم کس سپاہی کی بات کر رہے ہو۔ ٹھہرو میں نرس سے پوچھتا ہوں۔“

آگے کا احوال جاننے کے لیے
آئندہ ہمارہ شمارہ جون میں پانچویں قسط ملاحظہ فرمائیں

”لیکن تباہوں، مجھے لگا ہے،‘ فوق الفطرت اور تو ہم پرستی ان دونوں میں فرق عام لوگوں کو محسوس کرنا مشکل ہوتا ہوگا۔“ زلفی نے بڑے سچے کی بات کی تھی۔

[illegible]

”تاخون..... میں نے نہیں شادی تائیں جب میں رانیہ کے سلسلے میں پریشان حال! وہ اگر پھر میرا تھا تو مجھے ایک صاحب نہ تو کسی بزرگ کے بارے میں بتایا تھا۔ ناز بزرگ سے ملاقات کے دوران میری ایک اہلیہ سے ملاقات ہوئی جس نے شہزادہ کی لڑکی کا نکاح کیا۔ شہزادہ قوت کے گزیراؤں کا کیا ہے جو مکمل سے دادرسی اس کے گھر میں رہنے! آج کا جی سکون ختم ہو اور وہ بہت دن بھی اس مکان میں اپنی انجلی خوف و ہراس میں ملبس صورت لے گا۔ بعد ازاں میں جانتا تھا کہ میرا گھر کا بہت نام ہو گا۔ اہلیہ نے کہا کہ وہ اپنی انجلی کا تھا

اور اگر ملتا تو مکان کے بارے میں اس کو پہلے ہی سے پتہ چل جاتا تھا۔ بقول اس شخص کے ”میرے مکان کے سارے کمرے حیرت انگیز طور پر سرورہتے تھے اور ایک کمرہ تو ایسا تھا کہ اس میں بعض شخص داخل ہوتا اس کو فوری طور پر اُن کی بدھنی قوت کی موجودگی کا احساس ستانے لگتا اور اس کمرے میں سونے والے کو دُعاؤں رات کے وقت جیسے کوئی کمرے سے باہر لا کر اُن کی دعا کرتا اور دھنگ کے طور پر اس کی کوئی بدھنی بڑی چل رہی ہو تو فوری جاتی تاکہ وہ اُس کمرے میں دوبارہ سونے کی جرات نہ کر سکے۔ یہاں ایک سوال میرے ذہن میں اٹھ رہا ہے۔“

”وہ کیا؟“ وہ جلدی سے بولی تھی۔

”وہ یہ ہے کہ میں تو سمجھتا تھا کہ یہاں پاکستان، ہندوستان یا ایشیائی ممالک کے لوگ ہی اس طرح کی چیزوں کا شکار ہوتے ہیں اور بعض اوقات تو ان میں حقیقت بھی نہیں ہوتی صرف وہم ہوتا ہے لیکن کیا یورپ اور مغربی ممالک میں بھی مکان اور آسب کا جولی دامن کا ساتھ ہے؟“

”ابن علی کا نام کر۔“ ناشنوں نے خفیف مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ ”میرے دوست.....! یورپ اور مغربی ممالک تو توہمات اور حقیقت کے چکر میں ہم سے زیادہ پھنسے ہوئے ہیں۔ اگر میں تمہیں یورپ اور مغربی دنیا کی توہم پرستی کے قصے سنانے لگ جاؤں تو تمہیں حیرت کے شدید دھچکے لگیں گے۔“

”لیکن ان میں کچھ حقیقت بھی ہے جس کا ہمارا ساتھ ہو“ شاکر علی نے ہاتھوں کی بات کاٹنے سے کہا۔
 ”جی بالکل اصل کچھ بھی ہوتے ہیں اور میرا مکان تو کس آپ یا کسی اور شیطانی قوت سے بچانے کے
 لیے وسیلہ طریقہ انانے جاتے ہیں جو کہ ماہر تہذیب سے چلے آ رہے ہیں۔“
 ”مثلاً؟“ زکری نے فوراً سوال کیا تھا۔

اس چلتی رہنے والی آگ کے ذریعے برقرار رکھا جاتا تھا اور اس کی وجہ یہ ہے کہ ممالک میں یہ عقیدہ پایا جاتا ہے کہ گھر کے چولے میں جلنے والی آگ کو مقدس دیکھا جاتا تھا جو بعض علاقوں میں آج بھی چولے کی آگ کی حفاظت کرنے والے مقدس دیوتا کی عزت کی جاتی ہے کیونکہ وہاں کے لوگوں کا عقیدہ ہے کہ ہر دیوتا اس قدر غصے والا ہے کہ اگر حفاظت نہ کی گئی تو وہ ناراضگی میں گھر میں آگ لگا سکتا ہے اور وہی عالم ہے کہ گھر میں لوگوں کی تصویر اگر بغیر کسی وجہ کے گر جائے تو اسے موت کی دھمکا دیا جاتا ہے تاہم اس وارننگ کا اطلاق عموماً حامل تصویر ہوتا ہے۔ سفر کی پدید آمدن کے بعد تو اسے موت کی ایک آہنیے سے متعلق بھی ہے۔ بعض علاقوں میں یہ دستور ہے کہ کسی گھر میں موت واقع ہو جائے گی صورت میں گھر میں موجود تمام آگ بجھنے کی خوف سے ڈھک دیئے جاتے ہیں کہ کہیں روح آگنیے میں اپنا گھر نہ دیکھ لے ایسا ہونے کی صورت وہ دوسری دنیا تک طویل سفر میں وفات کی غرض سے خاندان کے کسی اور فرد کو بھی ساتھ لے جائے گی۔ اس کے علاوہ یہ بھی خیال کیا جاتا ہے کہ گھر میں آگنیے کا ٹوٹ جانا سلسلہ سال کے لیے بد قسمتی لاتا ہے۔ اس کاٹ لینے میں یہ عقیدہ پایا جاتا ہے کہ پھر اڑوں کی ہنسی اگر گھر میں رکھی جائے تو چڑھیں اور شیطانی دھبے گھر میں داخل نہیں ہو سکتیں۔ کچھ لوگ گھر کی چھت پر براہن لگاتے ہیں کیونکہ ان کے خیال میں اس طرح اگر آگ لگنے سے محفوظ رہتا ہے اور کچھ لوگ اپنے گھر کو آجیب سے بچانے کے لیے درخت لگا کر اس کے چاروں طرف سفید پھول لگا دیتے ہیں کیونکہ اس اعزاز میں درخت اور پھول لگانے سے گھر کو چاند کی دیوی آئی سس کا تحفظ حاصل ہو جاتا ہے یا پھر گھر میں سنہرے یا نارنجی پھول لگا کر گھر کو سورج دیکھنے سے محفوظ رکھ دیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ کچھ عقیدوں اور باتوں میں حقیقت بھی ہوتی ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ جہاں توہمات کی دنیا آباد ہے وہاں شیطانی قوتیں بھی کافی کارفرما ہوتی ہیں جیسا کہ شاکر علی صاحب نے بتایا۔ ”تاخونوں نے اپنی بات کے تسلسل میں ایک مرتبہ پھر صحابہ کے سنگا پورہ اور مکان کی مثال پیش کی تھی۔

”کسی گھر میں غیر مرئی یا شیطانی قوت کی موجودگی سے خطرہ کا کوئی اور بات نہیں کیونکہ ایسی قوتیں ”روحانی“ جسمانی ناپاکی غرض ہر قسم کا نقصان پہنچا سکتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے اب بھی پرانے زمانے کے لوگ گھروں میں ایسی چیزیں ضرور رکھا کرتے تھے جن میں موجودگی شیطانی قوتوں کو گھر میں آنے سے روکتی تھیں مثلاً گھوڑے کی نعل کر کے دروازے پر لٹکانے میں یہی خیال کارفرما ہوتا ہے کیونکہ نعل لوہے کی یا قوت حفاظتی چاروں قوت و خصوصیات کے ساتھ ساتھ مال اور دولت کی بھی خصوصیات رکھتی ہے اس طرح یہ نعل صرف تحفظ بلکہ خوش بختی بھی لاتا ہے۔ گھر تبدیل کرتے وقت عموماً نئے گھر میں سب سے پہلے نمک لاکر رکھا جاتا ہے کیونکہ نمک شیطانی قوتوں کے خلاف روحانی نکاح کا کام کرتا ہے۔ گھر کو شیطانی قوتوں سے محفوظ اور برکتوں خوشیوں سے بہکا کر کے لیے زمانہ قدیم سے یہ سلسلہ چلا رہا ہے اور پتلا رہے گا۔“

”بیکار بنالیا آپ نے۔“ شاکر علی نے کہا۔ ”میں ان کے علاوہ بھی ایک چیز ہے جو گھر یا گھروں میں رہنے والے کیوں کو روحانی اور جسمانی نقصان پہنچا سکتی ہے اور جسے بہت عرصے تک گھر میں رہنے والے سمجھتے ہیں کہ وہ جب سے اس گھر میں شفٹ ہوئے ہیں تب سے ان کے ساتھ مسائل چل رہے ہیں اور جب اسے گھر کی غمت سمجھتے سمجھتے بہت دیر ہو جاتی ہوئی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ چیز اور حقیقت کچھ اور ہوتی گی۔“ ”وہ چیز کیا ہے؟“ زلفی نے پوچھا۔

”چالو..... کالا دارو.....“ تاخون نے گھر سے لہجہ میں کہا تھا۔

”ہاں گھروں میں موجود شیطانی قوتوں کے علاوہ گھروں میں رہنے والے کیوں کو بھی شیطانی مقاصد کا شکار بنایا جاتا ہے ایسا کہ دشمن کی بنیادیں دنگو جھوکے باہر ہوتا ہے۔“ شاکر علی نے کہا تھا۔ ”کیا آپ لوگوں کو معلوم ہے میرے پاس جو افریقی سیاہ قلم از کے ہنڈل رکھے ہیں اس کے گھر کی دو درجہ میں اس کا شکار ہو کر مر چکی ہیں اور اس سیاہ قلم از کے ہنڈل کو میں بڑی ناگفتہ بہ حالت میں اپنے گھر لے کر آیا تھا اور پھر چند روز اس کی حالت میں مدھار آتا کیا لیکن اب بھی وہ اس واقعہ کو نہیں بھولا اور یہی سبھی تو اس پر ایک دورہ مار پڑتا ہے تو اس کو سنبھالنا مشکل ہو جاتا ہے۔“

”کیا چھک آپ کے جیسا ہی گڑا رہا ہے اس پر؟“ تاخون نے شاکر علی سے پوچھا۔

”ہاں، میں سب تو اس گھر سے بے خبر و خالی نکل آئے تھے لیکن ہنڈل کا کافر بھی یا پورا خاندان شدید متاثر ہوا۔ میں اس کے ساتھ افریقی چلا گیا کہ شاید اسے چاند نہ ہو مگر کوہ کر کے اس کو سکون آ جائے۔“

”ہوا کیا تھا اس کے ساتھ؟“ زلفی نے پوچھا۔

”آپ سب کے افریقی کے چاند کو روکیں گا کارستانی؟“ شاکر علی نے کہا۔

”اں ہاں ضرور گھر میں۔“ زلفی نے کہا جبکہ مردوں کے اثبات میں ہار گیا تھا۔

”ہنڈل رکے بتایا تھا کہ وہ کسی گھت میں رہتے تھے ان کے ساتھ ان کی ایک فریادی شدہ خالہ بھی رہتی تھی۔ وہ مریوں کے اٹھارے بیج کے بچپنی میں اور ان کی بہت مدد کرتی تھی ایک دن اس کی دامن ناگ میں شدید درد اٹھا جو بڑھتی ہی گئی کہ وہ چلنے پھرنے کے قابل نہ رہی لیکن اس نے پھر بھی لاشی کے سہارے اٹھارے بیج کرنا اور چیتنا چھوڑے۔ وہ بیج نکل جاتی اور شام چلے واپس آئی۔ ہنڈل کے والد نے اپنی بہن کی حالت کے پیش نظر اسے روکا لیکن اس نے اسے روکا کہ وہ ضرور دے گی کہ وہ جس گھر میں رہتی ہے اس کا فرض ہے کہ ان کے لیے کچھ کرے۔ خبر اس نے کام چاری رکھا لیکن اس کی والدہ روزانہ ناک خراب ہونا شروع ہوئی اور پھر کچھتے ہی دیکھتے دوسری ناگ بھی خراب ہو گئی یہاں تک کہ وہ چلنے پھرنے سے بالکل معذور ہو گئی اس کی ماں اسے ایک ڈاکٹر کے پاس لے جاتی رہی لیکن کوئی فائدہ نہ ہوا تھا۔ وہ دن دن کمزور اور لاغر ہوتی چلی گئی تھی کہ وہ اپنے بستر سے بھی نکل سکتی تھی اور پھر اس کی خالہ ایک دن موت کی دوا دیں اور چل گئی تھی۔“

”ہنڈل کے بچپن میں رہتا تھا اس کے برابر وہ ایک ہندوستانی رام رہتا تھا وہ ہنڈل کے ماں کے پاس آیا اور اسے بتایا کہ آپ کی بہن کی موت میں وجہ سے ہوئی ہے کیونکہ میں نے خود ایک چاند گر لاکر کو آپ کے راستے میں کالے چاند کی پڑائیں کرتے دیکھا تھا۔ آپ کی بہن جو بھی اس پر سے گزری ہوئی چاند نے اپنا کا سر دیا اور وہ تلفیق میں مبتلا ہونے کے بعد مر گئی۔“

”میری ماں اور باپ یہ بات ماننے کو تیار نہیں تھے۔“ ہنڈل نے غصہ کی سانس لے کر کہا تھا۔ ”وہ ان باتوں پر یقین نہیں رکھتے تھے انہوں نے اس شخص سے پوچھا کہ پڑیا میں ایسا کیا ہو سکتا ہے جو اس چاند گر ڈاکٹر نے فون کی کسی؟ اس ہندوستانی رام نے بتایا کہ اس پڑیا میں آپ کی بہن کے بال اور ناخن ہوں گے۔ افریقی میں چاند گر ڈاکٹر نے اسے معاف نہ کر کے تھے ہیں اور تحفظ عملیات کر کے وہ چاند گر پڑیا تیار کرتے ہیں۔ پڑیا جس شخص کے لیے ہوتی ہے اس کے راستے میں فون کرتے ہیں جس پر سے وہ گزرتا ہے اور بیماری کی حالت میں مر

اور جمل چلا گیا۔“

شاگرد کی زبان بے ہنرک کی اتنی فحاش روزِ زندگیٰ نہ کر ماحول پر ایک بوجھل ماسکوت طاری ہو چکا تھا۔
 ”پورا کھر کھنا خان!.....“ وہ..... بے چارہ غریب ہنرک..... ”لفٹی کو اس سیاہ فام لڑکے سے بہت ہمدردی محسوس ہو رہی تھی۔“

.....

وہ ایک نہایت خوبصورت ماضیاتی مقام تھا جہاں تاجِ نظر درخت ہی درخت نظر آ رہے تھے۔ درختوں کے اس جنگل کے درمیان ایک خوبصورت صاف ستھرا درمیانِ راست دکھائی دے رہا تھا۔ وہاں ایک بہت شاندار فام ہاؤس تھا جو کہ پورے چاندنی اس روشن نرم چاندنی نیمبر کی رات میں آنے والے لمہانوں کے سوا کہ کا مختصر تھا۔ درختوں اور جنگلی بیڑوں سے ڈھکے اس خوبصورت فام ہاؤس میں آج تاشون کی طرف سے اپنے دوستوں کے لیے ایک ضیافت کا انتظام کیا گیا تھا۔ مہمان، دھڑلے دھڑلے شروع ہو چکے تھے۔ زلفی اورانیہ کے لیے بھی یہ ایک سرگرم ترین گشت تھی کہ تاشون کی اس خستہ خوبصورت مقام پر اس طرح ضیافت کا انتظام کرے گا۔ اس وقت ایک خدمت گار فام ہاؤس کا پورا دروازہ کھول کر ملا تھا تو ان کو نہایت احترام کے ساتھ اندر بھیج رہا تھا۔ اندر دیکھ کر وہ قدیم ماحول کے ساتھ نہایت نفاس اور خوبصورتی سے ڈرب و زنت کی کمی۔ خوبصورت ممر پر کسی فرنیچر کی بلوری آئینوں اور حسین نقشِ فریچر میران کے ذوق میں اپنی جھلک مردود رکھلائی تھی۔ فام ہاؤس کی سادہ گر کرسیں زیب و زینت میں بھی مری تہذیب کی ایک خوبصورت جھلک مود جو تھی۔

”یار کمال کر دیا تم نے ذاتی چہرہ تم نکلے۔“ زلفی نے حسین آئینہ نگاہوں سے چاروں طرف دیکھتے ہوئے کہا تھا۔
 ”اس میں میر کوئی بات نہیں ہے اس فام ہاؤس کی تلاش خریداری اور زینت عمار اور مونگا کی سرہون منت ہے۔ یہ جنگل مقام مجھے بہت اچھا لگتا ہے اور یہاں جنگلی پھولوں کی بنگ کی تو کیا بات ہے انسان کو پتہ نہیں کہاں پہنچاؤ دیتی ہے بلکہ اپنے آپ سے ملتا دیتی ہے۔“

”جی“ مجھے تو یہ جگہ بہت پسند آتی ہے۔“ زلفی چاروں طرف گھوم پھر کر ان لوگوں کے پاس آئی تھی۔ ”ج“ تاشون بھائی خود سے ملاقات ہو سکتی ہے یہاں؟“ زلفی نے جذب کے سے عالم میں کہا تھا۔ اسی وقت چھتھ اور مہمانوں کی آمد ہوئی تھی۔ تاشون ان کے استقبال کے لیے آگے بڑھا تھا۔ آنے والے مہمانوں میں شاگرد کی اور وہ اپنی کسی مثال تھے۔ ڈوبائی کود کیم کہ بہت خوش اور حیران ہوئے تھے۔ سرے بتایا تھا کہ وہ دینکھو اندر کی لڑکی کی اس اجابک ہی آئینہ نگاہوں کی اور اب دور دور پہلے ہی واپسی ہوئی تھی۔ اسے دباں کے درمیان دیکھ کر سب ہی کو خوشگوار حیرت ہوئی تھی۔ اسی وہ ایک دوسرے کا حال احوال تو پوچھ رہے تھے کہ چاکا کی تاشون کے دربان نے اسے ایک مستطیل باکس لاکر دیا تھا جس کے ساتھ ایک چھوٹا سا کاڈر منسلک تھا۔ اس پر بھیجے والے کا نام درج تھا۔ وہ گفت باکس پر ڈیکر گفت بھیجے میں لپٹا ہوا تھا۔ تاشون نے مجھ دیر سوچ نظر توں سے اس گفت باکس کو دیکھا اور پھر اسے اندر رکھنے کا اشارہ دے کر اپنے مہمانوں کی میزبانی کرنے لگا۔

رات گیمگتی جاری تھی اور موسم بہت خوشگوار تھا کیونکہ اس وقت پہلی چھوڑی پڑ چڑھ رہی تھی اور پھر جب دیر دھیرے تاشون کے مہمان خستہ ہو گئے تھے زلفی نے اسے دوبارہ اپنی اور شاگرد کی عمر کی فرائض پر اس رات وہیں

جاتا ہے..... اگر آپ مجھے اجازت دیں تو میں یہ پڑیا نکال کر جلا دوں؟ کیا کرنے سے جس نے جادو کر دیا ہے وہ آدھے گھنٹے میں یہاں حاضر ہو جائے گا۔“

”میرے باپ نے رام کو اس بات کی اجازت دے دی تھی وہ یہ دیکھنا چاہتے تھے کہ کرام جھوٹ بول رہا ہے یا جگ؟ رام نے اپنی ذہنی روایات دوسمات کے تحت پوچھا تھا کہ ایک کمال کی کسی اور مری خانے کے راستے میں چاکا ایک جگہ گھومتے کے بعد وہاں سے ایک پڑیا نکالی گئی جس پر ایک ڈوری لٹکی ہوئی تھی۔ اس نے ہمیں ہدایت دی تھی کہ اسے ہاتھ نہ لگاؤ اور پھر اس نے پڑیا کو کمال پر رکھ کر دکھا دی تھی۔ جو مری وہ پڑیا نکالی تھی ایک بدبودار دھواں پیدا ہوا تھا اور تقریباً بیس منٹ بعد میری ممانی ہمارے گھر آنے لگی۔ وہ جھوٹ بولی تھی۔ ان کا نام اپنا تھا۔“

”یہی وہ عورت ہے جس نے جادو کر دیا تھا۔“ رام نے میرے باپ سے کہا تھا۔ ”لیکن وہ یہ بات ماننے میں تردد اس لیے کر رہے تھے کہ میری ممانی اپنا ناقہ بھی تو یہاں آ سکتی تھی۔ بہر حال پھر رام نے میرے پاس سے کوئی اور بات نہیں کہی اور اپنے حکمت واپس ہو گیا تھا۔ اس تمام صورت حال میں تاشون کا اسل پھلو پھلو نکلا جب میری ممانی خلیا جو چندہ سال کی عمر کو پہنچی تھی اس کا چاکا بہت بے گلی۔ ایک بلیا ایک بہت خوبصورت لڑکی تھی اور اس کی خوبصورتی اور مضمومت کی وجہ سے اسے اس کو میں بھی سب بہت پسند کرتے تھے اور وہ ہماری ممانی اپنا کی جی جاتا تھا۔ یہ زیادہ سنسن کی جس وجہ سے ناٹانیا بھی اسے بہت چاہتے تھے اور یہی وجہ تھی جو ممانی اپنا کی جی جاتا تھا۔ یہ زیادہ حسرت کی اور خلیا شیدہ بھی پڑھتی تھی۔ میرے باپ شیدہ بھی پڑھتا تھا۔ انہوں نے خلیا کے علاج میں کوئی کسر نہ تھا۔ ہر کسی کی پڑھتی وہ دیکھتے ہی دیکھتے خال کی طرح دونوں ناخون سے ملوچ ہو گئی تھی۔ اب میرے باپ کو رام کی باتوں میں کچھ چٹائی محسوس ہوئی تھی۔ انہوں نے فوراً اس کو باکر تمام صورت حال بتائی تھی۔ اس نے میری ممانی کا قصہ کرنے کے بعد یہی کہا تھا کہ اس پر جادو نہ کر دیا گیا ہے۔ میرے باپ نے خلیا کو بچانے کے لیے رام کو تمام ممکنہ اقدامات کرنے کی اجازت دے دی تھی۔ رام کچھ دیر تک کچھ چھڑنے کے بعد ہمارے گھر کے چکن کی میزبانی کی طرف گیا تھا اور وہاں دکھائی شروع کر دی تھی اور وہاں سے دیکھی ہی ایک پڑیا نکالی گئی جیسی پڑیا رام نے اس سے پہلے میری خال کے گزرنے والے راستے سے نکالی تھی۔ میری ممانی خلیا چکن کی میزبانی کے پاس سے روزانہ گزرتی تھی وہاں سے گزرتے تو گھر کے تمام افراد ہی تھے لیکن یہ جادو خلیا کے نام کا تھا اس لیے اس کو ہی نقصان پہنچا تھا۔ رام نے خلیا کی طرح اس پر پڑیا کو گم لگادی تھی اور پڑیا کے چلنے کے تقریباً آدھے منٹ بعد ہی ممانی اپنا ہمارے گھر آ گئی تھی اور انہوں نے کہا تھا کہ میں خلیا کی طبیعت دریافت کرنے آئی ہوں۔ اب میرا باپ انجانہ کچھ کچھ پوچھا تھا۔ اس نے ممانی سے صاف صاف بات کی تھی کہ ”میں تمہاری کالے رنگ توں کا ظلم ہو چکا ہے۔“ میری ممانی پہلے تو یہ بات تسلیم ہی نہیں کر سکی تھی لیکن ان کے انکار پر رام نے ان پر کچھ بڑھ کر چھوٹک ماری کی اور پھر چاکا کی ممانی کے اندر سے بدبو کے پھینکے اٹھنے شروع ہو گئے تھے اور ممانی نے فوراً وہی پتھر اتر کر لیا تھا کہ وہ یہ خلیا کو جان سے مارنا چاہتی ہیں اور خال کو بھی انہوں نے کالے جادو کے سبب مردوا دیا ہے۔

ممانی نے جرم قبول تو کر لیا لیکن خلیا کو بہت دیر ہو چکی تھی اس کی زندگی اگلے دن ختم ہو گئی..... خال کی طرح خلیا بھی دینا سے پہلی گئی..... میری اس صدمے سے تمہا پاگل ہوئی اور اس نے پھر ہمارے گھر سے کھیت میں بے گزین میں چھلا لگ لگادی..... میرا باپ اپنے گھر کی تہا ہی برداشت نہ کر سکا اس نے میری ممانی اپنا کو جان سے مار دیا

علم ہے یہ انسان کے پوشیدہ رازوں کا انکشاف ہی نہیں کرتا بلکہ اس کی اخلاقی اور ذہنی صلاحیتوں کو بھی جلا بخشتا ہے اور مستقبل کے لیے ایک مشعل راہ کا کام دیتا ہے۔ راستوں کی دشواریوں سے آگاہ کرتا ہے اور آپ کو حالات کے مطابق فیصلہ کرنے کے قابل بناتا ہے۔ مریخ اور زحل اس کے دو بڑے اہم ستارے ہیں جن کا میں نے رانیہ کے حوالے سے ذکر کیا ہے جس میں زحل شخص اکبر ہے لیکن مریخ کو بھی اکثر شخص ہی مانا جاتا ہے جبکہ اس کے اثرات اچھے بھی ہو سکتے ہیں لیکن کبھی کبھی اور رانیہ کے پیدائشی ستاروں کے اجتماع میں مریخ اور زحل شامل ہیں یہ اس وقت ایک ہی برج میں تھے۔ سیل شیا کو اپنا جادوئی عمل پورا کرنے کے لیے رانیہ کی بطور نجی بہت ضرورت ہے۔ چنانچہ جب جب یہ وقت آئے گا تب ہی وہ اپنا یہ کام کر سکے گی۔ مریخ ایک آتش کوکب ہے زائچے میں موجود بارہ گھروں کا چکر تقریباً ڈیڑھ سال سے دو سال میں پورا کرتا ہے۔ قدیم تاریخ میں مریخ کو آبی بروج کا حاکم سیارہ کہا جاتا تھا یہ آبی بروج سرطان، دلو، حوت ہیں اور یہ خیال کیا جاتا تھا کہ مریخ کی اچھی طاقتیں اس کی شیطانی طاقتوں سے بڑھ سکتی ہیں کیونکہ بانی آگ کو شہنشاہ کرتا ہے لیکن بعد میں ماہرین نجوم نے اسے ایک آتش کوکب قرار دیا اور آتش بروج کا حاکم یعنی حمل، عقرب کا حاکم سیارہ قرار دیا۔ بارہ بروج میں سے کچھ خاص بروج ہیں جہاں مریخ خاص خصوصیات کا حامل ہو جاتا ہے مثلاً مریخ جب برج حمل پر ابتدائی دس درجات پر پہنچتا ہے تو وہ اعتماد، قوت، طاقت، جرات، بے باکی، عالی ظرفی، جنس مخالف کے لیے کشش دیتا ہے جب مریخ جواز کے 10 سے 20 درجات پر پہنچتا ہے تو وہ محنت کش اور ایسی زندگی دیتا ہے جس میں جدوجہد کی طاقت کی ضرورت ہوتی ہے جبکہ برج اسد 20 ویں درجے پر مریخ کی فطرت بالکل بدل جاتی ہے۔ یہاں وہ امن سے محبت کرنے، دوستی اور محبت کا متلاشی ہوتا ہے۔ مریخ برج عقرب کے 10 درجے پر پہنچتا ہے تو لاقانونیت، جھگڑا، فساد کرنے والا، قاتل، ڈاکو، غارت گر بن جاتا ہے۔ مریخ جب برج جدی کے 10 سے 20 درجے پر پہنچتا ہے تو اس میں ایک غم ناک سنجیدگی آ جاتی ہے یہاں وہ ناممکنات کے پیچھے بھاگنے والا بن جاتا ہے یعنی ایسا انسان ہمیشہ خود کو دھوکہ دے گا اور ہمیشہ مایوس اور ناامید رہے گا۔ مریخ برج حوت کے 20 سے 30 درجے پر پہنچتا ہے تو عاشقوں کا بھیس بدل لیتا ہے دیومالائی قصوں میں مریخ کو زہرہ کا عاشق بتایا گیا ہے۔ مریخ کی ایسی پوزیشن میں پیدا ہونے والا شخص جنس مخالف سے بے اندازہ محبت کرنے والا، جھگڑوں سے بچنے والا اور زندگی میں توازن قائم رکھنے والا ہوگا جبکہ سرطان کے 22 ویں درجے پر پہنچتا ہے تو وہ وبال میں آ جاتا ہے۔ (علم نجوم کی ایک اصطلاح ہے وبال میں آ جانا۔) اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اچھے کاموں کے لیے مریخ کی قوت کمزور ہوگئی ہے جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ مریخ کی اس پوزیشن کے تحت پیدا ہونے والے آدمی میں ہمت و جرات، الواعز، استحکام کا فقدان ہوگا۔ وہ اپنے ارادوں میں کسی انجانی خوفزدگی کا شکار رہے گا جس کا نتیجہ خراب نکلتا ہے۔ مریخ ماضی پرست نہیں ہوتا اس کے لیے ماضی مچکا ہے، زائچہ پیدائش میں مریخ کی اچھی پوزیشن آپ کو ماضی کے مقابلے میں حال اور مستقبل کو اہمیت دینے والا بناتی ہے۔ نئے آغاز نئے کاموں کی خواہش پیدا کرتی ہے اور وہ قوت عمل دیتی ہے جو ہمیں مشکلات سے بچاتی ہے۔“

حیرت، اسرار، تجسس اور علم و آگہی
سے آباد اس سلسلے کی دلچسپ کڑی
آئندہ ماہ ملاحظہ کریں۔

سلیم فاروقی

آتشِ جوانی

شاعر کا خیال

سو پیکال تھے پیسٹ گلو جب چیمپری بیکاری لے ہم نے
سو تیر ترازو تھے دل میں جب ہم نے قلم آقا کر کیا

ایک شاعریت و جوانی کی سرگزشت عاں کے دل میں انتقام کا جولا کی نگرہ ہاتھ پیر 2

خلاصہ

عمران اور ارسلان دو بھائی ہیں ایک دوسرے سے شدید عہت کرنے والے نہایت جرأت مند اور اپنی عزت و انا کے لیے زمانے سے لڑ جاتے والے۔ ارسلان بگھڑا لالی ہونے کے ساتھ بہت زیادہ جذباتی بھی ہے جبکہ عمران بہت محکمہ اور سوچ سمجھ کر فیصلہ کرنے والا۔ عمران کا ایک دوست راشد ہے جس کی سند میں لالچیں چلتی ہیں۔ عمران اور ارسلان راشد کی لالچ پر سند کی سرکے لے جاتے ہیں۔ سڑکے دوران ان کا راشد کی لالچ پر کام کرنے والا ایک جرائم پیشہ ملازم خفی اور اس کے ساتھیوں سے جھڑپ ہوتی ہے۔ خفی راشد کی لالچ میں اس کی لالچ کو غیر قانونی کام کے لیے استعمال کر رہا ہوتا ہے۔ راشد انہیں پولیس کے حوالے کر دیتا ہے۔ اس عمل کے بعد راشد کے پاس مگن آئین ہونے آتے ہیں جن سے اعزاز ہوتا ہے۔ کئی مہینے بعد جرائم پیشہ گروہ کا آکر کاروبار ہے ایک روز راشد کے گھر پر جب عمران اور ارسلان بھی موجود ہوتے ہیں اس جرائم پیشہ گروہ کے بگھڑا اور اسے دوہوتے ہیں اور ان کا ردعمل بھائیوں سے خالص ہوتا ہے۔

(اب آگے لاہتر فرمائیے۔)
وہ خاموشی سے میری شکل دیکھتا رہا۔ میں نے اسے کالر پکڑ کر اٹھایا۔ وہ کھڑا تو ہو گیا لیکن اس کا دایاں ہاتھ بے جان حالت میں پیلو میں جھول رہا تھا۔ اس کا شانہ بری طرح اڑھڑکیا تھا اور اس سے خون بہہ رہا تھا۔ دوسرے غیر ملکی کا دایاں ہاتھ بھی موثر سائیکل کی چین سے بے کار ہو چکا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ اس کی کھال کی ہڈی ٹوٹ چکی ہوگی۔

میں نے جس غیر ملکی کو کھڑا کیا تھا وہ بھی آگے پیچھے ڈول رہا تھا۔

”کیا نام ہے تمہارا؟“

”میرا نام عباس حقیقی ہے۔“ اس نے جواب دیا۔

”تو تعاقب کس ملک سے ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”کہتا ہے یا تیری گردن توڑ دوں؟“ اس نے اپنے ہتھکنڈے نما ہاتھ کا دباؤ مزید بڑھاتے ہوئے کہا۔

مجھے ایسا کہ جیسے میری گردن کی ہڈی اب کسی بھی لمٹ سے ٹوٹ جائے گی اور انہیں ملتوں سے اہل کر باہر جا کر گی۔ میرے دونوں ہاتھ آزاد تھے لیکن اس مردود نے میری گردن پکڑ کر مجھے اتارے بس کر دیا تھا کہ میں اپنے ہاتھ ہلانے کے قابل بھی نہیں تھا۔

میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھار ہاتھ تھا۔ میں نے دیکھا ”ارسلان کے چہرے پر مجھ بے بسی اور کرب ہے۔“

اس نے چیخ کر کہا۔ ”میرے بھائی کو چھوڑ دو۔“ اس کے ساتھ ہی اس نے موٹر سائیکل کی چین بھی ہاتھ سے کھینچنے لگی۔

”اب یہ بائیک کی چین اور ریوالتور مجھے دے دو۔“ اس نے ارسلان کو حکم دیا۔

گردن پر دباؤ کم ہوتے ہی میری توانائی تیزی سے بحال ہو رہی تھی۔ میں نے تھوڑا سا ترچھا ہو کر اپنی دائیں ہتھ پوری قوت سے کھینچنے کے بہت میں مادی۔

اس نے مجھے اتنا فائدہ ہوا کہ میری گردن اس کی گرفت سے نکل گئی۔ میں نے گھوم کر سمجھے کہ سر پہ پوری قوت سے اسٹریٹ شیخ رسید کر دیا۔ وہ لاٹھر لایا اور دو چاقو قدم پیچھے ہٹ گیا۔ مجھے حیرت تو اس کی سخت جانی پڑی

اس کی جگہ کوئی اور ہوتا تو میرے اس ہمر پور گھونٹے سے اس کی گھوڑی چیخ مچ گئی ہوتی۔

دوسرے ہی لمحے اس کے شانے پر موٹر سائیکل کی چین کا ہمر پور وار ہوا۔ وہ کرب ناک انداز میں کراہتا ہوا فرش پر گر گیا۔

میں نے گھوم کر دیکھا ”ارسلان نے ایک مرتبہ پھر اپنا وہ خوفناک ہتھیار اٹھالیا تھا۔ اس پہ اس وقت کو یا جنوں اٹھالیا تھا۔ اس نے سمجھے کہ دوسرے شانے پر بھی ہمر پور وار کیا تو وہ تکلیف کی شدت سے بری طرح تر پڑے گا۔“

”اس کے دونوں ہاتھ بے کار ہو گئے ہیں۔“ ارسلان نے راشد سے کہا۔ ”اب آپ پولیس کو بلائیں اور ان لوگوں کو ان کے حوالے کر دیں۔“

اسی وقت اس کے دونوں چوکیدار کمرے میں داخل ہوئے۔ راشد نے دھاڑ کر پوچھا۔ ”تم لوگ کہاں سر گئے تھے؟“

”صاحب..... ان لوگوں نے امیر خان کو اندر بھیجنے کے بعد مجھ سے پاچا تک حملہ کیا اور میرے سر پر ضرب لگا کر مجھے بے ہوش کر دیا۔“ چوکیدار نے لگا۔

”میں آپ لوگوں کو ان کے بارے میں اطلاع دے کر باہر نکلتا تو کسی نے پیچھے سے میرے سر پر وار کیا اور میں بھی بے ہوش ہو گیا۔“ دوسرے چوکیدار نے کہا۔ غالباً اس کا نام امیر خان تھا۔

باہر گاڑیاں رکنے کی آواز آئی تھی۔ میں سمجھا کہ پولیس آ چکی ہے۔ راشد نے پولیس کو ٹیلی فون کر دیا تھا۔

کمرے میں پولیس انسپکٹر کے پیچھے پیچھے تین کاٹشیل بھی تھے۔ ان کے علاوہ اس ایجنسی کے کارڈز بھی تھے جنہیں راشد نے طلب کیا تھا۔

پولیس انسپکٹر شاید راشد کو پچھتا تھا۔ اس نے راشد سے ہاتھ لایا اور ایک نظر ان زخمی حملہ آوروں کی طرف دیکھ کر بولا۔ ”راشد صاحب! کون ہیں یہ لوگ؟“

”میں نہیں جانتا۔“ راشد نے جواب دیا۔ ”میرے چوکیدار کو بے ہوش کرنے کے بعد زبردستی اندر داخل ہوئے تھے۔“ ارسلان نے اس دوران موٹر سائیکل کی چین اپنی کمرے سے باہر کمرے شرت کے پیچھے چھپایا تھا۔

”لیکن ان کی یہ حالت کیسے ہوئی؟“ انسپکٹر نے حیرت سے پوچھا پھر وہ سکورٹی ایجنسی کے گارڈ کی طرف مڑا۔

”کیا ان کا یہ حال آپ لوگوں نے کیا ہے؟“

”ہر آدھی آپ کے ساتھ ہی پہنچے ہیں۔“ ایک گارڈ بولا۔

”ان کا یہ حال میں نے اور ارسلان نے کیا ہے۔“ میں نے کہا۔

انسپکٹر نے مجھے یوں دیکھا جیسے وہاں میری موجودگی کا طعنہ نہ ہو۔ ”آپ کی تعریف؟“ اس نے پوچھا۔

”میرا دوست عمران ہے۔“ راشد نے تعارف کر لیا۔ ”اور یہ اس کا بھائی ارسلان ہے۔ یہ دونوں ملاقات کے لیے میرے پاس آئے تھے کہ حملہ آور گھر میں گھس آئے۔“

”یہ سب کے سب سب کچھ بھی ہوں گے؟“ انسپکٹر نے پوچھا۔

”جی ہاں! ان چاروں کے پاس ریوالتور تھے۔ میں نے جواب دیا۔

”اور آپ دونوں نے اس کے باوجود ان کا یہ خطرہ کر دیا؟“ انسپکٹر کے لہجے میں حیرت سے زیادہ طنز تھا۔

”کیا تم انہیں پھولوں کے بار پھرتے؟“ ارسلان نے کہا۔ ”آپ ان لوگوں کے بارے میں معلوم کرنے کی بجائے یہ کس بحث میں الجھ گئے ہیں؟“

”ان چاروں کو گرفتار کرو۔“ انسپکٹر نے اپنے ماتحتوں کو حکم دیا پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوا۔ ”عمران صاحب! آپ لوگوں کو بھی پولیس اسٹیشن چلانا پڑے گا۔“

”وہ خوشی میں؟“ ارسلان نے ترش لہجے میں پوچھا۔

”مجھے آپ لوگوں کے بیانات میں یقین نہیں ہے۔“ انسپکٹر نے سر دھجے میں کہا۔ ”ان لوگوں کا سید بیکل چیک اپ کرنا ہوگا۔ ان کے جسموں پر شدید ضربات کے نشان ہیں۔ کسی بھی شہری کو یقین نہیں پہنچتا کہ وہ قانون کو اپنے ہاتھ میں لے۔“

”چاہے کوئی اس شہری کا سر جسم سے علیحدہ کر کے اپنے ہاتھ میں لے لے؟“ ارسلان کے لہجے میں طنز تھا۔

”ذرا دھیان سے بات کر رہو؟.....“ انسپکٹر کا لہجہ درست ہو گیا۔ ”میرا نام اکرم خان ہے اور علاقے کے بڑے بڑے بد معاش میرے نام سے کانپتے ہیں۔“

”تو پھر ان لوگوں کو لے جاؤ اور ان سے پوچھو کہ یہ یہاں کس کے کہنے پر آئے تھے؟“

”راشد صاحب!۔۔۔!“ انپکٹر نے کہا۔ ”اچھے مہمانوں کو سمجھائیے کہ وہ ہمارے ساتھ تعاون کریں ورنہ۔۔۔“

”ورنہ کیا؟“ میں نے درشت لہجے میں پوچھا۔

”ورنہ ہم تو لوگوں کو زبردستی بھی لے جاسکتے ہیں۔“

”میں نے آپ کو اس لیے بلایا تھا؟“ راشد بھگر گیا۔ ”کہ آپ میرے گھر میں بیٹھ کر میرے ہی مہمانوں کی توہین کریں؟“

”راشد صاحب! تمہارے تو آپ کو بھی چلنا پڑے گا۔“ انپکٹر نے سرد لہجے میں کہا۔

”آپ جلیں میں تمہارے پہنچنا ہوں۔“ راشد نے کہا۔

”آپ تو لوگوں کو ابھی میرے ساتھ تمہارے چلنا پڑے گا۔“ انپکٹر نے کہا۔

”چلیں میں تیار ہوں۔“ میں نے کہا۔

ارسلان نے اپنی جیب سے تیل فون نکالا اور کسی کانبرش کرنے کے بعد بولا۔ ”یار ناصر!۔۔۔ میں اس وقت سب کے ایک دوست کے گھر ہوں۔“ پھر اس نے مختصر تاہم کو اس واردات کے بارے میں بتایا اور بولا۔ ”یہ انپکٹر صاحب میں بیان لینے کے لیے تمہارے گھر ہے میں تو ذرا اٹکل سے بات کر چھا موجود ہیں۔“

”ہاں میری بات کر۔“ وہ چند لمحوں تک تیل فون کا ننگے کان لگا کر کھڑا رہا۔

”او بھائی!۔۔۔“ انپکٹر نے کہا۔ ”ہمارے پاس اتنا قانون نہیں ہوتا کہ۔۔۔“

اس کا جملہ اوصوراہہ کیا۔ ارسلان نے کہا۔ ”السلام علیکم! اٹکل!۔۔۔ میں ناصر بول رہا ہوں۔“ میں اس وقت۔۔۔ اچھا تاہم پکا ہے۔“ پھر انپکٹر کی طرف گھوما اور اس کی جیب پر لگی ہوئی نام کی پٹی پڑھ کر بولا۔ ”یہ کوئی انپکٹر اکرم خان ہیں بہت دیکھ پولیس آفیسر ہیں علاقے کے بڑے معاشین ان کے نام سے کتنے چلتے ہیں انکل۔۔۔“

”ایہ تو مجھے انہوں نے خود بتایا ہے۔“ پھر اس نے تیل فون انپکٹر کی طرف بڑھا دیا۔ ”اچھے انپکٹر صاحب بات کریں گے۔“

”اوئے یہ کیا کہنا ہے؟ تو سیدھی طرح تمہارے چلتا ہے یا۔۔۔ میرے پاس تیرے ماموں اور چاچوں سے بات کرنے کا وقت نہیں ہے۔“

”آپ بات تو کریں۔“ ارسلان نے کہا۔ ”یہ آپ کے بھی ماہ ہیں۔“

انپکٹر نے تیل فون اس کے ہاتھ سے لے لیا اور درشت لہجے میں بولا۔ ”بیلو۔ انپکٹر اکرم خان ایکٹنگ۔۔۔ جی۔۔۔ میری سر۔۔۔ وہ میں۔۔۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ۔۔۔ دوسری طرف آپ ہیں۔۔۔ میں سر۔۔۔“

مجھے معلوم نہیں تھا کہ۔۔۔ اوکے سر۔۔۔“

دوسری طرف سے شاید سلسلہ منقطع ہو چکا تھا۔ انپکٹر تیل فون ہاتھ میں پکڑے گا کہ ہم کھڑا تھا بھرہ آہستہ بولا۔ ”جناب عالی۔۔۔ آپ پہلے بتائے کہ لاٹن پڑی آئی جی صاحب ہیں۔ سوری سر مجھے معلوم نہیں تھا کہ آپ ڈی آئی جی کرشنر کے بیٹے ہیں۔“

دروانی صاحب بہت ہی سخت گیر آفیسر ہیں۔ وہ۔۔۔ نہ جانے میرے بارے میں کیا سوچ رہے ہوں گے؟“

”میں سوچ رہے ہوں گے کہ ان کا پولیس آفیسر کتنا فرض شناس ہے۔“ ارسلان نے مٹھے لہجے میں

کہا۔ ”اس کی فرض شناسی کا عالم یہ ہے کہ اس نے ڈی ٹران کو ابھی تک طبی امداد کے لیے اسپتال بھی نہیں بھیجوا یا ہے۔“

”ان کا خون بہہ رہا ہے انپکٹر۔“ میں نے کہا۔ ”اگر اس میں سے کوئی مر گیا تو اس کی ذمہ دار پولیس ہوگی۔“

”آپ فکر مت کریں جناب عالی!۔۔۔“ انپکٹر نے کہا۔ ”میں اپنے فرائض سے واقف ہوں۔ ان لوگوں کو پہلے اسپتال میں بھیجواؤں گا۔“

اس وقت تک اس کے ہاتھ ان چاروں افراد کو پولیس موبائل میں منتقل کر چکے تھے۔ انپکٹر بھی جگہ جانے کے لیے کھڑا ہو گیا اور بولا۔ ”آپ لوگوں کے پاس جب بھی وقت ہو تمہارے آکر اپنے بیانات قلم بند ضرور کرادیں اور ہاں وہ آگے ضرب لیتے آئیے گا جس سے آپ لوگوں نے انہیں ڈھکیا ہے۔“

”ہم لوگ بغیر ہاتھوں کے تو پولیس اسٹیشن نہیں آئیں گے۔“ میں نے کہا۔ ”میں نے تو انہیں ہاتھوں سے ڈھکیا ہے۔“

انپکٹر نے حیرت سے مجھ اور ارسلان کو دیکھا لیکن کچھ بولا نہیں اور باہر نکل گیا۔

”یہ ناصر تمہارا کون سا دوست ہے ارسلان؟“ میں نے پوچھا۔ ”تم نے بھی بتایا ہی نہیں کر ڈی آئی جی کرشنر کا بیٹا تمہارا دوست ہے؟“

”اب تو آپ کو یقین ہو گیا کہ میرے تمام دوست اعلیٰ گھرانوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ ڈی آئی جی کرشنر میں کیا گلگتہ کشمیر اور ری کے ایک میجر جنرل کے بیٹے سے بھی میری دوستی ہے۔“

”سوری یار۔۔۔!“ راشد نے کہا۔ ”میری وجہ سے تم لوگوں کو ایک مرتبہ بھر تکلیف اٹھانا پڑی۔ میں اس کے لیے شرمندہ۔۔۔“

”اب زیادہ بکواس مت کریا۔۔۔!“ میں نے کہا پھر چونک کر بولا۔ ”ہاں یہ تو بات کہ انکل اور آئی جی کہاں ہیں؟“

”ای اور بابا آج کل لاہور میں ہیں ورنہ تیرا خیال ہے کہ گھر میں اتنی دھماچو کڑی اور ہنگامے کے بعد بھی وہ اپنے کمرے سے باہر نہ نکلتے؟“ پھر وہ مسکرا کر بولا۔ ”او کے یاد بھر ملاقات ہوگی اور میری خواہش ہے کہ یہ ملاقات خوش گوار ماحول میں ہو۔ میں اتنی جلدی تم سے رخصت نہ ہوتا لیکن مجھے ابھی پولیس اسٹیشن بھی جانا ہے۔“

”راشد بھائی! آپ اکیلے کیوں جا رہے ہیں؟ ہم بھی آپ کے ساتھ چلتے ہیں۔“ ارسلان نے کہا۔

”اے نہیں اس کی ضرورت نہیں ہے۔ شہر میں کچھ لوگوں سے میری بھی شناسائی ہے۔ ہاں اگر ضرورت پڑی تو میں تم لوگوں کو راحت ضرور دوں گا۔“

راشد نے جس بیگور بنی کپڑی کی خدمات حاصل کی تھیں وہ لوگ محوم بھر کے اس کے نکلنے کا جائزہ لے رہے تھے۔

میں راشد سے رخصت ہوا تو اس کے بارے میں بہت فکر مند تھا۔ یہ کون لوگ تھے جو اس کے پیچھے پڑ گئے

تھے؟ راشد کی پوئش کے ذریعے یہ جاننا ضرور قانونی کام نہ جانے کب سے ہو رہے تھے؟ غمی تو یہ بھی کہہ سکتا ہے کہ اس کام میں راشد صاحب میرے ساتھ ملوث ہیں۔ ان کی اجازت کے بغیر میں ان کی پوئش کیسے استعمال کر سکتا ہوں؟

ارسلان بھی اپنی سوچوں میں گم تھا۔

”ارسلان.....؟“ میں نے بس کر کہا۔ ”تمہارا مخصوص ہتھیار مجھے اچھا لگا۔“

”آپ بانیگ کی چین کے بارے میں پوچھ رہے ہیں؟“

”ہاں۔“ میں نے کہا۔ ”وہ واقعی بہت خوف ناک اور ہلکے ہتھار ہے۔“ پھر میں چونک کر بولا۔ ”میں تو

تمہیں عام سائیکل سیدھا سارا بڑا کہتا تھا، تم نے فائننگ کہاں سے لے لی؟“

”جب آپ لکھ سکتے ہیں تو میں کیوں نہیں لکھ سکتا؟“ ارسلان بس کر بولا۔

میں نے کئی سال پہلے کرانے کا ایک کلب جوں کا تو تھا، مقصد شخص خوفزدہ کرنا تھا۔ مجھے لڑائی بھڑائی سے

کبھی دیکھی نہیں رہی تھی۔ ہاں یہ بتانا چلوں کہ میں جو کام بھی کرتا ہوں اسے پوری توجہ سے کرتا ہوں۔ مگر انے

کے تمام کورسز پر بھی میں نے بہت محنت کی تھی، جمی بڑی باقاعدگی سے پکڑ دھکیں گے آتا رہوں گے۔

اپنے فکر میں پڑے تو اس وقت بھی شاید میرے چہرے پر فکر دھکیں گے آتا رہوں گے۔

”کوئی خاص بات نہیں ہے ابو۔“ میں نے کہا۔ ”بس میں بہت دروہور ہاں ہے۔“

حقیقت بھی یہی تھی میرے سر میں شدید درد ہو رہا تھا۔ میں نے کہا ابھی الٹا سیدھا کھایا اور اپنے بیڈروم

میں چلا گیا۔

میں سوئے کی کوشش کرتا رہا لیکن کافی دیر تک مجھے نیند نہیں آئی۔ مجھے درد کر یہ خیال آ رہا تھا کہ غمی کے

تمام جانناڑ کاموں کے لیے راشد کی پوئش استعمال ہو رہی تھیں۔ وہ تو بہت آسانی سے سارا الزام راشد پر دھر

دے گا۔ مجھے تو یہ علم نہیں تھا کہ شہد کی کوئی قانونی؟ راشد کے رویے سے البتہ یہ ضرور ظاہر ہو گیا تھا کہ وہ شہد کی کو

جاتا ہے۔ ان خیالات میں جانے تک مجھے نیند آ گئی۔

اچانک کسی نے مجھے سمجھو کر جگا دیا۔ میں بڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ میرے سامنے ارسلان کھڑا تھا۔ اس کے

چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں اور وہ بہت بولٹا ہوا تھا۔

اسے اس حالت میں دیکھ میں بھی گھبرا گیا۔ ”کیا ہوا ارسلان؟“ میں نے گھبرا کر پوچھا۔

”بھیا..... او۔۔۔۔۔ راشد بھائی.....“

”کیا ہوا راشد کو؟“ میں نے اس کی بات کاٹ دی۔

”راشد بھائی کا سر ڈر ہو گیا۔“

”کیا؟“ میں نے چیخ کر پوچھا۔ مجھے ایسا لگا جیسے کسی نے میرے سر پر پتھر سے کھڑک دیا ہو۔ ”کیا کہہ رہے ہو

تم؟“ میں نے ہڈیاں لیجے میں پوچھا۔ ”راشد کل صبح تو بالکل ٹھیک تھا۔“ میں خرد کوئی غلطی ہوئی

ہے۔“

”نہیں بھیا.....!“ ارسلان نے بھرا ہوا کھانسی آواز میں کہا۔ ”مجھے ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی دی کی خبروں سے

معلوم ہوا ہے۔ میں نے مزید کنفرم کرنے کے لیے راشد بھائی کے کمرے کی طرف گیا تھا۔ وہاں ”س“ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے راشد بھائی اس نے مجھے بتایا کہ راشد بھائی کو آج صبح اس وقت تک کیا کہا ہو۔ ”جو کہ“

”اسے کس نے قتل کیا؟“ میں نے پوچھا۔

”ان کے کاروباری حریف تو تھے لیکن ایسا حال تو وہی لوگ مجھے اس کے ذمے دار لگ رہے ہیں نہیں

کل بہم نے پولیس کے حوالے کیا تھا۔“

میں جلدی سے اٹھا۔ بہت جگت میں ہاتھ منہ دھو کر پڑے بدل کر تیار ہو گیا۔

لاؤنج میں ایذا کی اور شکایت افسردہ بیٹھے تھے۔

میں باہر کی طرف بڑھا تو امی نے کہا۔ ”سحران.....! بیٹا.....! ناشتا تو کرلو۔“

”مجھے بالکل ہوک نہیں ہے امی.....!“ میں نے کہا۔ پھر امی نے پوچھا۔ ”یہ ارسلان کہاں گیا؟“

”وہ بھی ابھی ابھی بائیک پر نہیں نکلا ہے۔“ ابو نے جواب دیا۔

میں نے گاڑی لائی اور سیدھا رازدار کے کمرے پہنچ گیا۔ وہاں گیت پر پولیس کا ایک سپاہی بیٹھا تھا۔ میں نے

اندھ جانے کی کوشش کی تو اس نے مجھے بتایا۔ ”اندھو کی نہیں ہے راشد صاحب کا سر ڈر ہو گیا ہے۔“

”میں جانتا ہوں۔“ میں نے کہا۔ ”اندھو راشد کے ملازم تو ہیں؟“

”ان سب کو پولیس تھانے لے گئی ہے۔“ اس نے جواب دیا۔

”کیوں؟“ میں نے پوچھا۔

”یہ تو آپ کو پولیس اسٹیشن جا کر ہی معلوم ہوگا۔“ اس نے سر دھجے میں کہا۔

میں نے اپنی گاڑی کا رخ پولیس اسٹیشن کی طرف موڑ دیا۔

اسٹیشن آرم خان صاحب معمول علاقہ گرفت تھا۔ پولیس اسٹیشن میں صرف دو سپاہی دروہوں میں اور دو آدمی

سارہ لباس میں موجود تھے ان کے بارے میں بعد میں معلوم ہوا کہ وہ بھی پولیس کا تشکیل ہیں۔ ان چار کے

علاوہ ہیڈ کوارٹر بھی موجود تھا۔

مجھے اس نے انتہائی رنج سے دیکھا اور دشت لیجے میں بولا۔ ”فرماؤ کس سے ملنا ہے؟“

”کیا تربیت کے ساتھ ساتھ تمہیں اس انکوائری میں بولنے کی ٹریننگ بھی دی جاتی ہے؟“ میں نے

پوچھا۔

”کیا مطلب؟“ وہ مجھے گھور کے پہلے سے زیادہ رکشت لیجے میں بولا۔

”مطلب یہ کہ تم لوگ عام انسانوں کی طرح بات نہیں کر سکتے؟“

”اوئے..... زیادہ بتی پڑھانے کی ضرورت نہیں ہے۔“ وہ پھر کر بولا۔ ”کام کیا ہے؟“

”مجھے اسٹیشن آرم خان سے ملنا ہے۔“ میں نے بھی دشت لیجے میں کہا۔

”وہ اس علاقہ وقت گرفت پر ہیں۔“ اس نے کہا۔ ”کیا منسٹری نے آپ کو بتایا نہیں؟“

”مجھے معلوم ہے کہ وہ اس وقت کہاں ہے؟“ میں نے اندھ میرے تھے تیر سمجھو۔ ”اس سے کہو کہ فوراً پولیس

اسٹیشن پہنچے۔“

میرے پر اعتماد لےجھ میں ہیڈ مگر کچھ گھبرا گیا لیکن آدمی گماگ تھا اس لیے فوراً ہی اس نے اپنی گھبراہٹ پر قابو پالیا اور بولا۔ ”جب آپ کو معلوم ہے تو مجھے اسے کیا پوچھ رہے ہیں کہ صاحب کہاں ہے؟“
 ”اے ابھی اور اسی وقت بلاؤ۔“ میں نے کہا۔ ”میں اس سے پوچھ نہیں رہا ہوں بلکہ تم سے یہ کہہ رہا ہوں کہ وہ جہاں بھی ہے اسے یہاں بلاؤ۔“

”تم ہو کون؟“ وہ اچانک بلند آواز میں بولا۔

اس سے پہلے کہ میں کوئی جواب دیتا اکرم خان کی گاڑی پولیس اسٹیشن میں داخل ہوئی۔ ہیڈ مگر کا کمرہ سامنے ہی تھا۔ اس نے بھی مجھے دیکھا تھا۔ وہ گاڑی سے اتر کے سید حامیر سے پاس پہنچا اور بولا۔ ”سر آپ یہاں کیوں کھڑے ہیں؟ میرے کمرے میں بیٹھ جائیے۔“

”آپ کمرے کی بات کر رہے ہیں آپ کا ہیڈ مگر نے تو مجھے کورسی تک نہیں دی۔“ میں نے کہا۔

”سر جی آپ..... تو بتایا ہی نہیں کہ آپ.....“

”بس کرو اے.....“ انکسپئر نے اس کی بات کاٹ دی اور مجھ سے بولا۔ ”سر آپ میرے ساتھ آئیں۔“

میں اس کے ساتھ اس کے کمرے میں پہنچا تو اس نے پہلے مجھے کرسی پیش کی پھر خود بیٹھا۔ عام پولیس اسٹیشنز کے برعکس اس کا کمرہ آزاد راستہ تھا۔ ٹیبل بھی جدید طرز کی اور یو لوگ جیٹر بھی خاصی قیمتی تھی۔ کمرے میں لیور کوئلہ منورہ بٹ بھی موجود تھا۔

میں نے تنقیدی نظروں سے کمرے کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ ”واہ انکسپئر صاحب آپ کا آفس تو بہت شاندار ہے۔ لگتا ہے سر کا راب پولیس پہنچ کر خراج کرنے کی ہے۔“

”ارے نہیں صاحب.....“ اس نے کہا۔ ”یہ سب کچھ تو میں نے ذاتی طور پر کیا ہے اپنی جیب سے۔“

”آپ کی جیب میں تو ماشاء اللہ بہت برکت ہے۔“ میں نے طنز پر لےجھ میں کہا۔ ”آپ کی گاڑی بھی پندرہ سو لاکھ روپے سے کم نہیں ہوگی۔“

”سر..... وہ تو میں نے بینک سے لیز پر لی ہے۔“

”دوبی کی گاڑی.....“ میں نے ہنس کر کہا۔ ”اس کی ضمانت بھی تقریباً بیس ہزار تو ہوگی۔“ میں نے اچانک درخت لےجھ میں پوچھا۔ ”آپ نے راشد کے ملازمین کو کیوں گرفتار کیا ہے؟“

”میں نے انہیں شامل تفتیش کیا ہے۔“ انکسپئر بھی شیدہ ہو گیا۔ ”دیکھیے، تفتیش کا ہمارا اپنا طریقہ کار ہوتا ہے۔ سر ڈاؤرڈر کیتھون کے کیسوں میں عام طور پر گھریلو ملازمین بھی ملوث ہوتے ہیں۔“

”راشد کا سر ڈاؤرڈر سے خیال میں کمرے سے باہر نڈر کی پارک کے نزدیک ہوا ہے جو اس کے گھر سے دو کلومیٹر کے فاصلے پر ہوگا؟“

”جی ہاں جناب۔“ اس نے کہا۔ ”لیکن گھر کا کوئی بھی ملازم قاتل کو ٹپ دے سکتا ہے کہ مقتول اس وقت کہاں ہے؟“

”آپ نے راشد کے والدین کو اطلاع دے دی ہے؟“ میں نے انکسپئر سے پوچھا۔

”جی ہاں انہیں تو سر ڈاؤرڈر کا بعد اطلاع دے دی گئی۔ وہ دو گھنٹے میں یہاں پہنچنے والے ہیں۔“

”ویسے کچھ معلوم ہوا کہ راشد کے قاتل کون لوگ تھے؟“

”اس واقعے کا کوئی شبہی انداز ابھی سامنے نہیں آیا۔ پولیس اسٹیشن پر صرف ایک ٹیلی فون موصول ہوا تھا کہ ڈینس فیئر لے ایک پلک پارک کے پاس ایک مرد مر رہا ہو گیا ہے۔ ہم لوگ موقع پہ پہنچے تو راشد کی ڈیڈ باڈی وہاں موجود تھی۔ اس کے سینے پر شکوہ کافور ابرست مارا گیا ہے۔“

”ویسے میں ایک بات ضرور کہوں گا۔ راشد کے تمام ملازمین بہت پرانے تھے۔ میں بھی انہیں راشد کے گھر میں برسوں سے دیکھ رہا ہوں۔ ان پر ہاتھ مارا گیا رکھے گا۔“

”انکسپئر کچھ کہنے کی دلا تھا کہ میرے تیل فون کی کتل تینے جی۔“ مگر پر ابو کا نام تھا۔ میں نے ٹھن تیا کیتل فون کا ن سے لگایا اور بولا۔ ”السلام علیکم اچھی ابو؟“

”معران بیٹا.....“ ابو کی آواز میں گھبراہٹ اور پریشانی تھی۔ ”فورا گھر پہنچو۔“

”خریت تو ہے ابو؟“ میں نے پوچھا۔

”نہیں تم فوراً گھر پہنچو۔“ ابو نے بولا ہی ہوئی آواز میں کہا اور سلسلہ منقطع کر دیا۔

انکسپئر اکرم خان بہت غور سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ جب میں اٹھنے لگا تو اس نے پوچھا۔ ”خریت تو ہے جناب؟“

”ہاں خیریت ہے۔“ میں نے جواب دیا۔ ”ہاں راشد کا پوسٹ مارٹم ہو جائے تو مجھے ضرور انعام کیجیے گا۔“ یہ کہہ کر میں باہر نکل آیا۔

پھر میں انتہائی تیز رفتاری سے ڈرائیوگ کرتا ہوا گھر پہنچا۔

ابو اور امی لاؤنج روم میں موجود تھے۔ ابو کی حالت بہت اچتر تھی۔ میں نے تشویش سے پوچھا۔ ”کیا ہوا ابو! خیریت تو ہے؟“

ابو مجھ سے لپٹ کر بری طرح رونے لگے۔

”ابو!.....! بھئیے تیا نہیں کیا بات ہے؟“ میں امی سے مخاطب ہوا۔ ”امی!.....! آپ ہی بتائیں؟“ امی کی حالت تو پہلے ہی بتاتی تھی کہ ان کی آنکھیں سو جی ہوئی تھیں اور بال بھرے ہوئے تھے۔ میں نے کبھی انہیں اس طے میں نہیں دیکھا تھا۔

”آپ لوگ بولنے کیوں نہیں؟“ میں نے بیانی انداز میں کہا۔ ”آزم خرو کیا ہے؟“

اسی وقت عدنان بھٹا کھتا ہوا آیا اور مجھ سے لپٹ گیا۔ وہ روتے ہوئے بولا۔ ”بھیا.....! وہ لوگ شائستہ باجی کو لے گئے.....“

”کون شائستہ کو لے گیا؟“ ہم کیا کیوں کر رہے ہو؟“ میں نے چیخ کر کہا۔

”ہاں بیٹا.....! ابو نے متنبہل کر کہا۔ ”انہوں نے پہلے چوکیدار کو بے ہوش کر کے ہاتھ مار دیکر نہانے ہوئے اندر آئے اور تمہارے اور ارسلان کے بارے میں پوچھا۔ اس دوران خانساں نے مزاحمت کی کوشش کی تو ان لوگوں نے رائفلوں کے بٹ مار سکے سے بھی بے ہوش کر دیا۔“

”میں اس سے ایک نے شائستہ باجی کا ہاتھ پکڑا تو مجھ سے برداشت نہ ہو سکا۔“ عدنان نے کہا۔ ”میں نے انہیں چھڑانے کی کوشش کی تو ان میں سے ایک نے میرے سر پر بھی شکوہ کافور ابرو ایک طرف

دھکا دیا اور شائستہ باجی کو کھینچے ہوئے باہر لے گئے۔
 ”کون لوگ تھے وہ؟“ میں نے چیخ کر کہا۔ ”میں اس کی اتنی جرات ہوئی کہ ہمارے گھر کی طرف میزبانی آگھ
 سے بھی دیکھ سکے؟“

”وہ جاتے جاتے کہہ گئے ہیں کہ جب تک اسلامان اور تم خود کو ان کے حوالے نہیں کرو گے وہ شائستہ کو نہیں
 چھوڑیں گے۔“

”میں اس کے حوالے کریں؟“ میں نے پھر چیخ کر کہا۔ ”انہوں نے کوئی پتہ تو بتایا ہوگا؟ کوئی نام تو بتایا
 ہوگا؟“

”میں نے پوچھا۔“
 ”وہ کسی شبہی کا نام لے رہے تھے۔“ ابو نے کہا۔ ”انہوں نے کہا ہے کہ وہ خود ہم سے رابطہ کریں گے۔ تم
 دونوں کے علاوہ انہیں ہم سے کچھ فائدہ نہیں ملے گا۔“

”اب کیا ہو گا بیٹا؟“ امی نے بری طرح جھگڑتے ہوئے کہا۔ ”وہ لوگ میری پھول سی بیٹی کے ساتھ نہ جانے کیا
 سلوک کریں گے؟“

”خوشحال رہیں امی!“ میں نے کہا۔ ”وہ لوگ کچھ بھی نہیں کریں گے۔“ میں نے کہا لیکن مجھے اپنے الفاظ خود
 بھی کھوکھلا گد ہے تھے۔ ”اسلامان کہاں ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”وہ ان ہی لوگوں کے پیچھے گیا ہے۔“ امی نے روتے ہوئے کہا۔
 ”کیا؟“ میں بوکھلا کر پوچھا۔ ”وہ ان کے پیچھے کیسے چلا گیا؟“

”جب وہ گھر پہنچا تو ان لوگوں کو یہاں سے نکلے ہوئے مشکل سے دو منٹ ہوئے ہوں گے۔ وہ اس وقت
 اپنی ایک چران کے پیچھے روانہ ہو گیا۔“

”اسلامان بھی انتہائی درجہ کا قاتل اور جڈہ باقی ہے۔“ میں نے ہنسنا کر کہا۔ ”ان کے پیچھے جانے کی کیا
 ضرورت تھی؟“

”بیٹا!..... تم اس کا سزا جاننے تو ہو۔“ امی نے کہا۔ ”یہ بھی جانتے ہو کہ وہ شائستہ پر جان چڑھتا ہے۔ وہ
 بھلا ہماری بات مانتا؟“

”آپ نے پولیس کو اطلاع دی؟“ میں نے کہا۔
 ”ہاں میں نے بعد میں پولیس کو ٹیلی فون پر اطلاع کر دیا تھا لیکن وہ لوگ ابھی تک نہیں پہنچے ہیں۔“

”اب میں اس اسلامان کو کہاں ڈھونڈوں؟“ میں نے بے بسی سے کہا۔ اس کی وجہ سے تو دہری پریشانی
 کھڑی ہوئی تھی۔ اسلامان جڈہ بات میں نہ جانے کیا کر بیٹھتا؟

میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اب مجھے کیا کرنا چاہیے؟ ایک طرف میرے بہترین دوست کا مرڈر ہو گیا تھا۔
 اس کے والدین بھی اس ایک گناہ کا پتہ پہنچے ہیں جو گئے۔ دوسری طرف میری پھول سی بہن ان درد مندوں کے قبضے
 میں تھی اور اب مصیبت یہ تھی کہ اسلامان بھی ان لوگوں کے تعاقب میں گیا تھا۔ میں کئی دفعہ گاڑی تک گیا
 پھر واپس آ گیا۔

دروازے پر پولیس کی موٹاں وین آ کر رہی اور اس میں سے ایک سب انسپکٹر اور چار سپاہی نکلے جیسے
 اغوا کنندگان ابھی تک گھر میں موجود ہوں اور وہ ان کی آمد کا انتظار کر رہے ہوں۔ ان لوگوں نے یوں بند ویش

قام کر رکھی تھی جیسے مجاز جنگ رفوچی دشمنوں کی گھات میں آگے بڑھتے ہیں۔
 ”کون ہے؟ کہاں ہے؟“ سب انسپکٹر نے یوں پوچھا جیسے مجرم اس کے سامنے یا کہیں موجود ہے۔

”آپ تو نہیں میں ہی ہوں؟“ میں نے طنز سے کہہ کر کہا۔ ”آپ کی سروس تو لا جواب ہے۔“
 ”آپ مجھ پر طنز فرما رہے ہیں؟“ سب انسپکٹر نے درشت لہجے میں کہا۔

”میں تو آپ کی تعریف کر رہا ہوں۔“ دروایت کو صرف ایک گھنٹہ چاکس منٹ گزرے ہیں اور آپ اسے
 مختصر وقت میں چلے آئے؟“

”ہم کسی کوئی فارغ نہیں بیٹھے ہیں۔“ سب انسپکٹر نے تلخ لہجے میں کہا۔ ”ہمارے پاس صرف دو موٹا سلیں
 ہیں اور حقانے کی نفی بھی کم ہے۔“ پھر وہ بولا۔ ”ہاں اب بتائیے ڈاکو کیا کچھ لے گئے ہیں؟“

”ڈاکو میرے گھر کی عزت لے گئے ہیں میری بہن کو لے گئے ہیں۔“ میں نے کہا۔
 ”کیا مر بھی ہوئی؟“

”نہیں سال!“ ابو نے کہا۔
 ”اس کا مطلب ہے کہ وہ جو یہ جوان العز اور باخ ہے۔“ سب انسپکٹر نے کہا۔

”تو پھر؟“ میں نے کہا۔ ”وہ کہیں گھر نہیں ہوئی ہے کہ راستہ ڈھونڈ کر گھر آ جائے گی۔“ میں نے طنز سے لہجے
 میں کہا۔

”میں اس کے کچھ بھی تو ہو سکتا ہے؟“ سب انسپکٹر کیوں پر زہریلی مسکراہٹ تھی۔
 ”کیا مطلب ہے آپ کا؟“ میں نے سرد لہجے میں پوچھا۔

”میرا مطلب ہے کہ اس نے کسی کے ساتھ مل کر اپنے اغوا کار ڈراما چایا ہو۔“ سب انسپکٹر نے کہا۔ ”آج
 کل کی لڑکیاں.....“

”جیسا بند کر دو۔“ میں نے بھیج کر کہا۔ ”تم تیش کر رہے ہو یا ہماری عزت پر کچھ اچھا رہے ہو؟“
 ”اڈا آرام سے اداوے۔“ سب انسپکٹر نے اسلی لہجے پر آگیا۔ ”یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ لڑکی خود ہی گھر سے
 بھاگی ہو اور تم لوگ اپنی عزت جمانے کے لیے اسے اغوا بنا کر بیٹھ کر رہے ہو؟“

میں نے آگے بڑھ کر اپنا ایک انسپکٹر کا کر بیان پکڑ لیا اور اس کے چہرے پر دوسرے ہاتھ سے تحفہ مارنے ہی
 والا تھا کہ ابو نے جھٹ کر میرے ہاتھ پکڑ لیا اور بولے۔ ”ہوش سے کام لو عمر!..... ایہ تم کیا کر رہے ہو؟“

میں نے جھٹکے سے اس کا کر بیان چھوڑ دیا۔
 سب انسپکٹر غضب ناک لہجے میں بولا۔ ”گھر قرا کر لو اسے۔“ میں اس سے حقانے لے جا کر پوچھ گچھ

کروں گا۔ بہت کڑی چٹائی ہے اسے۔ بڑی جان بٹائی ہوئی ہے۔ میں دیکھتا ہوں تو کتنا عزت دار ہے؟“
 ”اچھے بیٹے کی طرف سے میں معافی مانگتا ہوں ڈاکٹر۔“ ابو نے کہا۔ ”میں غلطی ہوئی جاتی ہے۔“

”آپ سچے میں بولو بڑو کر۔“ سب انسپکٹر نے انہیں جھڑک دیا۔ ”انسان غلطی کرتا ہے تو اسے سزا ہی
 تو ملتی ہے۔“ سب انسپکٹر کے چہرے پر رونق تھی۔ ”حوالات کی ہوا کھانے کا تو غلطیاں کرنا معمول جاتے گا۔“

”ابو!..... آپ کے پاس اسلامان کے دوست نامہ کا تیل نمبر ہے؟“ میں نے پوچھا۔
 ”بیٹا!..... اس کے دوستوں سے میرا کیا تعلق؟“ ابو نے کہا۔ ”ہاں! سچ وہ جانے سے پہلے اپنے کسی دوست

سے بات تو کر رہا تھا شاید اس نے ناصر ہی کا نام لیا تھا۔ ناصر کی کال لیڈر لائن پر آئی تھی۔ "ابو نے کہا۔" وہاں اس کا نمبر شاید اب بھی محفوظ ہو؟"

"او بھائی!۔۔۔! سب انپیکٹر نے کہا۔" جلدی کر ہمارے پاس زیادہ نام نہیں ہے۔"

عمر دان ٹیلی فون سیٹ میں بند کر دیا تھا۔ اس نے کہا۔ "بھیا۔۔۔! لیڈر لائن پر آج سے صرف تین کا نذر رہی ہوگی ہیں۔"

"تم ان تینوں پر بڑائی کرو اور ناصر کو تفصیل سے سب کچھ بتا دو۔ اس کا سیل نمبر بھی لینے کی کوشش کرنا۔"

"او۔۔۔۔۔ تو خود چلے گیا کچھ جھڑپی پہتا کر لے جاؤں؟ کسی باوردی پولیس افسر پہ ہاتھ اٹھانے کی سزا معلوم ہے کچھ؟"

"چلو۔" میں نے بھنا کر کہا۔ "میں بھی تو دیکھوں کہ ہماری پولیس کتنی فرض شناس ہے؟" پھر میں عمران سے بولا۔ "تم ناصر کو ٹیلی فون کرو اور سب کچھ بتا دو۔" یہ کہہ کر میں پولیس کی موبائل دین کی طرف بڑھ گیا۔

مجھے سپاہیوں نے یوں گھیر لیا جیسے انہوں نے کوئی انتہائی خوف ناک قسم کا اشتہاری ملزم پکڑ لیا ہو۔ مجھے یہ بھی فکر تھی کہ سب ایک راشد کے والدین اور سے کراچی پہنچ چکے ہوں گے۔ ایسے موقع پر میرا ان کے پاس ہونا بہت ضروری تھا لیکن یہ "فرض شناس" افسر مجھے پولیس اسٹیشن لے جا رہا تھا۔

میں نے سوچا کہ میں سیل فون پر راشد کے ڈیڈی سے بات کر لوں اور انہیں تمام صورت حال سے آگاہ کر دوں ورنہ یہ ہی سمجھے کہ میں جان بوجھ کر راشد کی تفتیش میں نہیں آیا ہوں۔

میں نے جب سے سیل فون نکالنے کی کوشش کی لیکن میرے دایں بائیں ہاتھ بٹھے ہوئے سپاہیوں نے مجھے دبوچ لیا اور ان میں سے ایک انتہائی اگڑے لہجے میں بولا۔ "اے پٹے ہاتھوں کو قابو رکھو اور خاموشی سے بیٹھا رہو۔"

ان میں سے ایک نے میری شرٹ کا کالر پکڑا اور دوسرے نے میری جیبوں کی تلاش کی کران میں سے میرا پرس ڈرائیونگ کارڈز نوٹڈ، سگریٹ کا پیکٹ اور میرا قیمتی سیل فون نکال کر اپنے قبضے میں کر لیا۔

"یہ کیا حرکت ہے؟" میں بھنا کر بولا۔

جواب میں میری دایں جانب بیٹھے ہوئے پولیس والے نے میری گردن پر ایک ہتھ دیا اور بولا۔ "آرام سے بیٹھا اور ہونکنا بند کر۔"

زندگی میں کسی میری اتنی ذلت نہیں ہوئی تھی میرا دل چاہ رہا تھا کہ میں ان سب پولیس والوں کی گردنیں توڑ دوں لیکن میں نے بہت مشکل سے اپنی اس خواہش پر قابو پایا۔

پولیس اسٹیشن تک پہنچتے پہنچتے انہوں نے اتنی دھمیر سے مشاورت کر دی کہ میرے مہر کا پتہ نہ لہر بڑ ہو گیا۔

میں نے سہجہ کر کہا۔ "اب اگر کسی نے مجھ پر ہاتھ اٹھایا تو میں اس کا ہاتھ توڑ دوں گا۔ قانون کے احترام کی بھی ایک بات ہوئی ہے۔"

"اچھا۔" ایک پولیس والے نے طنز سے لہجے میں کہا اور میرے منہ پر چھڑا مارا لیکن میں نے اس کا ہاتھ معذبوٹی سے پکڑ لیا اور دوسرے ہاتھ سے اس کے چہرے پر اتنا زور دیا کہ چھڑا مارا کہ اس کے ہونٹ پھٹ گئے اور ان سے خون بہنے لگا۔

اسی وقت موبائل پولیس اسٹیشن کے احاطے میں داخل ہوئی۔ مجھ سے مار کھانے والے نے مجھے دین کے دروازے کی طرف دکھایا اور پیچھے سے ایک زوردار لائٹ میری کمر پر جڑ دی۔

میں اس حملے کے لیے ڈی طور پر تیار نہیں تھا اس لیے اوندھے منہ فرش پر جا گر۔ فرش پر گرنے سے میری ناک اور ایک گال زخمی ہو گیا۔

"یہ فرار ہونے کی کوشش کر رہا تھا جی۔۔۔۔۔" مار کھانے والے سپاہی نے سب انپیکٹر سے کہا۔ "اس نے مجھ پہ حملہ کر کے فرار ہونے کی کوشش کی تھی۔"

"اے جھڑپی لگا دو اور لاگ اپ میں بند کر دو۔ میں ابھی اس کی ساری گری کٹا ہوں۔ اس کی تو۔۔۔۔۔ سب انپیکٹر نے وزنی سے ایک گال لٹکا دیا۔

ان لوگوں نے مجھے جھڑپی تو تین لگائی لیکن لاتوں اور گھونٹوں سے مجھے مارتے ہوئے لاگ اپ تک لائے اور اس کا دروازہ کھول کر مجھے اندر رکھ دیا۔

"اگلی تو کچھ آرام کر لے۔" سب انپیکٹر نے کہا۔ "مجھ سے تو میں رات کو نٹوں گا۔"

حالات میں اس وقت دافرا اور جودو تھے وہ اپنے لباس اور چہرے سے عادی جرم کھ رہے تھے۔ ان کا اطمینان دیکھ کر مجھے اندازہ ہو رہا تھا کہ حالات ان کے لیے کوئی نئی جگہ نہیں ہے۔

سنتری کے جانے کے بعد وہ دونوں کسک کسک میرے پاس آ گئے۔ ان میں سے ایک بولا۔ "جہیں کس جرم میں لائے ہیں یہ لوگ؟"

"انٹوں تو مجھے یہ عی ہے کہ میں نے سوائے ایک جرم کے کوئی جرم نہیں کیا ہے۔" میں نے تلخ لہجے میں کہا۔ "میں نے پولیس کے سب انپیکٹر کا گریبان پکڑ لیا تھا اور ابھی پولیس اسٹیشن آئے ہوئے ایک سپاہی کو چپا ہے۔"

"یاز کام تو تم نے بہت نیک کیا ہے لیکن اس کے بدلے میں یہ لوگ تمہارا ساتھ بہت برا سلوک کریں گے۔"

"دیکھا جائے گا۔۔۔۔۔"

"وہی تم اپنے کپڑوں اور چہرے سے تو شریف آدمی لگ رہے ہو۔" دوسرا حوالاتی بولا۔ "پولیس سے مار پیٹنے کی بوت کیوں آگئی؟"

میں نے مختصر سے بتایا کہ ایسا کیوں ہوا ہے؟ میں جان بوجھ کر ہانا دیسیان باتوں میں لگا رہا تھا تاکہ میرے ذہن میں شائستگی کے بارے میں راشد کی تفتیش کے بارے میں کوئی خیال نہ نہ۔

اجا کب سلاخوں کے پاس مجھے عمران کا چہرہ دکھائی دیا۔ اس کا چہرہ ستاہوا تھا اور وہ ہر سوں کا تیار لگ رہا تھا۔

"کیا ہوا عمران۔۔۔۔۔؟" میں نے پوچھا۔

"ناصر بھائی تو کسی برس ٹرپ پر سٹکا ہو گئے ہوئے ہیں اور ان کے والد اسامہ آباد میں ہیں۔ میں نے ٹیلی فون کر دیا لیکن والد نے اسامہ سے بہت کہا کہ مجھے ناصر بھائی یا ان کے والد کا سیل نمبر دیکھ دو کہ وہ کی صورت نہیں مانا۔" پھر وہ تڑپوٹیں لہجے میں بولا۔ "اب کیا ہو گا بھیا؟" اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

"چکھو نہیں ہو گا۔" بعد میں بہت بار وہ کہتا تھا کہ اس کی موت سننے والے کو ان کی موت سے چوک کر

بولاً۔ ”ارسلان کہاں ہے؟“

”ارسلان بھائی تو ابھی تک واپس ہی نہیں آئے ہیں۔“ اس نے جواب دیا۔

”اس کا سیل نمبر ملاؤ۔“

”ان کا سیل فون آف ہے۔“ عدنان نے کہا۔ ”میں گزشتہ آدھے گھنٹے سے کوشش کر رہا ہوں۔“ اس نے

4-

”جلی بھی“ اب جا۔۔۔۔۔ سنتری نے سلاخوں کے پاس آ کر عدنان سے کہا۔ ”صاحب آ گیا تو میری مصیبت آ جائے گی۔“

”بس ایک منٹ اور۔“ عائد نے کہا پھر مجھ سے بولا۔ ”راشد بھائی کے ڈیڑی اور ای اور سے آگئے ہیں۔ میں نے انہیں بھی کھانا دیا۔“ اور اداری راشد بھائی کی فٹین میں جا رہے ہیں۔“ پھر مجھ سے بولا۔ ”بھیا!۔! آپ پریشان مت ہوں۔ ابو نے اپنے جانے والے کئی افراد کو کھانا دیا ہے۔ ابھی تھوڑی دیر میں یہ لوگ آپ کو چھوڑ دیں۔“

سنتری نے اسے ایک مرتبہ پھر ٹوکا تو وہ وہاں سے چلا گیا۔

”او بھائی..... رات سے پہلے یہاں سے نکلنے کی کوشش کرو۔“ حوالاتیوں میں سے ایک بولا۔ ”رات کو سب انسپکٹر تھرو ڈگری استعمال کرتا ہے اور اس کا ایک خاص آدمی محمد خان بھی اس میں ماہر ہے، وہ تو پورا پالا پلایا ساٹھ ہے۔“

’دیکھا جائے گا۔‘ میں نے دل ہی دل میں کہا۔

مجھے ایک دفعہ پھر گفتگو اور اندیشوں نے گھیر لی تھانہ جانے شائستہ کہاں ہوگی اور کس حال میں ہوگی؟ ان خانوں نے اس کے ساتھ کیا سلوک کیا ہوگا؟ اس کے ساتھ ہی بھنکار ملائی کہ کتنی تنہا ہے نہ کہاں تھا اور کیا کر رہا تھا؟ ہمیں وہ ان جرائم پیشہ افراد سے اکیلا ہی بچ رہا ہوگا؟ وہ خاصا جذباتی تھا اور بات بات پر آہ سے باہر ہو جاتا تھا یہ کس پر اس کی لاڈلی بہن کا معاملہ تھا۔

میں اب دوسرے حوالاتیوں سے بات بھی نہیں کر رہا تھا۔ ان دونوں نے مجھ سے بات کرنے کی کوشش کی لیکن جب میری طرف سے انہیں کوئی خاطر خواہ جواب نہیں ملا تو وہ آپس میں باتیں کرنے لگے۔

میں دیوار سے ٹک لگائے بیٹھا ہوں۔ مجھے پتہ نہیں کہ جب مصیبت لائی ہے تو اپنے ساتھ اور بہت سی مصیبتیں
 کئی کر آئی ہے۔ راشد کے قتل پر میرا دل خون کے آنسوؤں کا قبا میں لپیٹا ہے۔ روت روت تھا کہ اس نے دوست
 کی آغوشِ رسوا میں شریک تھا۔ مجھے یہاں آئے کی گفنے تو یہ کہتے تھے ایک نوجوان شریکِ مدِ فین
 بھی ہو جی۔ ہاں! میں خیالات میں تھکا ہوا تھا کہ میری آگ ٹھک گئی۔ آئی ہوئی سردیوں کا موسم تھا کہ لاک لاک
 آپ کے سلاخوں والے دروازے سے ٹھنڈی ہوا آ رہی تھی۔

میں مینڈکے جھوٹے میں ایک طرف لڑا کھا تو میری آنکھ کھل گئی۔ کرے میں بہت ہی بددلتی سی روشنی والا ایک بلب روشن تھا جو اس میلن زدہ کرے کی تاریکی میں دوڑ کرنے میں کام تھا۔ پولیس والوں نے تو میرے ہاتھ سے گھڑی ہٹا لی تھی جس سے مجھے وقت کا اندازہ ہو سکتا لیکن پولیس افسیسن کے سکوت سے اندازہ ہو رہا تھا کہ رات خاصی بیت چکی ہے۔

اچانک تاریک کاریڈرو میں ہماری جوتوں کی دھمک سنائی دی پھر کوئی بہت بری طرح لکھنا سنا دھمکوں کی آہستہ سلاخوں والے دروازے کے پاس آ کر رک گئی۔ سلاخوں کے پیچھے مجھے ایک سنتری کا خٹوس چہرہ دکھائی دیا۔ اس کے پیچھے کمرہ چہرے والا ایک اور سنتری تھا۔ ان لوگوں نے پشور انداز میں لاک اپ کا دروازہ کھولا تو دوسرے دونوں حوالائی جو گہری نیند میں تھے بڑبڑا کر اٹھ بیٹھے۔

دووں سنتریوں میں سے ایک سنتری اعدرا گیا اور اس نے بہت بھری سے میرے ہاتھ میں پھنکڑی ڈال دی اور بلی آواز میں بولا۔ ”چل، چل،“ تجھے ذرا باہر کی سیر کرا لائیں، جب سے آیا ہے اسی طرح بیٹھا بھول رہا ہے۔“

اس نے ہتھکڑی میں بندھی ہوئی زنجیر کا سرا بہت بے وردی سے کینچا۔ اس میں جلد ہی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ زمین پر ایک ہی زاویے سے بیٹھے رہنے کی وجہ سے میرے ہیرا اکثر گرہ گئے تھے۔ اس نے مجھے کہیں تا تو میں سنبھلے سنبھلتے بھی گر پڑا۔

میں نے کمزیر رات کو ان سیدھا کھانا کھایا تھا۔ اس کے بعد سے ایک سال کی آؤ کریر سے منہ نہیں کی تھی۔ وہاں رکھا ہوا پانی کا ٹکڑا بھی اختلاط تھا کہ اس سے پانی پیتے ہوئے مجھے کراہت محسوس ہوتی تھی اس لیے میں نے پانی بھی نہیں پیا تھا۔ میں مجھ کو تو خراب حال تھا پیاس کی وجہ سے میرے صلق میں کانٹے سے پڑ رہے تھے۔

وہ لوگ مجھے مہینے ہوئے اس انچ اوکڑے کمرے میں لے گئے اس کا کردار حالات سے خاصے فاسل پر تھا۔ وہاں تو اس وقت گردن تاقاں لگا کر پیری کی نظر ہی تو مجھ حیرت کا بمبھلا گیا۔ اس میں ایک نر با تھا۔ اس انچ اوکڑے کمرے میں مہمانت بھانت کے کئی آدمی بیٹھے تھے۔ ان میں کچھ طرائف کے لوگ تھے تو وہ تین دس بجے نہیں میں نے ان کے کونوں کی وجہ سے پچھان لیا۔ ان کے حلیے پر کچھ گریبا کر رہا تھا جسے وہ بھی کسی وجہ سے انعام میں وہاں لائے گئے ہوں۔


ایس ایچ او بھڑے جسم کا خبیث صورت آدمی تھا۔ وہ اس وقت درودی کی بجائے شکار میں تھا۔ سنتری نے مجھے اس کے سامنے ٹھہرا کر دیا۔

”یہ کون ہے بھئی؟“
”بہ عمر ان سے سر“

”اچھا! اچھا! یہ سو رہا ہے جس نے پولیس کے ایک افسر کے گریبان پر ہاتھ ڈالا اور پھر فرار ہونے کی کوشش میں پولیس کے ایک الٹا کنوڑی کر دیا؟“ پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوا۔ ”ہاں، یسٹی جی جی چلی چکی ہوئی ہے تجھ پر تو کیا پولیس کو بھی اپنا کوئی گھریلو ملازم سمجھتا ہے؟“

میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔
 ”تو شکل اسے تو مجھے شرف آدمی لگتا ہے؟“ اس نے مضحکہ خیز لہجے میں کہا۔

”فصل پہ مت جائیں جناب عالی.....“ وہاں بیٹھے ہوئے ایک آدمی نے خوشامدی انداز میں کہا۔ ”فصل سے بجولے بجائے نظر آنے والے ہی تو دوڑے بھرم ہوتے ہیں۔“



میں نے گھر کو بلانے والے کی طرف دیکھا وہ مجھے ہلے ہی سے پولیس کا تبرکہ رہا تھا۔

”مجھے ایک گلاس پانی پل جائے گا؟“ میں نے تجحف آواز میں کہا۔

”پانی کیوں پتر؟“ پولیس اہلکار نے کہا۔ ”ہم ابھی تیرے لیے خنڈی بوتل منگا دیتے ہیں۔“ پھر وہ روائتی پولیس والوں کے انداز میں بولا۔ ”مجھے اپنے جرم کا اندازہ بھی ہے؟ تم اپنی جان جو قسم میں ڈال کر دن رات تم لوگوں کی حفاظت کرتے ہیں اور تم ہم ہی لوگوں پر ہاتھ اٹھاتے ہو؟“

”میری بہن انخوا ہوئی ہے سر۔“ میں نے کہا۔ ”وہ ایس آئی تھیش کرنے کی بجائے ہم ہی سے ایسا سلوک کر رہا تھا جیسے اس واردات کے ذمے دار ہم ہی ہوں۔“

”پولیس کی تھیش کا ایک انداز ہوتا ہے اب تم تمہارے کہنے پر تو نہیں چل سکتے؟“ پولیس اہلکار نے اپنا مکروہو بڑا کھانچا ہونے کہا۔

”ایس آئی نے میری ہی بہن کو بد چلن ثابت کرنے کی کوشش کی تھی۔ وہ تو اس بات پر بعد تھا کہ انخوا کی واردات سرے سے ہوئی ہی نہیں ہے بلکہ میری بہن گھر سے بھاگ گئی ہے اور ہم انخوا کا ڈرامہ رچا رہے ہیں۔“

”تو اور آج کل کیا ہوتا ہے یہ کیبل اور کیبورد کی دیکر لڑکیاں اور سیکسٹی کیا ہیں؟“ پھر وہ کچھ وقت کے بعد بولا۔ ”میں تجھ سے بحث نہیں کروں گا۔“ وہ گھر کو اس خبر پر غصے سے مخاطب ہوا۔ ”کرم علی! اے بارے جاؤ اور اپنی زبان میں کسمپاشی نہ کیا اس کی سمجھ میں آجائے۔“

”کرم علی! اپنی جگہ سے اٹھ کر اہوا اور سترتی سے بولا۔ ”اے دوسرے کرمے میں لے چلو۔۔۔۔۔“

سنتری مجھے جانوروں کی طرح کھینچتا ہوا دوسرے کرمے میں لے گیا۔

”مجھے ایک گلاس پانی پلا دو۔“ میں نے کہا۔

”اے پانی پلاؤ۔“ کرم علی نے کہا۔

کاشمیل نے ذہنیہ کا سر اس کرمے کی گول سے باندھا اور باہر نکل گیا۔

”تمہارا کس چیز کا برس ہے؟“ اس نے پوچھا۔

”ہم لوگ گارنشن کی ایکسپورٹ کرتے ہیں اور باہر سے الیکٹرانک سامان اور مختلف مشینوں کے فاضل

پڑے منگاتے ہیں۔“

”اور تمہارا دفتر کہاں ہے؟“ اس نے پوچھا۔

”ہمارا ہیڈ آفس آئی آئی چندر میروڈ پر ہے۔ اس کے علاوہ ملتان لاہور اور اسلام آباد میں بھی ہمارے دفتر

ہیں۔“

اس دوران میں سنتری جب اور گلاس لے آیا۔ اس نے پانی گلاس بھر کے مجھے دیا جسے میں نے ایک ہی سانس میں خالی کر دیا۔ اس دن مجھے احساس ہوا کہ پانی بھی اللہ تعالیٰ کی نعمتوں میں سے ایک نعمت ہے۔ پانی پیتے ہی مجھے صابا لگا جیسے میرے جسم میں بی بی تو آئی آگئی ہو۔

میں نے پانی کا گلاس سنتری کی طرف بڑھا دیا۔ وہ جب اور گلاس لے کر باہر نکل گیا۔

”بھائی! بات یہ ہے کہ تم نے ایک پولیس افسر پر ہاتھ اٹھایا ہے اس کا کچھ نہ کچھ جرم اند تو ہونا

چاہیے تھا۔“

”قدوس میرا نہیں تھا لیکن میں جانتا ہوں کہ پولیس افسر پر ہاتھ اٹھانا جرم ہے۔“ میں نے کہا۔

”اللہ تمہارا بھلا کرے۔“ اس نے کہا۔ ”اس آں پڑھا اور پڑے کھسے آدمی میں یہ فرق ہوتا ہے۔ وہ سب انکسٹر تو تمہارے خلاف کیس بنانے پر بعد تھا لیکن اس اچھ انسان بہت اچھے انسان ہیں انہوں نے سب انکسٹر اور اس سپاہی کو بہت مشکل سے راضی کیا ہے کہ وہ تمہارے خلاف کیس نہ بنائیں۔ اب تمہیں بھی ہمارے ساتھ تعاون کرنا چاہیے۔“

”کیا تعاون؟“ میں نے پوچھا۔

”تمہیں جرمانے کے طور پر سب انکسٹر اور اس پولیس کا ٹشیل کو چپاس لاکھ روپے دیتا ہوں گے۔“

”چپاس لاکھ۔۔۔۔۔؟“ میں نے حیرت سے کہا۔ ”چپاس لاکھ تو بہت ہیں؟“

”اس نصیحت کے مطابق میں کچھ نہیں ہے جو تم ادا نہ کر سکنے کی صورت میں تم پر آ سکتی ہے۔“

”دیکھو کرم علی۔۔۔۔۔“ میں نے کہا۔ ”میں نے سرکاری ایکار پر ہاتھ اٹھا کر جرم کیا ہے اس جرم کے تحت سب

انکسٹر صاحب جاب تو مجھ پر کیس بنا دیں میں چپاس لاکھ روپے تو نہیں دوں گا۔۔۔۔۔“

”تم کوئی غریب اور کمزور تو نہیں۔۔۔۔۔“ کرم علی نے کہا۔ ”اس نے چوٹی رقم تو اس وقت تمہارے

اکاؤنٹ میں ہوئی۔“

”میں نے اکاؤنٹ میں رقم موجود ہے لیکن میں ایک غیر قانونی کام سے بچنے کے لیے دوسرا غیر قانونی کام

نہیں کروں گا۔ رشوت لینا اور دینی تو جرم ہے؟“

”او بھائی۔۔۔۔۔ تم نے یہ کیوں سوچ لیا کہ رشوت ہے؟ یہ تو تمہاری اس حرکت کا جرمانہ ہے۔“

”ٹھیک ہے میں چپاس لاکھ روپے دوں گا۔“ میں نے کہا۔

کرم علی کی آنکھیں چمک نکلیں۔

”بھئی! امید تھی کہ تم خامے عقل مند اور سمجھدار آدمی ہو۔“ پھر اس نے آواز لگائی۔ ”احمد دین۔“ نور امی ایک

سنتری کرمے میں آ گیا۔

”چائے نکالنے والے ہوئے نہاری اور دان لے آ“ کچھ کباب وغیرہ بھی لے لینا۔“

احمد نور امی کرمے سے نکل گیا۔

”کرم علی نے کہا۔“ تمہیں شاید اندازہ نہیں ہے کہ تمہارے باپ اس تمہاری وجہ سے کتنے پریشان ہیں؟“

”مجھے خراب اندازہ ہے کرم علی۔“ میں نے کہا۔ ”اب بے چاروں پر تو دراصل مدہ پڑ گیا میری بہن بھی انخوا

ہوئی اور مجھے خود کی ذلالت کا اندہ کھتا پڑا۔“

”اس لیے تو کہا گیا ہے کہ غصہ حرام ہے۔“ کرم علی نے کہا۔ ”اب جرم تو آپ کو دبنا پڑے گا۔“

اسی وقت احمد دین نہاری اور روٹی لے کے آ گیا۔ روٹیوں کی سوندھی سوندھی خوشبو سے میری ہونک چمک

اٹھی۔

”بچے پہلے کھانا کھا لیں۔“ کرم علی نے یوں کہا جیسے وہ میرا میرا ہاں ہو۔

میں بھی کھانے پر ٹوٹ پڑا۔ میں جانتا تھا کہ میرا جواب سن کر وہ میرے آگے سے کھانا کھینچ لے گا اس نے

تو برائے نام میرا ساتھ دیا۔ میں نے خوب ڈٹ کر کھانا کھایا۔ اس دوران میں اس نے احمد دین سے چائے بھی منگالی تھی۔ وہ اسے خیال میں سمجھ رہا تو سیرت کر رہا تھا۔ آخر اس پچاس لاکھ میں اس کا حصہ بھی تو ہوگا۔ کھانے اور چائے سے فارغ ہونے کے بعد اس نے اپنی جیب سے سگریٹ نکالی اور میری طرف بڑھا دی۔ میں عادی سگریٹ نوش تو نہیں تھا لیکن کھانے کے بعد اس سگریٹ نوشی کر لیا کرتا تھا۔ اس وقت تو سگریٹ بھی بہت آہنی لگ رہی تھی۔

کھانا کھانے کے بعد میرے جسم میں گویا بجلی توانائی آگئی جیسے میں سر نے کے بعد دوبارہ زندہ ہوا ہوں۔ میں نے سگریٹ ختم کی تو اس نے مسکرا کر کہا۔ ”اب آپ کمرٹی فون کریں اور کیش منگائیں۔“ میں نے سوچتی ہوئی نظروں سے اسے دیکھا۔

”اؤ میں سمجھا“ وہ سگریٹ بولا۔ ”آج کل کمرش میں اتنا کیش کون رکھتا ہے؟ پھر ایسا کریں آپ چیک منگا لیں اور اس آپ کے سونے کا تینیں بندوبست کر دوں گا۔ آرام سے ہوں، صبح چیک کیش ہوتی ہے آپ کمر جا سکتے ہیں۔“

”یہ جرمنا کر کیا سرکاری خزانے میں جانے گا؟“ میں نے سادگی سے پوچھا۔

”ظاہر ہے جرمنا تو سرکاری خزانے میں ہی جاتا ہے۔“

”آپ لوگ..... میرا مطلب ہے کہ اس اناج اوصاحب مجھے اس کی رسید دیں گے؟“

”کیوں نہیں دیں گے جناب؟“ اس نے مسکرا کر کہا۔ ”صاحب آپ کو بی رسید دیں گے۔“

”کرم علی صاحب“ آپ مجھے کوئی چھاپی ہوئی والا بھروسہ ہے ہیں؟“ میں نے پوچھا۔ ”میں جانتا ہوں کہ اس قسم کے تمام جرمناے کورٹ کے ذریعے سرکاری خزانے میں جاتے ہیں۔ اس اناج اوصاحب جرمنا لگانے والے کون ہوتے ہیں؟ ان کا کام تو صرف کورٹ میں کیش پیش کرنے کا ہے۔ باقی تو کورٹ ہے؟“

”عمران صاحب“ ہم آپ کو کورٹ چھری کے پیکری سے توجہ دیا جاتے ہیں۔ وہاں ہاتھوں تو تاریخ پڑے گی۔ کورٹ کا خرچہ ہوگا، وکیل کے اخراجات ہوں گے۔ آپ صرف آدمی ہیں آپ کا قیمتی وقت قیمتی منافع ہوگا اس لیے۔“

”مردی۔“ میں نے کہا۔ ”میں اس قسم کے کسی بھی جرمناے کے لیے تیار نہیں ہوں۔“

کرم علی نے فیرت سے مجھے دیکھا۔ ”گویا اناج کر رہے ہیں؟“

”میں صرف یہ کہہ رہا ہوں کہ پولیس قانونی کارروائی کرے اور مجھے کورٹ میں پیش کر دے۔“

”آپ جرمنا نہیں دیں گے؟“ کرم علی کا لہجہ بدل گیا۔

”میں رشوت نہیں دوں گا۔“ میں نے کہا۔ ”رشوت کو جرمناے کا نام مت دیں۔“

”احمد حسین.....“ کرم علی نے تھنالا کر ہانک لگائی۔ ”اسے صاحب کے پاس لے چلو۔“

احمد دین نے میری ہتھکڑی کی ذخیر کوڑی کی گول سے کھلی اور اس مرتبہ بہت انسانیت سے مجھے ایس اناج اوصاحب کے کمرے میں لے گیا۔ وہ سمجھ رہا تھا کہ کرم علی کی مجھ سے ڈیل ہو چکی ہے۔ میں کھانا کھا چکا تھا چائے اور سگریٹ بھی پی چکا تھا اس لیے اس کی نظروں میں محزون تھا۔

میں دوبارہ ایس اناج اوصاحب کے کمرے میں پہنچا تو وہ اسب انسپٹر کے ساتھ بیٹھا تھا مجھے گرفتار کر کے لایا

تھا۔

”جی عمران صاحب! ایس اناج اوصاحب نے کہا۔ ”بات سمجھ میں آگئی آپ کے؟“

”نہیں سرجی۔“ کرم علی نے کہا۔ ”اس نے کوئی بھی بات سامنے سے نکال کر دیا ہے۔“

”مجھ پر ایسا کریں.....“ ایس اناج اوصاحب نے کہا۔ ”جرمناے کی رقم کمرے میں کر دیں۔“

”تمیں لاکھ.....“ میں نے پوچھا تو ایس اناج اوصاحب نے اثبات میں سر ہلایا۔ ”تمیں لاکھ تو دور کی بات ہے نہیں تو اس سلسلے میں تمیں روپے بھی نہیں دوں گا۔“

”تو خود کو بھینسا کیسے اوائے؟“ ایس اناج اوصاحب گرج کر بولا۔ ”نڈر علی.....“ اس نے سب انسپٹر سے کہا۔

”ذرا سے سہان داری کی ایک جھلک دکھا دو۔ ایک رات میں اس کی سب بیکڑی نکل جائے گی۔“

ایس اناج اوصاحب نے مجھے یوں دیکھا جیسے اندازہ لگا رہا ہو کہ میں کتنا تنہا درواست کر سکتا ہوں پھر اس نے کرم علی سے کہا۔ ”ذرا احمد خان کو بھیجو۔“

احمد خان شاید وہی آدمی تھا جس کا ذکر حوالہ میں نے بھی کیا تھا۔ کرم علی خاموشی سے باہر نکل گیا۔

تھوڑی دیر بعد ایک لمبا ڈھونڈا ہاتھ میں دوں اور کمری بدلی دن کا ایک کمرے میں داخل ہوا۔ اس نے دھونڈا ہاتھ کمری میں اور جسم کے اوپر ہی صے پر بیٹھ بیٹھ۔ شاید وہیں بھی اس نے صاحب کے کمرے میں آنے کے لیے پہنچی تھی۔ اسے غالباً تیندے بچکا گیا تھا اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں اور اس میں تیندہ کا خوار تھا۔

اس نے مذہب انداز میں کہا۔ ”عصم جناب عافی۔“

”احمد خان.....“ ایس اناج اوصاحب نے کہا۔ ”ذرا اس بندے کی اور بالنگ کرنا ہے۔“

”اس سے کچھ انگڑاواتے سر؟“ احمد خان نے یوں پوچھا جیسے ملکیت گاڑی دیکھ کر پامٹے ہیں کس کی سر اس کرانی ہے یا پھر انجمن میں کوئی فالت ہے؟

”تم سہان داری شروع کر دینا انجمنی آکر اس سے خود سب کچھ گھول لوں گا۔“

احمد خان نے اوجا تک میرے بال پکڑ لیے اور انہیں دو بار جھٹکا سے کر بولا۔ ”جیل بھی..... ذرا تیری سروں کر دیں۔“ وہ مجھے اس حالت میں سمجھتا ہوا ایک ایسے کمرے میں لے گیا جس میں عجیب و غریب ساز و سامان تھا۔ اس میں تین بائی کی خالی اور بھری ہوئی بائیاں تھیں ڈھنڈے سے تھوڑی جھیر میں اور عجیب و غریب قسم کے گھڑی کے کھانچے تھے۔

”احمد حسین.....“ احمد خان نے کہا۔ ”پہلے اسے ذرا الٹا لٹکا دو۔“

احمد خان نے میرے سر پر ہونڈی میں سر کی باندھی اور پاچک اسے ٹھیک لیا۔ میں دھڑام سے فرش پر گر پڑا۔ اس کا دوسرا ایک چوٹی میں لٹکا ہوا تھا۔ اس دین نے میری ہتھکڑی کھول کر اس کا سر اکھینچ کر کوشش کی اور آہستہ آہستہ میرے سر پر جھٹکتی طرف اٹھنے لگے۔ اس نے زمین سے تقریباً پانچ فٹ کی بلندی پر مجھے طعنے کر دیا اور

دیکھا کہ دوسرا ایک کپ میں بندھا دیا۔

احمد خان نے اپنی قمیض اتار کے وہاں لپی ہوئی ایک کھوٹی پر پانچ پانچ قمیض سے سگریٹ اور ماہر لٹال کر اطمینان سے وہاں رکھی کر پڑ گیا۔ اسی دوران سگریٹ سلاکھ کر اس کا گھبراہٹ لگاتے ہوئے بولا۔ ”یازر مجھے تھپہ دم رہا ہے تو صاحب کی بات مان جاؤ تاؤ فائدے میں رہے گا۔“

میں نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔

اس نے یوں افسردگی سے سر ہلایا جیسے اسے میرے اس فیصلے پر بہت افسوس ہوا وہ آہستہ سے بولا۔ "ٹھیک ہے جی، جیسی تیری مرضی جب تک میں سرگرمی ختم کروں تو کوئی فیصلہ کرنا اچھا ہے۔ میں یوں بھی سو رہا تھا لوگ جانتے ہیں کہ جب میں کبھی نیند سے اغتیا ہوں تو غصہ دگنا ہو جاتا ہے۔"

وہ گواہی دیا کہ وہ ابھی خود ہی میری دیر میں میرے کانوں اور ناک سے ٹپکنے لگے گا۔

احمد خان نے سرگرمی ختم کی اور اٹھ کھڑا ہوا چہرہ میرے نزدیک آ کر بولا۔ "میں تجھ سے آخری دفعہ پوچھ رہا ہوں کہ ہاں یا نہیں؟"

"نہیں۔۔۔۔۔" میں نے کہا۔

اس نے زانے سے میرے چہرے پر چھڑرید کر دیا۔ میں پینڈولم کی طرح جھولنا ہوا کرے کے دوسرے سرے کی طرف کیا اور دوبارہ آ کر تو میرا اس نے مجھے زوردار پھڑپھڑا کر دیا۔

وہ شاید مجھے پندرہ منٹ تک جھلٹا رہا اور پھر رات بارہ بجے میرے دونوں کان سن ہو کر رہ گئے تھے۔ کانوں میں ساکن سا مٹی اور شاید میری ناک سے خون بھی بہنے لگا تھا۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ میرے چہرے سے زمین پر جو کچھ گر رہا ہے وہ دینے ہے یا خون؟

جب احمد خان نے دیکھا کہ میں اس کا یہ حربہ برداشت کر گیا ہوں تو اس نے احمد دین کو حکم دیا کہ اسے کھول

33۔۔۔۔۔

مجھے سر کے بل کھڑا ہونے کا تجربہ تھا۔ میں روزانہ صبح آدھے گھنٹے تک سر کے بل کھڑا ہوتا تھا پھر جو لگ کے لیے نکل جاتا تھا۔ شام کو باقاعدگی سے جاتا تھا اس لیے مجھے تکلیف تو ہوئی لیکن انہی جتنی موتی چٹنی کسی عام آدمی کو ہوتی۔

میں فرش پر بیٹھا تو زانہ برقرار نہ رکھ سکا اور اندھے منہ کر گیا۔ احمد دین نے میرے پاؤں کھولنے کی کوشش نہیں کی بلکہ اب تو وہ میرے ہاتھ بھی پٹ پٹ پٹ کر رہے جا کر باندھ رہا تھا۔

میرے ہاتھ باندھنے کے بعد احمد خان نے ایک بائلی اٹھائی اور میرے سر پر اونٹن چاڑھی۔ بائلی کے کنارے میرے شانوں پر تک گئے۔ اب مجھ پر کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔

اچانک میرے کانوں میں زوردار دھماکہ ہوا جس کی طرح اچھل پڑا اور ایک دھماکہ ہوا تو میری سمجھ میں آیا کہ احمد خان یا احمد دین باہر سے بائلی پر کسی ہماری چیز یا ڈبے سے خریش لگا رہے تھے۔ اس کی آواز اتنی خوفناک تھی کہ جیسے گد بھاتا جیسے میں، بیشک کے لیے یہ ہو جواؤں کا۔۔۔۔۔

"ہاں یہی اب تجھے کوئی عقل آئی؟" احمد خان نے کہا۔

میں خاموشی سے اس کا چہرہ دیکھتا رہا جو میری نظروں میں وہندلا رہا تھا پھر اذہن تاریکی میں ڈوب گیا۔

مجھے دوبارہ ہوش آیا تو احمد خان موت کے فرشتے کی طرح کمرے میں موجود تھا۔ اب سب انیسکڑ بھی وہاں آ گیا تھا۔

"اسے تجھے پر باندھ دو۔۔۔۔۔" سب انیسکڑ غرا کر بولا۔ "جب میں اس کے جسم پر جگہ جگہ کے لگا کر اس پہ تنک چمڑوں کا تو اس کی ساری خودداری تک کرے سے نکل جائے گی۔"

احمد خان نے مجھے اپنی اور سب کی ایک میز پر باندھ دیا۔ اس نے مجھے اتنی مضبوطی سے باندھا تھا کہ میں اپنی جگہ سے معمولی سی حرکت بھی نہیں کر سکتا تھا۔

"مظہر احمد خان۔۔۔۔۔" سب انیسکڑ نے کہا۔ "پہلے اس کے جسم سے کپڑے اتار لو۔"

احمد خان نے دوبارہ مجھے کھولا اور انگوٹھیں مجھے بلور اور ہیرہ لٹس کے جسم سے کپڑے اتارنے کی ہیرا مارا اور نو پتھر ہو گیا۔ کسی کی عزت لٹس پر حملہ کرنے کا سب سے خوفناک طریقہ یہ ہے کہ اسے بے لباس کر دیا جائے۔

اس نے مجھے اسی حالت میں باندھ دیا۔

"ارے جان تو خوب بتا رہی ہے تو نے؟" سب انیسکڑ نے کہا۔

"یہ جان میں نے اپنی حلال کی روزی سے بنائی ہے۔" میں نے کہا۔ "تیری طرح رشوت لے کر اور لوگوں کی جیبوں پر ڈاک ڈال کر اپنے پیٹ کا دوزخ نہیں بھرتا ہے۔"

مجھے اس وقت مملکت سے کام لینا چاہیے تھا لیکن بے لباس ہونے کے بعد مجھے اپنے ذہن پر بھی اتنی نہیں رہا تھا۔ میں جو کہ موچ رہا تھا اسے زانہ نے اسے ادا بھی کر رہا تھا۔

احمد دین نے وہاں رہی ہوئی میز سے ایک استرا اٹھایا اور اس آئی کو دے دیا۔ اس نے استرے میں نیلیا بلے فٹ کیا اور اس سے میرے سینے پر اپنا ساجہ کا لگایا۔ میرے سینے سے ہیٹ تک کراس کی شکل میں ایک گلیہ سرخ گئی۔ دوسری گلیہ سرخ کراس نے ضرب لگا کر نشان بنادیا۔ تیری گلیہ اس نے میرے سینے سے پتہ ناک کی طرف کھینچی اور احمد خان سے بولا۔ "اب ذرا اس کے زخموں پر تنک چمڑو۔"

اچانک احمد خان نے میرے زخموں پر تنک چمڑو دیا۔ میرے حلق سے بے ساختہ چیخ برآمد ہوئی۔ اس نے زعفران تنک چمڑو کا ٹکڑا دھاس تنک کا تھوٹوں سے تل بھی رہا تھا۔

"بولو۔۔۔۔۔" سب انیسکڑ نے کہا۔ "صاحب کی آفر قبول کرتے ہو یا نہیں؟"

میں بڑا حال سا ہو گیا تھا۔ وہ مجھے بھکا ہوا پوچھ رہا تھا۔ "صاحب کی آفر۔۔۔۔۔"

میں نے اچانک اس کے منہ پر تھوک دیا۔

جواب میں اس نے میرے منہ پر زوردار پھڑپھڑا کر لکین اس نے میرے چہرے پر اتنے تھپڑ مارے تھے کہ

میرے دونوں کان سن ہو گئے تھے۔

"اب میں تیرے جسم کے نچلے حصے پر جگہ لگاؤں گا اور وہ غم اتنے گہرے ہوں گے کہ تو چیخ چیخ کر صاحب کی آفر قبول کرنے کا وعدہ کرے گا۔"

اس نے استرے میں ایک نیلیا بلے فٹ کیا اور اسے زانہ لگا کر بائلی کی طرف بڑھا۔

یہ تجس اور سنسنی خیز داستان ابھی جاری ہے

بقیہ واقعات آئندہ شمارے میں ملاحظہ فرمائیں

میرا شہر ان دنوں پھر بجلی کے بحران کا شکار ہے۔ لوڈ شیڈنگ کے بہانے شہریوں کو گھنٹوں اور بعض علاقوں میں دنوں عذاب میں مبتلا رکھا جاتا ہے۔ اس نام نہاد ”لوڈ شیڈنگ“ میں عام آدمی پس کر رہ گیا ہے۔ ایک طرف تو یہ صورت حال ہے اور دوسرے طرف معاملہ اس کے بالکل برعکس ہے۔ گراچی کے مختلف پارک اور کھیلوں کے میدان رات بھر سرچ لائٹس کی تیرہ کن روشنیوں سے جگمگاتے رہتے ہیں۔ یہ روشنیاں نہ صرف رات طاری رہتی ہیں بلکہ سارا سارا دن لاکھوں بلب روشن رہتے ہیں۔ اسٹریٹ لائٹس کا بھی یہ۔ شادی ہال اور لان بعد نورو بنے رہتے ہیں۔ کوئی تعریب ہو یا نہ ہو آرائشی جمال رہتے ہیں۔ شادی عام آدمی کو احساس کمتری میں مبتلا کرتی رہتی ہیں۔ پھول بیچنے والوں کے چھو۔ کیٹینا“ میں ہزار ہزار واٹ کے کئی کئی بلب روشن رہتے ہیں۔ یہ چھوٹے ڈاندر عوام کی ملی بھگت سے ناجائز کنکشن لیتے ہیں پھر گراچی کے بعض علاقے ایسے بھی ہیں جہاں بستیوں میں کنڈ اسٹیم کا نظام رائج ہے اور یہ کے اسی ایس سی کے بد عنوان اہلکاروں کی ملی رہا ہے۔

ریلوئی وی اور ذرائع اطلاع پر توانائی بچانے کی مہم پر کروڑوں روپیہ صرف کیا جا رہا ہے اور دوسری طرف یہ نلے ٹٹلے ہیں۔ آخر توانائی کا یہ بحران صرف عام آدمی کے لیے کیوں ہے؟ ایک طرف تو یہ صورت حال ہے اور دوسری طرف وہ علاقے ہیں جو تاریکی میں ڈوبے رہتے ہیں۔ ہزاروں طالب علم محض اس وجہ سے پڑھ نہیں پاتے۔ رات میں کام کرنے والے بیشتر افراد روزی سے محروم رہ جاتے ہیں۔ گرمی اور جس کی شدت سے بے شمار مریض جاں کنی میں مبتلا رہتے ہیں۔ لیکن نہ ہو تو پانی کا بھی بحران پیدا ہو جاتا ہے۔ صورت حال کی اس سنگین کاغذ سے رادر کون ہے؟ کے اسی ایس سی کے بڑوں سے یہ سوال کون کرے کہ لوڈ شیڈنگ کا اثر مخصوص علاقے پر کیوں نہیں پڑتا؟ بجلی کی شکایات کے مراکز بھی موجود ہیں مگر ان کے فونز ہمیشہ مصروف رہتے ہیں۔ یہ بات بھی تجربے میں آئی ہے کہ متعلقہ افراد فون کارڈ میسرور ٹاکر نیچے رکھ دیے ہیں۔ کسی قسم طریقے ہے کہ اس بین الاقوامی شہر میں جہاں جموٹے بڑے اداروں کے پاس بھی بجلی فون کی میس ہیں لائنیں ہیں وہاں ایک اہم ادارے کے پاس صرف ایک نمبر ہوتا ہے۔ خوش قسمتی سے اگر کوئی شکایت لکھانے میں کامیاب بھی ہو جاتا ہے تو اسے مختلف طریقوں سے ٹر خایا جاتا ہے اور ایسے وقت کا انتظار کیا جاتا ہے کہ جب کے اسی ایس سی والوں کا ”ادور ٹائم“ بن سکے۔ نفسا سنی کے اس دور میں کوئی کسی پر ساری حال نہیں ہے۔ یہاں ہر کام وعدہ فردا پر بال دیا جاتا ہے اور عام آدمی یہ سوچتا رہ جاتا ہے کہ آئے عطاقت مجھے وعدہ فردا لے کر اب انہیں ڈھونڈ چرائیغ زرخ زیا لے کر

سہ ماہی نوریہ ۱۹۹۴ء میں ”بوشیرہ“ اور ”کی کہانیاں“ کیلئے تحریر کیا تھا۔ فلاسفی کیلئے لایہ میاں آج کے دور کا کس نہیں ہے۔